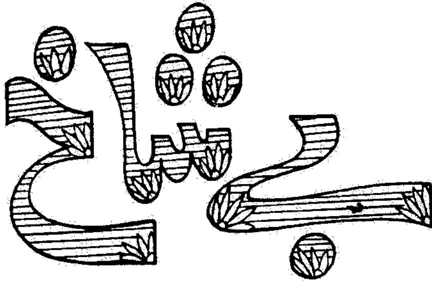
بے شاخ

ڈاکٹر ساجد امجد



ڈاکٹر ساجد امجد

مکتبہ القریش ۰ سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور ۲

بار اول : ۱۹۹۹ء
قیمت :


ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس سے چھپوا کر مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی۔

اپنے نواسے وجاہت اللہ صدیقی

کے

نام

...ل آئینہ

ایک شاعر جتنی دیر سے اپنا کلام سنا رہا تھا' اس کا واحد سامع اتنی ہی دیر ...پ تھا۔ ایک شعر پر وہ کوشش کے باوجود چپ نہ رہ سکا۔ بے اختیار' اس کی ... تعریفی کلمات ادا ہو گئے۔ شاعر نے کہا تسلیم! اور بیاض بند کر لی۔

"کیا ہوا؟ کچھ اور سناؤ۔" سامع نے کہا۔

"بس یہ سمجھو' باقی اشعار اسی معیار کے ہیں۔" شاعر نے کہا۔

میں نے بھی اپنی بہت ساری کہانیوں میں سے آپ کو سنانے کے لیے ... کہانیاں منتخب کی ہیں لیکن "اس شاعر" کی طرح اپنی بیاض بند نہیں کی ہے۔ ... کے کلمات تحسین جونہی مجھ تک پہنچیں گے' میں اسی معیار و مقدار کی ... لے کر دوسری کتاب کے ذریعے آپ تک پہنچ جاؤں گا۔

ان کہانیوں کی تمام کھڑکیاں اس آنگن کی طرف کھلتی ہیں جسے ... کی ... کہتے ہیں۔ رنگین اور سنگین زندگی' تلخ اور شیریں زندگی' قہقہوں کی ... وؤں کی زندگی۔ وہ زندگی جس کی ہر گلی میں ایک کہانی ہمارا انتظار کر ... ہے۔

...ش قسمتی یا بد قسمتی سے ہر لکھنے والا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی ... میں زندگی بولتی ہے۔ میں اس میں اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ زندگی کو

بولنا بھی چاہیے اور چھکنا بھی۔ بولنے اور چھکنے میں وہی فرق ہے جو کیمرے سے کھینچی گئی تصویر اور مصور کے کینوس پر رنگوں سے کھیلتی ہوئی تصویر میں ہوتا ہے۔

زندگی کو دیکھنا اس کے باطن میں جھانکنے سے عبارت ہے۔ حقیقت کے مفہوم کو فطرت کے حسن میں اضافے کا ہم معنی ہونا چاہیے۔

زندگی صرف واقعات میں نہیں ہوتی۔ گلیوں' بازاروں میں گھومتے ہوئے لوگ' کھیتوں میں مچلنے والی ہوا' نیکی کا روپ' گناہوں کی دھوپ' عادت' خصلت' نفسیات' عمل' ردعمل سب اسی بظاہر اکیلی زندگی کے نام ہیں۔

میں نے ان کہانیوں کو انہی رنگوں سے رنگین کیا ہے اور اس کوشش کے ساتھ کہ اگر کیمرے کی تصویر' آرٹسٹ کا آرٹ نہ بن سکی تو بات ہی کیا ہوئی۔

میں شاعری سے کہانیوں کی طرف آیا ہوں' اس لیے ان کہانیوں کا طرز اظہار خاصے کی چیز ہے۔ میرا یقین ہے کہ شاعر سے اچھی زبان کوئی نہیں لکھ سکتا ہے۔ ہر اچھا نثر نگار دراصل اندر سے شاعر ہوتا ہے۔

یہ کہانیاں چاہے تنقید کے کسی راستے سے گزریں' حسن بیان کی پتلیوں کی روشنی ضرور بنیں گی۔ یہ گمان ہے تو چلو یونہی سہی!!

ڈاکٹر ساجد امجد

حسنِ ترتیب

ب شاخ

افروز نے آخری مرتبہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یونیفارم کا جائزہ لیا‘

...ت لیا اور مسکراہٹ کو آئینے میں چھوڑ کر کمرے سے نکل آئی۔ دروازے میں

...ماں چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"اری کہاں چلی‘ ایک کپ چائے تو حلق میں اتارتی جا۔" ماں نے اسے وحشت

...ی طرح کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ماں مجھے بھوک نہیں ہے۔ کالج کو دیر ہو رہی ہے۔" افروز نے چلتے چلتے کہا

...ک اٹھا کر باقاعدہ بھاگتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔

"عجیب لڑکی ہے‘ روز اسی طرح کرتی ہے۔ پہلے اٹھتی نہیں پھر تیاری میں اتنی

...یتی ہے۔" ماں نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے لیے لائی ہوئی چائے خود پینے

...ئی۔

سائیکل رکشا تیار کھڑا تھا جو اسے روزانہ کالج لے کر جاتا تھا۔ واپسی میں وہ بس

...اتی تھی۔ "ذرا جلدی چلاؤ‘ آج دیر ہو گئی ہے۔" افروز نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے

...بوڑھا دین محمد رکشا کو اس طرح کھینچنے لگا جیسے اس میں بیٹھی ہوئی سواری کالج نہیں

...ے جا رہی ہے۔

"بی بی‘ پہلے تو آپ اتنی جلدی نہیں کرتی تھیں‘ بڑے آرام سے کالج جاتی

...

"ہاں اب کچھ بات ایسی ہی ہے مگر تم نہیں سمجھو گے۔ بس تم رکشا چلاؤ۔"

...یا مصیبت ہے۔ کالج والوں نے پہلا پیریڈ اردو کا کیوں رکھ دیا ہے اور رکھ ہی دیا

...وفیسر مجید کے پاس میری کلاس کیوں ہے۔ سر مجید کا پیریڈ‘ میں کسی حالت میں

نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے اپنے آپ سے کہااور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جس کا مفہوم اس کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا بلکہ اب اس مسکراہٹ کے کچھ پہلو تو خود اس پر بھی واضح نہیں تھے۔ افروز کا اس کالج میں یہ دوسرا سال تھا۔ پہلا سال تو اس طرح گزر گیا تھا جیسے کسی گھر میں مہمان کا پہلا دن ہو لیکن جب سے وہ سیکنڈ ائیر میں آئی تھی' اس کے رخساروں پر شوخی پہرا دینے لگی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس کی عمر ایک سال بڑھ گئی تھی بلکہ اس میں کچھ قصور پروفیسر مجید کی موجودگی کا بھی تھا۔

ایک سال خیریت سے گزر گیا تھا کہ دوسرے سال مجید کاوش نام کا ایک نوجوان اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے کلاس میں داخل ہوا۔ اسے پروفیسر ماننے پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا اگر وہ اپنا تعارف خود نہ کراتا۔ عمر پچیس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ غالباً اس کی ملازمت کا پہلا سال تھا۔ عموماً اساتذہ کے پہلے سال کی کارکردگی قابل رشک نہیں ہوتی۔ اسی لیے پرنسپل نے لڑکیوں کی کلاس میں بھیجا تھا۔ لڑکوں کی کلاس میں نئے پروفیسر کی کامیابی شرارتی لڑکوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر لڑکیوں کی رگ شرارت بھی پھڑکی ضرور تھی لیکن اس کے لہجے میں ایسا اعتماد اور مضمون پر ایسی گرفت تھی کہ کچھ ہی دیر بعد تمام لڑکیاں عقیدت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے بات کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ غالباً اس بات کو جانتا تھا کہ استاد کو طلبہ کی ذہنی سطح پر اتر کر گفتگو کرنی چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس وقت لڑکیوں کی کلاس لے رہا ہے۔ لڑکیوں کے نازک احساسات فطری طور پر شاعری سے متاثر ہونے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نے خوبصورت اشعار سناسنا کر لڑکیوں کے جذبات کو گد گدا دیا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی وہ ایسی جاذبیت رکھتا تھا کہ لڑکیوں کو اس میں دلچسپی لینا لازمی تھا۔ اس کا لیکچر ختم ہوا تو یوں لگا جیسے کوئی رنگین خواب ٹوٹ گیا۔ اس کی شخصیت ہر لڑکی کا موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔

"نادیہ تمہارا کیا خیال ہے سر مجید کے بارے میں۔" ایک لڑکی نے دوسری سے سوال کیا۔

"ونڈر فل۔ کیا ٹیچر ہے۔"

"میرے خیال میں اس عمر کے ٹیچر کو لڑکیوں کی کلاس نہیں دینی چاہیے۔" کسی لڑکی نے خیال ظاہر کیا۔

"میرا خیال تم سے مختلف ہے۔ لڑکیوں کا کلاس اس عمر کے ٹیچر کو ملنی چاہیے۔ لڑکیوں کی دلچسپی برقرار رہتی ہے' دل لگا کر پڑھتی ہیں۔"

تمہیں ٹیچر سے غرض ہے یا اس کے علم سے۔"

"دونوں سے۔ بڈھے کھوسٹ اگر کسی شعر کی تشریح کرتے ہیں تو کتنی جھوٹی لگتی ہے۔ ہم لڑکیوں میں احساس حسن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہم جب کپڑوں کی میچنگ کرتے ہیں تو اسی جذبے کی تسکین کر رہے ہوتے ہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرتے ہیں تو اسی احساس حسن سے مجبور ہو کر۔ اگر یہی ماحول کلاس میں میسر ہو تو کتنا اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ لڑکوں کی کلاس لیڈی ٹیچر کو ملنی چاہیے۔"

"آف کورس۔ وہ ضرور دلچسپی لیں گے اور علم کا حصول دلچسپی لینے ہی میں مضمر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"اگر ایک کلاس میں لڑکیاں اور لڑکے دونوں موجود ہوں تو تمہارے فلسفے کے مطابق ایک ٹیچر اور ایک لیڈی ٹیچر کو وہ کلاس مل کر لینی چاہیے۔"

"تم تو بات کو مذاق میں لے گئیں۔ بھئی بات حسن کی ہو رہی تھی اور حسن' مرد عورت میں سے کسی ایک کے لیے مخصوص نہیں۔ نوجوان ٹیچر جو خوبصورت بھی ہو' خوش لباس بھی وہ لڑکوں میں بھی اتنا ہی مقبول ہو گا جتنا لڑکیوں میں کیونکہ شاگرد اسے جنس کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ سر مجید ہمیں اس لیے اچھے نہیں لگے کہ وہ مرد ہیں بلکہ اس لیے اچھے لگے کہ وہ مرد ٹیچر ہیں۔ ہمیں وہ اچھے لگے تو اس میں ہماری کسی خراب نیت کو دخل نہیں۔ ایک فطری کشش ہے جو ہم محسوس کر رہے ہیں۔ اس میں کسی مفاد کا دخل نہیں۔ اسے ہم عقیدت کہہ سکتے ہیں۔ محبت کہہ سکتے ہیں۔ یہ محبت اگر کسی بوڑھے' بے ہنگم ٹیچر سے کی جائے تو یقیناً اس میں وہ شدت نہیں ہو گی۔"

"پھر یہ بے چارے بوڑھے کہاں جائیں گے۔"

"کہیں بھی نہیں' یہیں رہیں گے۔ بات تو مقبولیت کی ہو رہی تھی۔"

کل کو تم کہو گی' لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی کلاس میں پڑھیں تو نتائج بہت اچھے آئیں گے۔"

"ضروری نہیں لیکن مخلوط طریقہ تعلیم کے جو فوائد ہیں وہ ہمیں ضرور حاصل ہوں گے۔"

"اور جو نقصانات ہیں؟"

"ان کا بھی سامنا کرنا پڑے گا مگر اس وقت حال یہ ہے کہ ہم مخلوط بھی ہیں' الگ بھی۔ ہمیں نقصان تو اٹھانا پڑ رہا ہے' فائدے سے محروم ہیں۔"

افروز ان بحثوں سے عموماً دور ہی رہا کرتی تھی۔ جیسے اسے خوف ہو کہ سر مجید کے لیے جن جذبات کو وہ دل کے نہاں خانے میں چھپائے بیٹھی ہے' دوسری لڑکیوں پر ظاہر نہ ہو جائیں۔ وہ انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کالج آ گیا۔ اس نے کالج کے گیٹ سے کلاس تک جاتے ہوئے ایک فیصلہ کیا۔ آج وہ ہر حال میں اس فیصلے پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

وہ کلاس کے سامنے پہنچی تو مجید اپنے مخصوص انداز میں لیکچر دے رہا تھا۔ کچھ دیر کو اس نے لیکچر روک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن کی جنبش سے اسے اندر آنے کی اجازت دے کر دوبارہ لیکچر دینے میں مصروف ہو گیا۔ آج افروز وہاں نہیں تھی جہاں تھی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دور چلی گئی تھی۔ اتنی دور کہ کلاس کی کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ پروفیسر مجید اس کے سامنے تھے اور وہ انہیں اپنا فیصلہ سنا رہی تھی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب یوں خاموشی چھا گئی جیسے ریکارڈ پر گھومنے والی سوئی اپنی گردش مکمل کر کے چپ ہو گئی ہو۔

"پیریڈ ختم ہو گیا؟" اس نے نیم غنودگی کے عالم میں پوچھا۔ برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شک ہو۔

"سر مجید گئے؟" اس نے پھر کہا۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی جواب ملتا وہ اس طرح باہر کی طرف بھاگی جیسے کہہ رہی ہو مجید صاحب مجھ سے پوچھے بغیر کیسے چلے گئے۔

مجید اس کاریڈور میں تھا کہ افروز یوں اس کے سامنے پہنچ گئی جیسے کوئی درمیان میں بات کاٹ دے۔ مجید نے اس وحشت زدہ لڑکی کو دیکھا اور ٹھٹک کر اپنی جگہ جم گیا۔

"سر' میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔" افروز نے بے ترتیب سانسوں کا جھولا جھولتے ہوئے کہا۔

"مس ------ کیا نام ہے آپ کا؟"

"افروز۔"

"مس افروز جو کچھ ہو کلاس میں پوچھیے گا۔"

"جو مجھے پوچھنا ہے' کلاس میں نہیں پوچھا جا سکتا۔"

"جو کلاس میں نہیں پوچھا جا سکتا اس کا جواب ابھی سے سن لو کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"آپ میری بات سن لیں۔ اس کے بعد چاہے یہی کہہ دیجئے گا کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"میں نے کہا نا کلاس میں پوچھیے گا۔"

"اس کا تعلق سبجیکٹ سے نہیں' میری ذات سے ہے۔"

"میں ذاتی باتوں کا جواب دینا نہیں چاہتا۔"

"سر' آپ میرے ٹیچر ہیں۔ میری ذاتی اصلاح بھی آپ کی ذمے داری ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں وہ آپ کی ذات سے بھی تعلق رکھتا ہو۔ بہت وقت گزر گیا' اب اس کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے۔"

مجید نے باتوں کی مشین کو پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے اس عجیب و غریب لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اگر وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہے تو تماشا بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ تصور ہی تصور میں لڑکیوں کے قہقے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ' میں سن رہا ہوں۔" اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

"یہاں نہیں۔"

"پھر کہاں۔"

"کہیں بھی۔ کسی ہوٹل میں یا آپ کے گھر۔"

"میرے گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے ہمیں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہو گا" "لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔"

"ہوٹل کا آئیڈیا کیسا رہے گا؟ پے منٹ میں کروں گی۔"

"پے منٹ تو میں بھی کر سکتا ہوں لیکن وہ جگہ بھی آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"میری فکر جانے دیجئے۔ میرے لیے ہر جگہ مناسب ہے۔"

"دیکھیے مس افروز' میں ایک بات آپ کو سمجھا دوں۔ میں استاد ہوں کالج سے باہر میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔

"ہم دونوں انسان بھی تو ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے' میں بحث میں آپ سے نہیں جیت سکتا۔"

"آپ تو پہلے ہی جیت چکے ہیں۔"

"میں اس کالج میں ہارنے یا جیتنے نہیں آیا۔ پڑھانے آیا ہوں۔"

"ایک سبق میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں مگر آپ ہیں کہ ٹیوشن پر تیار ہی نہیں ہوتے۔"

"اُف میرے خدا۔ تو اتنی دیر سے آپ مجھے ٹیوشن پڑھانے پر آمادہ کر رہی تھیں۔"

"تو اور کیا۔ آپ سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔"

"افروز نے سوچا' سر مجید عام مردوں کی طرح نہیں۔ وہ رات کے سناٹے کی طرح خاموش رہیں گے یا تیز آندھی کی طرح خشک پتوں کو روند کر آگے بڑھ جائیں گے۔ اگر وہ ٹیوشن کے بہانے سے کہیں بیٹھ سکتے ہیں تو یہی سہی۔

"اتنی بات تو اسٹاف روم میں بھی کی جا سکتی ہے یا پھر آپ اپنے گھر کا پتا دے دیں۔ میں وہاں آجاؤں گا۔"

"افروز کے ذہن میں دور اندیشی کے کنول جگمگانے لگے۔ یہ بات اس کے ذہن میں پہلے سے کیوں نہیں آگئی۔ وہ اپنی بے وقوفی پر خود ہی ہنس دی۔ ٹیوشن کے بہانے

سر مجید سے روزانہ ملاقات ہو جایا کرے گی۔ رہی ٹیوشن کی فیس تو ڈیڈی نے اس سے پہلے اس کی کون سی بات ٹالی ہے جو اب ٹالیں گے۔ اس نے مجید کو اپنے گھر کا پتہ سمجھایا اور مطمئن ہو کر کلاس کی طرف لوٹ گئی۔

افروز کے والدین صوبہ بہار سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ڈھاکہ آ گئے تھے۔ اس کے والد ہندوستان میں بھی کاروباری آدمی تھے' ڈھاکہ آنے کے بعد بھی انہوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا اور جلد ہی اتنی ترقی کر لی کہ عزت اور خوش حالی کی زندگی گزار سکیں۔ افروز کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ چھوٹی فیملی تھی' ضروریات محدود تھیں لہٰذا زیادہ کمانے کی ہوس ان میں تھی ہی نہیں۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان لیے صبر شکر کیے بیٹھے تھے۔ جتنی آمدنی تھی افروز اس کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ اس کی ہر فرمائش لفظوں میں ڈھلنے سے پہلے ہی پوری ہو جاتی تھی چنانچہ جب اس نے بتایا کہ وہ اپنے کالج کے ایک پروفیسر سے ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہے تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ صرف اجازت مل گئی بلکہ تعریف بھی ہوئی کہ اسے اپنی پڑھائی کی فکر ہے۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر کالج نہیں گئی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے تقاضے میں کتنا اثر ہے۔ پروفیسر مجید کو اس کی کتنی فکر ہے۔ اس نے ڈرائنگ روم کو دن بھر میں کئی مرتبہ صاف کیا۔ اپنی تصویریں گھر کے ہر کمرے سے نکال کر ڈرائنگ روم میں سجا دیں۔ خیالوں ہی خیالوں میں کپڑوں کے کئی جوڑے تبدیل کر ڈالے۔ بالاخر شام سے کچھ پہلے اپنے پسندیدہ رنگ کا ایک جوڑا منتخب کیا اور دستک کے انتظار میں کتابیں سجا کر بیٹھ گئی۔

لمحوں کی بھیڑ میں وہ اکیلی انتظار کا چراغ روشن کیے بیٹھی تھی کہ خوشبو کا جھونکا اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مجید اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "سر' آپ آ گئے۔ مجھے خبر تھی آپ ضرور آئیں گے۔ آتے کیسے نہیں' میں نے اتنے اصرار سے جو بلایا تھا۔ آپ کو گھر ڈھونڈنے میں دقت تو نہیں ہوئی۔ پتا تو میں نے سمجھا دیا تھا' پھر بھی سوچ رہی تھی کہ آپ کو گھر ملے کہ نہ ملے وہ خوشی سے ایسی بے سدھ ہو رہی تھی کہ ایک سانس میں کئی سوال کر

ڈالے اور وہ بھی دروازے پر کھڑے کھڑے۔

"بس اب میں جاؤں۔"

"کیا مطلب سر۔"

"ٹیوشن کا ٹائم تو یہیں ختم ہو گیا۔"

"سوری سر۔ میں آپکو بلانا تو بھول ہی گئی۔ آیئے اندر آجایئے۔"

افروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آنکھیں بچھا دے یا پلکوں کا شامیانہ کر دے۔

"اماں' دیکھو تو کون آیا ہے؟"

"کون ہے؟"

"سر آئے ہیں۔ سر مجید۔"

بٹھاؤ' میں آ رہی ہوں۔"

وہ تو پہلے ہی دوپٹے کے کونے سے صوفے کو صاف کر کے مجید کو بٹھا چکی تھی۔ مجید اس طرح سہما ہوا بیٹھا تھا جیسے ابھی کوئی آئے گا اور اسے اٹھنے کو کہہ دے گا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے افروز کی والدہ کس مزاج کی خاتون ہوں۔

کچھ دیر گزری تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یہ یقیناً افروز کی والدہ تھیں۔ قدرت نے گلاب کی پتیوں کو سپید جلد میں گھلا ملا دیا تھا۔ نقش ایسے شاندار کے مصور شبیہ نہ کھینچ سکے۔ سر سے پاؤں تک سفید ساڑی میں لپٹی وہ یوں کھڑی تھیں جیسے افروز کی جوانی نے بڑھاپے کا روپ دھار لیا ہو۔

"بیٹھو بیٹا بیٹھو۔ افرور تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔ تم بالکل ویسے ہی ہو جیسا یہ بتا رہی تھی۔" افروز کی ماں نے اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر کہا۔

اماں یہ اس سے بھی اچھے ہیں جتنا میں نے بتایا ہے۔"

"کسی اچھے گھر کے دکھائی دیتے ہیں۔ بیٹا' تم بہار کے تو نہیں ہو؟"

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ میرے والدین بہار سے ڈھاکہ آ گئے تھے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔"

"ارے تم تو اپنے علاقے کے ہوئے نا۔"

"آپ لوگ بی بہار کے ہیں؟"

"اور نہیں تو۔"

"چلو' یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔"

"کبھی اپنی والدہ کو یہاں لاؤ۔"

"ان کا تو انتقال ہو چکا۔ والد صاحب بھی اب اس دنیا میں نہیں۔"

"تو تم اکیلے رہتے ہو؟"

"یہی سمجھئے۔ بس ایک معذور بہن ہے۔"

"معذور بہن!"

"ہاں۔ بچپن میں اسے پولیو ہو گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔"

"آپ تو کہہ رہے تھے' گھر میں آپ کے سوا کوئی نہیں۔" افروز بڑی دیر بعد اس گفتگو میں داخل ہوئی۔

"اور کیا کہتا۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

مجید کے حالات نے کچھ دیر کے لیے فضا کو سوگوار کر دیا۔ افروز کی آنکھوں میں اس کے لیے رحم کے جذبات تیر رہے تھے۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔ بالآخر اس سکوت کو افروز کی والدہ نے توڑا۔

"اسے اپنا ہی گھر سمجھو بیٹا۔ میں بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گی' تمہاری بہن سے ملوں گی۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ میں ضرور آپ کو لے کر چلوں گا۔"

"اچھا اب تم لوگ پڑھائی شروع کرو' میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

ان کے جاتے ہی سکوت پھر لوٹ آیا۔ مجید بھی جیسے بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ افروز کو بھی جیسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے مجید سے کیا بات کرنی ہے۔

"چلئے کتاب نکالیے۔" مجید نے کہا اور افروز کسی خاموش خواب سے کسی بولتی ہوئی دنیا میں داخل ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ کتاب اٹھا کر باہر پھینک دے اور چیخ چیخ کر کہے' میں نے تمہیں یہ کتاب پڑھانے کے لیے نہیں بلایا۔ میں نے تو تمہیں پڑھانا چاہتی ہوں۔ اشعار کہنا چاہتی ہوں۔ تم کیسے استاد ہو' عشق پڑھاتے ہو مگر عشق سمجھتے نہیں۔ پھر اس نے سوچا' آج کا دن ان باتوں کے لیے مناسب نہیں۔ مجید کے زخموں سے لہو رسنے لگا

ہو گا۔ اس وقت اسے نشتر کی نہیں‘ مرہم کی ضرورت ہے۔ اب تو وہ روز ہی آیا کرے گا جو کہنا ہے کل بھی کہا جا سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا اور آنکھیں کتاب پر رکھ دیں۔

مجید نے شعر پڑھا۔

سوچا تھا کہ یوں کہتے‘ یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا



دوسرے دن وہ کالج پہنچی تو عام دنوں سے زیادہ خوش تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک دن بعد کالج آئی تھی بلکہ اس لیے خوش تھی کہ شام کو پھر سر مجید اسے ٹیوشن پڑھانے آئیں گے۔ وہ آج دل ہی دل میں اترا رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں سے خود کو ممتاز سمجھ رہی تھی۔ یہ بے چاریاں تو صرف سوچ کر ہی رہ جاتی ہیں‘ میں نے سر مجید کی قربت حاصل بھی کر لی۔ اس دن‘ شام کو مجید پھر اسے پڑھانے پہنچ گیا۔ آج وہ اپنے آپ سے کہہ چکی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے آج وہ دل کی بات کہہ کر رہے گی۔

اس نے کتاب نکالی اور سوچا دل کی کتاب کھول کر سامنے رکھ دے۔ پھر ایک انجانا سا حجاب اس پر طاری ہو گیا۔ نہ معلوم سر مجید کو میری دلی کیفیت کا علم ہے بھی کہ نہیں۔ اتنی بڑی بات سن کر نہ جانے ان کا رد عمل کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد وہ ٹیوشن پڑھانے ہی نہ آئیں۔ دو لفظوں کے لیے گھنٹوں کی قربت سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ کل دیکھا جائے گا۔ آج پڑھ لوں۔ اس نے سوچا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

آج کل‘ آج کل میں پورے پندرہ دن گزر گئے۔ وہ خود حیران تھی کہ اتنی ذرا سی بات کرنے کے لیے اس نے اتنے دن کیسے لگا دیے اور یہ کہ اتنے دن اسے صبر کیسے آ گیا۔ اب مجید اس گھر کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ افروز سے بھی ہنس بول لیتا تھا۔ افروز کی ماں تو اس پر جان چھڑکنے لگی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دل کے کسی گوشے میں افروز اور مجید کی شادی کا خیال پرورش پانے لگا ہو۔

ایک دن افروز یہ سمجھنے سے قاصر ہو گئی کہ آخر وہ اتنی دیر کیوں لگا رہی ہے جو

اسے کہنا ہے کہہ کیوں نہیں دیتی۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھی تھی اس لیے کسی خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجید اگر برہم بھی ہوا تو خاموشی اختیار کرے گا۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ مجید اس میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے اتنی ہمت بخش دی کہ وہ کہہ سکے۔

"سر' آپ کو معلوم ہے میں ٹیوشن کا یہ روگ کیوں پالا ہے۔"

"روگ!" مجید نے حیرت سے کہا۔

"ہاں روگ!" مجھے ٹیوشن کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف آپ کی قربت چاہتی تھی سر۔"

"مگر کیوں؟"

"آپ مجھے اچھے لگتے ہیں اور کیوں۔"

"یہ تو کسی بھی استاد کے لیے فخر کا مقام ہے کہ اس کا شاگرد اسے پسند کرتا ہو۔"

"مگر میں شاگرد کے ساتھ ساتھ ایک لڑکی بھی ہوں۔"

"استاد کی نظریں لڑکی اور لڑکے کے فرق کو نہیں دیکھتیں۔"

"افروز اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ بدعا بیان ہوتے ہی مجید کا چہرہ سرخ ہو جائے گا اور وہ کہے گا یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی مگر اب خود اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شرم سے نہیں غصے سے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجید واقعی اتنا سیدھا ہے یا وہ اسے اپنے قابل نہیں سمجھتا۔ اسے اپنی توہین کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اس نے شدید غصے میں وہ بات کہہ ڈالی جو شاید وہ عام حالات میں نہ کہہ پاتی۔

"مجید صاحب' میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ استاد' شاگرد والی نہیں۔ سچ مچ کی محبت۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکے والی۔"

مجید کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے سامنے کمرے کی دیواریں گھومنے لگیں لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔ اس نے نہایت بردباری سے کہا۔

"یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا۔"

"مگر مجھے تعجب ہے۔ یہ فطری جذبہ آپ میں بیدار کیوں نہیں ہوا۔"

"فطری بھی کہے رہی ہو اور اس میں اختیار کا پہلو بھی تلاش کر رہی ہو۔ نہ تم نے جان بوجھ کر محبت کی ہے' نہ میں جان بوجھ کر کر سکتا ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے' کسی وقت گھٹا امڈ کر آئے اور مجھ پر بھی محبت کی بارش شروع ہو جائے۔"

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" افروز' عمر کی اس منزل میں تھی جب وہ بے خوف ہو کر یہ بات کہہ سکتی تھی۔ مجید بھی عمر کی انہی منزلوں کے اریب قریب تھا لیکن شاید علم کی خشکی یا پیشہ ورانہ ذمے داریوں نے اسے باوقار بنا دیا تھا۔ افروز اپنے جذبوں پر بند نہیں باندھ سکتی تھی مگر وہ اس سرکش گھوڑے کو قابو کر سکتا تھا۔ وہ افروز کی اس صاف گوئی پر ہکا بکا رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ لڑکیاں ہزار مرتبہ سوچتی ہیں تب اپنی شادی کا ذکر زبان پر لاتی ہیں بلکہ اس وقت بھی نہیں لاتیں افروز نے جس بے پروائی سے یہ جملہ کہہ دیا اس سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے کم عمری کی محبتوں کے بہت سے قصے سنے تھے۔ آج افروز اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ محبت پائیدار نہیں ہوتی لیکن اس کیفیت میں گرفتار لڑکی اس وقتی جذبے سے مجبور ہو کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ مایوس ہو کر اپنی جان بھی لے سکتی ہے' محبوب پر بھی جھپٹ سکتی ہے۔ مجید کو اس وقت اپنی عقل کا امتحان لینا تھا۔ اس نے افروز کی خوبصورت آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اپنے ارادوں کے تعاقب میں کتنی دور تک جا سکتی ہے۔ گھٹا تلی کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہو گیا۔ وہ مجید کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور رخساروں سے ہوتے ہوئے سامنے رکھی ہوئی کتاب پر پھیل گئے۔

مجید نے گھبرا کر کتاب کو دیکھا۔ غالب کی غزل کا یہ شعر اس کے سامنے تھا۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

"افروز تم کیا سمجھتی ہو۔ محبت اتنی بے زبان ہوتی ہے کہ اپنا مفہوم بھی نہ سمجھا سکے۔ میں تمہارے جذبے سے واقف بھی ہوں' قدردان بھی ہوں اور اسی جذبے کا حامل بھی ہوں۔ تم نے کہہ دیا' میں کہہ نہیں سکتا۔"

انگارے دہک رہے ہوں تو پانی کے چھینٹے دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑے تو بول دینے میں حرج نہیں۔ مجید نے اس وقت یہی لیا۔ بیمار کے چہرے پر رونق آ گئی' مرجھائی ہوئی کلی شاداب ہو گئی۔

"آپ کتنے اچھے ہیں سر۔ میں آج آپ کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بناؤں گی۔ اس لیے کہ امی اور ابو دونوں گھر پر نہیں۔"

معلوم نہیں اس نے حقیقت بیان کی تھی یا شرارت کی تھی مگر مجید نے محسوس کیا کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے۔ پاگل کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ افروز کی حالت پاگلوں جیسی ہی تو تھی۔ مجید نے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا اور جتنی دیر میں وہ چائے لے کر آتی وہ اس کے گھر سے نکل آیا۔ میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دلا دیا ہے۔ اس کی وحشت میں کمی آ گئی ہو گی' میری غیر حاضری اسے برہم ضرور کرے گی لیکن میں اسے بہلا لوں گا۔ وہ اس کے گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔

دوسرے دن مجید نے اسے کلاس میں دیکھا تو حسب توقع اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے جیسے وہ رات بھر نہ سوئی ہو۔ وہ اپنے آپ پر بہت توجہ دینے والی لڑکی تھی لیکن آج اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' یونیفارم شکن آلود تھا۔ وہ اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجید کو دیکھ رہی تھی کہ وہ پڑھانا بھول گیا اور پیریڈ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ کلاس روم سے باہر نکل آیا۔ اسے ڈر تھا کہ افروز اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے تاکہ اسٹاف روم تک پہنچ جائے۔ وہ اگر اسٹاف روم میں آ بھی گئی تو ایسی ویسی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی ہی ایک شاگرد سے ڈر رہا تھا۔ پاگل سے کون نہیں ڈرتا۔ اس نے سوچا اور مسکرا دیا۔

"جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔" وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔

"بول تو رہی ہو۔" مجید نے اس تلخی کو کم کرنے کے لیے مذاقاً کہا۔

"بولنا تو پڑے گا ہی۔ پوچھنا تو ہے کہ میں چائے لے کر آئی آپ اٹھ کر چلے آئے کیوں؟"

"وہ کیا ہے کہ اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

"مجھے آواز دے لیتے۔"

"میں نے سوچا تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گی۔"

"چھوڑیے سر' کیوں بہانے کرتے ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ گھر میں کوئی نہیں تھا اس لیے چلے آئے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہی بات تھی۔"

"افسوس ہوا یہ سن کر۔ آپ کو نہ مجھ پر اعتماد ہے نہ خود پر۔" افروز جس وقت یہ بات کہہ رہی تھی' اضمحلال اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔

مجید نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کئی لڑکیاں معنی خیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ "یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ باقی باتیں شام کو گھر پر کر لینا۔" مجید نے کہا۔

"آپ آئیں گے پڑھانے؟"

"ہاں' کیوں نہیں آؤں گا۔"

"میں سمجھی تھی اب آپ نہیں آئیں گے۔ بہت شکریہ سر۔" افروز نے کہا اور خوشی سے اچھلتی ہوئی اس طرح واپس بھاگ گئی جیسے کالج میں اس کے علاوہ کوئی نہ ہو۔ لڑکیوں کے قہقہے گونجے۔ مجید یوں آگے بڑھ گیا جیسے پلٹ کر دیکھا تو پتھر کا بن جائے گا۔

وہ اسٹاف روم میں پہنچا تو اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ اس کا ذہن مسلسل افروز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آدمی سوچتا اسی کے بارے میں ہے جسے اہمیت دیتا ہے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ افروز کو اہمیت دینے لگا ہے۔ اعتراف نہ کرے لیکن محبت کرنے لگا ہے۔ اس کا ذہن اور دل مختلف سمتوں میں سفر کر رہے تھے۔ وہ بھی انسان تھا اور افروز اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جائے لیکن ذہن کہتا تھا' وہ لڑکی نہیں تمہاری شاگرد ہے۔ تم محض انسان نہیں' استاد بھی ہو جو شاگردوں کے لیے باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ دل کہتا تھا باپ کا درجہ رکھنا اور بات ہے' باپ ہونا اور بات ہے۔ ذہن کہتا تھا' دنیا کو ہنسنے کا موقع نہ دیا جائے تو اچھا ہے۔ یہ ایک وقتی جذبہ ہے اگر دل شکنی کی جائے تو افروز کے سر سے عشق کا بھوت اتر سکتا ہے۔ دل کہتا تھا' وہ سچی ہے دل شکنی کی گئی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ ذہن

لکھتا تھا' اسے یہیں روک دینا چاہیے' دل کہتا تھا وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ کافی دیر تک خود سے لڑتا رہا۔ اسے اب یقین ہوتا جا رہا تھا کہ افروز اب اس کی ذہن پر حاوی ہونا شروع ہو گئی ہے۔

اسی کشمکش میں کالج کی چھٹی ہو گئی اور وہ اس کے ارادے کے ساتھ گھر پہنچا کہ اب وہ افروز کے گھر نہیں جائے گا۔ انسان کتنا ہی کمزور ہو' ارادے سے بڑی کوئی قوت نہیں ہوتی۔ کچھ دن مجھے پچھتاوا یا افسوس ہو گا' وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ وقت گزرتا ہے تو کسی کے بغیر بھی گزر سکتا ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا۔ وہ افروز سے کیا کہے گا۔ وہ گھر پر نہ سہی کالج میں تو ملے گی۔ میں اس کا ماتحت تو نہیں ہوں' ڈانٹ دوں گا' ٹھیک ہو جائے گی۔ جب مجھے اس سے کوئی سروکار ہی نہیں تو دل ٹوٹے کہ رہ جائے' مجھے کیا۔ وہ خواہشوں کے سائبان سے باہر نکلا اور دھوپ میں جھلستا ہوا گھر پہنچ گیا۔ آج وہ اتنی جلدی میں تھا کہ پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ اسے اپنی تھکن کا اندازہ تو اس وقت ہوا جب اس کی معذور بہن نے وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ روز کی طرح آج بھی مسکرا رہی تھی لیکن مجید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

"کیا بات ہے بھیا۔" اس نے مجید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"کیسی بات۔ کچھ بھی تو نہیں۔ باہر دھوپ بہت ہے' تھک گیا ہوں۔ آج پیدل آیا ہوں۔"

"پیدل آئے ہو۔ کیوں؟"

"بس یونہی۔ یاد ہی نہیں رہا۔ ٹہلتا ہوا آگیا۔"

"اچھا' تم ہاتھ منہ دھولو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ تمہاری قسم بڑی تھوک لگ رہی ہے مجھے۔"

یہ اس کا خاص انداز تھا۔ وہ کھانے کے وقت اس کی قسم اور اپنی بھوک کا ذکر ضرور کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے بھوک لگ رہی ہو یا نہیں' کچھ نہ کچھ کھا لے۔ کھانے بیٹھتی تھی تو اسی کو کھلاتی رہتی تھی' خود کچھ نہیں کھاتی تھی۔ پہلے ہی کھا لیتی ہو گی' بھوک کی قسم تو محض دکھاوا تھی۔ وہ معذور تھی لیکن گھر کا تمام کام کاج اس نے

اتنی خوبصورتی سے سنبھالا ہوا تھا کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی معذور لڑکی رہتی ہے۔ مجید نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ مستقل ملازمہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لے لیکن لگی بندھی آمدنی اس کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ افروز کی ٹیوشن ملنے کے بعد اسے اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی تھی۔

"بھیا' کچھ کھاؤ بھی۔ تم تو سوچ رہے ہو۔ جلدی کھالو پھر تمہیں ٹیوشن پڑھانے بھی جانا ہے۔"

مجید یوں چونک پڑا جیسے افروز نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس نے الٹے سیدھے نوالے چبانے شروع کر دیے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گیا دراصل اسے سوچنے کے لیے مہلت درکار تھی۔

"کب اٹھادوں؟"

"میں آپ ہی اٹھ جاؤں گا۔" اس نے کہا اور دوبارہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"دروازہ بند کرتی جا رہی ہوں۔" اس کی بہن نے کہا اور وھیل چیئر گھسیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تنہائی ملتے ہی مجید کا ذہن اس سے باتیں کرنے لگا۔ مجید کہہ چکا تھا کہ اب وہ ٹیوشن پڑھانے نہیں' جائے گا۔

"اردو کی ٹیوشن ملتی کہاں ہے۔"

"مل ہی جائے گی۔"

"تمہیں پورے چھ مہینے کالج میں پڑھاتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اب جا کر ایک ٹیوشن ملی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ افروز پڑھنا نہیں' ملاقات چاہتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر لڑکی ملاقات چاہتی ہو۔"

اسی سوال جواب میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ سو کر اٹھا تو اس کی آنکھوں میں وہ خواب ابھی تازہ تھا جو کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ تھا۔ گھر میں کہیں سے ایک ملازمہ آ گئی تھی جس نے گھر کو شیشے کی طرح چمکا دیا تھا۔ اس کی بہن دلہن بنی' سر پر تاج رکھے بیٹھی تھی اور کہہ رہی تھی' بھیا مجھے بہت آرام مل رہا ہے۔ اب اس ملازمہ کو میں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اسی وقت اس کی بہن اپنی وھیل چیئر پر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے سر پر تاج تو کیا ہوتا' بال بھی سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔

"بھیا میں نے تمہارے کپڑے استری کر دیے ہیں۔ جلدی سے اٹھ کر نہالو۔"

مجید نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ میں کوئی ملازمہ رکھ سکتا تو اسے میرے کپڑے پر استری کرنے کی فکر کیوں ہوتی۔ غضب خدا کا' میں سو رہا تھا اور یہ میرے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ میں افروز سے یا کسی سے بھی شادی کر لوں تو میرے کام تو ہو جائیں گے۔ اس غریب کا کیا ہو گا۔ آنے والی تو اسے بوجھ ہی سمجھتی رہے گی۔ پھر وہ یہ کیا سمجھے گی' کیا سوچے گی کہ بھائی اپنی شادی کر کے بیٹھ گیا۔ نہ معلوم آنے والی کس مزاج کی ہو۔ اچھا خاصا پرسکون ماحول ہے' کیا خبر کیا زہر گھل جائے۔ ملازمہ تنخواہ دار ہوتی ہے جس کام پر نوکر رکھی جائے گی' اسے اسی کام سے غرض ہو گی۔ گڑ بڑ کی دوسری آجائے گی۔ وہ جھٹ پٹ تیار ہوا اور افروز کے گھر کی طرف چل دیا۔ جہاں سے دس دن بعد اسے پانچ سو روپے ملنے والے تھے۔

اسے آج دیر ہو گئی تھی۔ افروز بے چینی سے اپنی چھت پر ٹہل رہی تھی جیسے اسے شک ہو کہ مجید راستے سے نہ پلٹ جائے۔ وہ چھت پر ہو گی تو اشارے سے بلا تو سکتی ہے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی افروز اسے نظر آ گئی۔ "سر' میں تو سمجھی تھی آپ گول ہو گئے۔" اس نے دروزہ کھولتے ہوئے کہا۔

"گول کیسے ہو جاتا۔ دس دن بعد تنخواہ وصول کرنی ہے۔"

"تو آپ صرف تنخواہ کے لیے آتے ہیں۔" افروز کا مسکراتا ہوا چہرہ مرجھا کر رہ گیا۔

مجید کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے ناداستگی میں ایک معصوم کا دل دکھا دیا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اندر تو آنے دو۔"

"سچ! آپ مذاق کر رہے تھے۔" اس نے راستہ دیا اور تقریباً اچھلتی ہوئی اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ مجید' فکر مندی سے اسے چلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ لڑکی کیسا روگ لگا بیٹھی ہے۔ فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ اس کی سوچ طول کھینچتی۔ وہ ابھی یہی سوچ سکا تھا کہ ڈرائنگ روم نے اس کے قدم روک دیے۔

"سر' آج پڑھائیں گے نہیں' باتیں کریں گے۔" اس نے مجید کو بیٹھنے بھی نہیں دیا اور کھلکھلا کر کہا۔

"کیوں' کیا سب کچھ پڑھ چکیں۔"

"ارے نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج امی نہیں ہیں اور ابو تو آتے ہی رات کو ہیں۔"

خوف کی ایک لہر سی مجید کے دل میں اٹھی۔ وہ کیوں آگیا۔ آج نہ آتا تو کتنا اچھا تھا۔ "یہ تمہاری امی روز روز کیوں چلی جاتی ہیں۔" مجید نے اپنا خوف اور غصہ چھپاتے ہوئے کہا۔

"شاید انہیں بھی معلوم ہو گیا ہے کہ میں آپ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ اس دن کی طرح اٹھ کر نہ چلے جائیں اس لیے میں نے پہلے ہی چائے بنا کر رکھ لی ہے۔ یہ دیکھئے۔" اس نے تھرماس کی طرف اشارہ کیا جس میں یقیناً چائے تھی۔

"تم آخر مجھ سے چاہتی کیا ہو۔" مجید نے زچ ہو کر کہا۔

"کمال ہے آپ عشق پڑھاتے ہیں' عشق سمجھتے نہیں۔"

"میں عشق پڑھاتا بھی ہوں اور سمجھتا بھی ہوں لیکن تمہیں مجھ سے ایسی بات کہتے ہوئے حجاب آنا چاہیے تھا۔"

مجید نے دیکھا کہ یہ بات سنتے ہی افروز کی پلکیں جھک گئیں۔ کچھ دیر وہ گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر جیسے کہیں دور سے اس کی آواز آئی۔ حجاب آیا تھا سر۔ بہت حجاب آیا تھا۔ بہت دن تک میں دل کی باتیں دل سے کہتی رہی۔ پھر آپ نے پڑھایا۔

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت میں نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

تو محبت کو میں ایک مقدس چیز سمجھنے لگی۔ میری نظر میں تو محبت کا وہی فرسودہ سا تصور تھا لیکن آپ نے روحانی تصور دیا۔ ہمیں کلاس میں سمجھایا کہ محبت کے بغیر انسانیت مکمل نہیں ہوتی۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ آپ نے کہا تھا۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مجھے یاد ہے آپ نے کہا تھا' مجاز کے بغیر حقیقت کا راستہ نہیں ملتا۔ آپ نے بطور مزاح داغ کا یہ شعر بھی سنایا تھا۔

کب کسی در پہ جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

آپ نے محبت بھرے اشعار سنا سنا کر میرے اندر سوئی ہوئی محبت کو بیدار کیا اور جب میں اس مقدس جذبے کو استعمال کرنے پر آمادہ ہوں تو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں واپس چلی جاؤں۔"

"کیا میں نے یہ کہا تھا کہ مجھی کو نشانہ بنالو۔"

"ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ ہر شخص اپنے آئیڈیل سے محبت ایک استاد تھا ایک ایسا استاد جو اپنی عمر سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ پھر آپ ہماری کلاس میں آئے۔ میں خوش ہو گئی کہ میرا آئیڈیل آ گیا۔ آپ اگر محبت کے قائل نہیں تھے تو اس جذبے کی وکالت کیوں کرتے رہے۔"

"یہ نصاب کی مجبوری تھی۔ جو کچھ اس میں تھا وہی تو پڑھاتا۔"

"مگر آپ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ یہ سب غلط ہے۔"

"غلط نہیں ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ ایک عظیم جذبہ ہے۔"

"تو پھر مجھے عظیم بننے سے کیوں روک رہے ہیں۔"

"آپ اس خول میں کیوں بند رہنا چاہتے ہیں۔ کیا استاد کو محبت کرنے یا استاد سے کسی کو محبت کرنے کا حق نہیں۔ اگر تمام اچھی باتیں استاد کو زیب دیتی ہیں تو یہ اچھی بات کیوں نہیں۔"

"دنیا اسے کسی اور نظر سے دیکھتی ہے۔"

"دنیا تو سب کچھ کہے گی۔ کیا استاد ہونے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جدید فیشن کے کپڑے نہ پہنے' کھل کر ہنس نہ سکے۔ کیا اس کی کوئی ذاتی زندگی نہیں۔ کیا استاد بنتے ہی گوشت پوست کے آدمی کو پتھر کا ہو جانا چاہیے۔ کیا استاد ابنارمل ہوتا ہے۔"

"تم اپنی عمر کی نہیں آپ کی عمر کی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ خود کو دھوکا دے

رہے ہیں۔ سچ بتائیے کیا آپ کے دل میں کسی کی محبت آباد نہیں۔ کھائیے قسم یا ا
لوں یہ چھری اپنے سینے میں۔" افروز نے چھری اٹھالی۔

"کیا کر رہی ہو۔" مجید نے گھبرا کر اس کی کلائی تھام لی۔

"جواب دیجیے۔ آپ کو آپ کی معذور بہن کی قسم جواب دیجیے۔ اگر آپ ے
دل میں کسی اور کی تصویر ہوئی تو میں اس کا نام نہیں پوچھوں گی۔"

"ہاں' میں اس جذبے سے اب خالی نہیں رہا۔" اس کے ہاتھ سے افروز ا
کلائی چھوٹ گئی۔

"سر' میں وعدہ کر چکی ہوں کہ اس کا نام نہیں پوچھوں گی لیکن مجھے یقین ہے
میں ہوں۔ بس مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ آپ کا اقرار میری زندگی ہے۔ آپ ا
ایک ہاں نے مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی بنا دیا ہے۔ آپ آتے رہیں گے
نا؟"

"میں تو روز آتا ہی ہوں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے اچانک آپ آنا بند کر دیں گے۔ اچانک
مجھ سے روٹھ جائیں گے' اچانک آپ کو احساس ہو جائے گا کہ آپ استاد ہیں اور میں
آپ کی شاگرد۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ لگتا تھا کہ وہ ابھی کچ
دیر میں رو دے گی۔ اسی وقت دروازے پر بیل کی آواز ابھری اور اس نے خود
سنبھال لیا۔

"شاید امی آگئیں۔" وہ آہستہ سے اٹھی اور دروازہ کھولنے کے لیے ڈرائنگ
روم سے باہر نکل گئی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی امی کے ساتھ
کمرے میں داخل ہوئی۔

"بیٹا تم بھی کہو گے یہ بڑھیا روز روز کہاں چلی جاتی ہے۔ افروز کے ایک تا
ہیں ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ بس آج کل انہی کی پوچھ گچھ میں لگی ہوئی ہوا
اور تم سناؤ تمہاری بہن کیسی ہے؟"

"اس کا کیا ہے۔ وہ کوئی بیمار تو ہے نہیں' معذور ہے۔ آپ تو ہمارے گھر آئیے
نہیں۔"

"ہاں بیٹا آؤں گی۔ اچھا تم پڑھاؤ میں چلتی ہوں۔ گھر بکھرا پڑا ہے۔"

اس نے محسوس کیا کہ افروز کی ماں اس کے گھر آنا نہیں چاہتی۔ جب ذکر نکلتا ہے' بے پروائی سے ٹال دیتی ہیں۔ "پڑھائی تو ختم ہو چکی تھی۔ اب تو میں چلوں گا' مجھے اجازت دیں۔"

"تم جانو۔ افروز! تمہارے ماسٹر صاحب جا رہے ہیں۔" انہوں نے افروز کو آواز دی جو ابھی اٹھ کر اندر گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ افروز اندر آتی' وہ کمرے سے نکل چکا تھا۔

آج کی گفتگو کے بعد افروز کو تو جیسے خزانہ مل گیا لیکن وہ ایسی دولت مند ثابت ہوئی جیسے دولت چھپانے کی بجائے دولت کی نمائش کا شوق ہوتا ہے۔ اس نمائش میں یہ جذبہ بھی کار فرما ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ مرعوب ہوں یا جلنے لگیں۔ اس میں اس کی کم عمری کا بھی دخل تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں وہ ایسے بڑے جذبے کی مالک بن گئی کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے اپنے اور مجید کے درمیان ہونے والی گفتگو بڑھا چڑھا کر سہیلیوں کو سنائی۔ پھر وہ روزانہ کوئی نہ کوئی کہانی گھڑتی اور کسی نہ کسی کو سنا دیتی۔ ہوا پر پہرے کون بٹھا سکتا ہے۔ دھوئیں کو مٹھی میں بند کر کے اوپر جانے سے کون روک سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے رومان پر ورقصے کالج کی لڑکیوں میں گردش کرنے لگے۔

مجید اس ساری صورت حال سے بے خبر تھا۔ اس نے یہ تبدیلی تو محسوس کی تھی کہ اسے دیکھتے ہی لڑکیاں سرگوشیاں کرتیں' ایک دوسری کو کہنی مارتیں' آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوتے اور پھر کئی بے باک قہقے اس کی سماعت سے ٹکراتے۔ وہ اسے بھی اپنی مقبولیت سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا جب یہ خبریں اساتذہ میں بھی موضوع بحث بننے لگیں۔ اساتذہ کو ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے کا جتنا شوق ہوتا ہے شاید کسی محکمے کے افسران کو بھی نہ ہو۔ ایک کی مقبولیت دوسرے کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ خصوصاً" جس ٹیچر کو لڑکیوں میں مقبولیت عام حاصل ہوتی اس سے جلنے والوں کو تو کسی بہانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس یہ کافی تھا کہ لڑکیاں اس کی تعریف کیوں کرتی ہیں۔ کوئی استاد اگر اپنی قابلیت اور محنت سے اپنے شاگردوں

کے دلوں میں جگہ بناتا تو کم اہلیت کے اساتذہ اسے طرح طرح کے معنی پہناتے' بے بات کی باتیں بنتیں۔ ایک گروپ وہ بھی تھا جو پرنسپل کے بہت قریب تھا۔ اسٹاف روم کیا تھا' جاسوسی کا محکمہ تھا۔ ادھر کوئی بات ہوئی نہیں کہ پرنسپل تک پہنچی نہیں۔ یہ تو بات ہی ایسی تھی کہ کالج کی عزت کا سوال تھا۔ اخلاق کی بلندیوں پر فائز اساتذہ کی عظمت کو پامال کرنے کی اوچھی حرکت تھی جو مجید سے سرزد ہوئی تھی لہٰذا چھپ کیسے جاتی۔ نہ صرف اس بات کو پرنسپل تک پہنچایا گیا بلکہ اس سلسلے میں ایک میٹنگ بھی ہوئی جس سے مجید کو دور رکھا گیا۔ اس میٹنگ میں وہ چند لڑکیاں بھی شامل ہوئیں جو اپنے کسی اندرونی حسد کی وجہ سے افروز کے خلاف تھیں۔

ان سب سے میٹنگ کے بعد پرنسپل نے مجید کو اپنے دفتر میں بلوایا۔ مجید کو معلوم تھا کہ اس سے کیا پوچھا جائے گا۔ اس نے ذہنی طور پر خود کو تیار کیا اور پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔

"جو کچھ میں نے سنا ہے' یقیناً آپ نے بھی سن لیا ہو گا۔" پرنسپل نے کہا۔

"جی ہاں' سن تو رہا ہوں۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اس سے کالج کی بدنامی نہیں ہو گی۔"

"بالکل ہو گی۔ اسی لیے میرا کہنا ہے کہ ان خبروں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے مگر یہاں تو اس میں دلچسپی لی جا رہی ہے۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے۔ آپ جو جی چاہے کرتے رہیں اور ہم آنکھیں بند رکھیں۔"

"آخر میں نے کیا کیا ہے۔"

"آپ تو میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہے ہیں۔ جھوٹ بولوں اور وہ بھی تیرے منہ پر۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ آپ انٹر کی ایک طالبہ افروز سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔"

"بالکل غلط۔"

"کیا یہ بھی غلط ہے کہ آپ اکثر اس لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں دیکھے گئے۔"

"یہ بھی غلط۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”اور یہ بھی غلط ہو گا کہ آپ نے اسے شادی کا جھانسا دیا ہے۔“
”افسوس کہ یہ الزام بھی درست نہیں۔“
”تو یہ بھی غلط ہو گا کہ آپ لڑکی سے ملنے کے لیے اسے ٹیوشن پڑھانے جاتے
ں۔“

”نہیں یہ غلط نہیں۔ میں اسے ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور ٹیوشن پڑھانا کوئی جرم
”جرم تو نہیں لیکن یہ بتایئے کوئی اور ٹیوشن آپ کے پاس ہے؟“
”نہیں۔ اردو کی ٹیوشن کون لیتا ہے۔“
”پھر اس لڑکی میں آخر ایسی کون سی بات ہے کہ آپ کسی کو نہیں پڑھاتے' اس
پڑھاتے ہیں۔“
”کسی اور نے مجھ سے پڑھنا نہیں چاہا' اس نے پڑھنا چاہا۔“
”یہی تو نکتے کی بات ہے۔ اس نے کیوں پڑھنا چاہا۔“
”مناسب ہو گا اگر یہ بات آپ خود اس لڑکی سے پوچھیں۔ مریض اگر کسی خاص
الٹر کو پسند کرتا ہے تو اس میں قصور ڈاکٹر کا نہیں مریض کا ہونا چاہیے۔“ اس نے
بلما کہ اس دلیل سے پرنسپل کچھ متفق سے نظر آنے لگے لیکن اگر مطمئن ہو جاتے تو
پل کیوں کہلاتے۔

”اس سے بھی پوچھ لیں گے لیکن قصوروار آپ بھی ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ
ان ہے' بچی ہے' آپ ایک ذمے دار استاد ہیں۔“
”مگر میں کس چیز کا قصوروار نہیں ٹھہروں گا؟“
”کمال ہے ابھی تک یہ بات ہی آپ کے ذہن میں نہیں آئی۔ ویسے تو یہ آپ
ذاتی معاملہ ہو جاتا لیکن اس طرح پورا کالج بد نام ہوا ہے۔ لڑکیوں میں غم و غصہ پایا
ا ہے۔“ ”سر' میں آپ سے پھر کہہ رہا ہوں ان باتوں میں کوئی صداقت
ں۔ یہ کوئی سازش ہے جو میرے خلاف کی جا رہی ہے۔“
”کون کرے گا یہ سازش؟“
”میں نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا کہوں گا' یہ کالج ہی کی بدنامی کا سبب نہیں اس سے
ی بے عزتی بھی ہوئی ہے اس لیے اس کی اچھی طرح چھان بین ہونی چاہیے۔“

"چھان بین تو میں کر ہی لوں گا لیکن فی الحال لڑکیوں کی کلاسوں میں آپ کا داخلہ بند کیا جاتا ہے۔"

"سر، اس طرح تو سب کو یقین آجائے گا کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا تھا وہ سچ تھا۔"

"جو بھی ہو، میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ میں ابھی اس لڑکی کو بھی بلاتا ہوں۔ آپ قصوروار ہوئے تو میں ایکشن لوں گا، بے قصور ہوئے تو پھر دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔"

"سر، یہ انصاف نہیں ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"



افروز ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جنہیں دھمکیاں مرعوب کر دیتی ہیں۔ بات کرتی ہیں ایسے جیسے چور اپنا بیان ریکارڈ کرا رہا ہو۔ یوں ہکلاتی ہیں کہ قصور نہ بھی ہو تو ثابت ہو جائے۔ وہ سچ بولنے پر جتنی قدرت رکھتی تھی اس سے بہادری سے جھوٹ بول سکتی تھی۔ وہ آج سے پہلے کبھی پرنسپل کے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے فطری خوف تو اس پر غالب تھا لیکن پہلے سوال کے بعد ہی وہ یوں تن کر کھڑی ہو گئی جیسے خود پرنسپل مجرم ہو۔

"بی بی، کیا یہ سچ ہے کہ آپ مجید صاحب سے ٹیوشن پڑھتی ہیں؟"

"پڑھتی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ان بے چاروں کی جو درگت بنی ہے اس کے بعد شاید ہی وہ پڑھانے آئیں۔"

"جو باتیں سن رہی ہیں کیا آپ ان سے انکار کریں گی۔"

"انکار کیسا، میں تو حیرت کر رہی ہوں۔"

"مگر تمام لڑکیاں تو کہہ رہی ہیں یہ تمام باتیں خود تم نے انہیں بتائی ہیں۔"

"کیسی باتیں؟"

"یہی محترمہ کہ تمہارا اور مجید کا رومانس چل رہا ہے۔ کئی لڑکیوں نے تمہیں ان کے ساتھ ہوٹلوں سے نکلتے بھی دیکھا ہے۔"

"سر! آپ میرے بڑے ہیں۔ آپ کی بھی بچیاں ہوں گی۔ یوں بھی آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر حقیقت بھی ہو تو کیا کوئی لڑکی اپنی زبان سے ایسی بات کہہ سکتی ہے۔"

"کہہ بھی سکتی ہے۔"

"میرا کیا فائدہ تھا اس میں؟"

"آپ کی شان بڑھ سکتی تھی۔"

"مگر یہ جھوٹ ہے سر۔ بہتان ہے سراسر۔" پھر نہ معلوم اس پر کیا بیتی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کوئی اور ہوتا تو اسے روتا دیکھ کر خود بھی سسکنے لگتا لیکن پرنسپل صاحب نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے کہ آنسو بھی ان کے غصے کی آگ کو کم نہ کر سکے۔

"یہ رونا دھونا بند کرو۔ صاف صاف بتاؤ کہ بات کیا ہے ورنہ میں بلاتا ہوں تمہارے باپ کو۔ وہ بھی تو دیکھیں اپنی لاڈلی کے کرتوت۔ وہ بھیجتے ہیں پڑھنے کے لیے' محترمہ یہاں عشق لڑا رہی ہیں۔ وہ بھی ایک استاد کے ساتھ۔"

"سر' خدا کے لیے میرے ابو کو نہ بلوایئے۔ وہ مجھے تو کچھ نہیں کہیں گے مگر اپنی جان دے دیں گے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کیسی؟"

"سر' آپ میرے ابو کو نہ بلوایئے۔"

"نہیں بلواؤں گا' اگر تم سچ بول دو گی۔"

افروز' اکڑتی ہوئی کمرے میں آئی تھی لیکن اب ہوا نکلے غبارے کی طرح پچک گئی تھی۔ یہ بات گھر تک بھی پہنچ سکتی ہے' یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ ایک ہی دھمکی نے ساری شوخی نکال دی۔ اس کا ذہن تیزی سے حرکت کر رہا تھا لیکن اندھیرا ہی تھا۔

سب راستے بند تھے۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔

"بولو۔ بتاؤ۔"

"ہاں' ہاں۔ بولو۔ مس عارفہ' آپ یوں کریں' انہیں الگ لے جا کر پوچھیں۔ انہوں نے قریب بیٹھی ہوئی لیڈی ٹیچر سے کہا۔

"نہیں سر' کوئی ایسی بات نہیں۔ میں آپ ہی کو بتائے دیتی ہوں۔ وہ' بات ، ہے کہ میں نے مذاق میں یہ باتیں کی تھیں۔ سر مجید بے قصور ہیں۔"

"کیا کہا؟" پرنسپل کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "یہ سب کچھ تم نے مذاق میں کیا۔ ایسا سنگین مذاق! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ بڑی ہو کر کیا بنو گی۔ تم تو بیچ دو گی کھڑے کھڑے مجھے بھی۔ نہیں بابا نہیں۔ ٹی۔ سی لو اور گھر کی راہ پکڑو۔"

"سر' مجھے معاف کر دیں۔" وہ بے اختیار جھکی اور پرنسپل کے پاؤں پکڑ لیے۔"

"مجھے معافی مانگنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ انسان وہ کام ہی کیوں کرے کہ معافی مانگنے پر مجبور ہو جائے۔"

"سر' آپ نے کہا تھا آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

"مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ غلطی اتنی بھیانک ہے۔"

"سر' میں آپ کی بیٹی کی طرح ہوں ——————"

"خبردار جو میری بیٹی سے خود کو مثال دی ہو گی۔"

پرنسپل اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے لیکن لیڈی ٹیچرس نے زور دیا' خود مجید نے اس کی سفارش کی تب جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور افروز کی جان چھوٹی۔ اسے واقعی یہ احساس نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ کم عمری کی نادانی نے اسے یہ بھی نہیں سمجھایا تھا کہ رسوائی کیا ہوتی ہے۔ وہ بس یہ سمجھے ہوئے تھی کہ لڑکیاں اس سے مرعوب ہوں گی مگر یہاں تو بساط ہی الٹ چکی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اسے مجید کی طرف سے تھی۔ شرمندگی اسے کاٹے دے رہی تھی۔ یہ فکر الگ تھی کہ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ٹیوشن پڑھانے آئے۔

☆○☆

مجید اس دن گھر پہنچا تو بہت الجھا ہوا تھا۔ اب اس نے گھر کے کام کاج کے لیے
ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ مجید نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے
کہہ رہا ہو تمام خرابیوں کی ذمے دار یہی ہے۔ اندر پہنچا تو اس کی بہن مسہری پر
آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ "بھیا' تم آگئے؟ اب مجھے دروازہ کھولنا نہیں پڑتا تو معلوم ہی
نہیں ہوتا تم کب آ گئے۔"

مجید کو یوں لگا جیسے اس کی بہن سر پر تاج رکھے تخت پر بیٹھی ہو۔ "صاحب جی'
کھانا لگاؤں؟" ملازمہ نے پوچھا۔

مجید کے دل میں پھر کوئی زور سے چیخا' اصل خرابی کی ذمے دار یہی ہے۔ کھانا
کھانے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔ آج پھر نیند اس کی
آنکھوں سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اب اسے کیا کرنا ہے۔ افروز کو ٹیوشن
پڑھانے جائے یا نہیں؟ پہلے کی طرح آج بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر
کہیں سے نیند کا ایک جھونکا آیا اور اسے سلا گیا۔ ایک خواب پھر کہیں سے چلا آیا۔
اس نے دیکھا وہ ملازمہ سے جھگڑ رہا ہے۔ ملازمہ نوکری چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی بہن
وھیل چیئر سے اتر گئی ہے اور گھسٹتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جا رہی ہے۔ اس
نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ خواب ابھی تک اس کی آنکھوں ہی میں تھا۔

"بھیا اٹھو۔ ٹیوشن پر نہیں جانا۔" اس کی بہن اسے اٹھا رہی تھی۔

"تم جاؤ میں ابھی اٹھتا ہوں۔"

"اچھا۔"

اسے فوراً ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ افروز سے پوچھنا تو چاہیے اس نے یہ حرکت
کیوں کی۔ کالج میں پوچھ لوں گا۔ مگر اب کالج میں اس سے ملاقات کیسے ہو گی۔ لڑکیوں
کی کلاس تو مجھ سے لے لی گئی ہے۔ بدنامی بھی اتنی ہو گئی ہے کہ اب اس سے بات نہ
کرنا ہی اچھا ہو گا۔ مجھے جانا چاہیے۔ اس نے اپنی بات کا خود ہی جواب دیا۔ اسے
محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے جیسے اس کے بغیر اسے
چین نہیں آ سکتا۔ میں کوئی اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ مجھے تو کچھ پوچھنا ہے پوچھ کر چلا

آؤں گا۔ نہ پوچھو تو کیا حرج' پوچھ لو تو کیا برائی ہے۔ اس کے اندر بڑے زور کا طوفان اٹھا ہوا تھا۔ ہر ارادہ تنکوں کی طرح اڑتا پھر رہا تھا پھر وہ کسی چیز سے ٹکرایا لہولہان ہو گیا۔ یہ غلط فہمی کی چٹان تھی جو زمین بوس ہو گئی تھی اور وہ سموچا اس کے نیچے دب گیا تھا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ افروز سے محبت کرنے لگا ہے۔ کاش! وہ تمام باتیں سچی ہوتیں جن کی شہرت ہو رہی تھی۔ وہ پروفیسر نہ ہوتا' اپنے خول میں بند نہ ہوتا وہ واقعی کسی ہوٹل سے نکل رہا ہوتا اور سب دیکھ رہے ہوتے مگر اب' اب تو وہ میری شاگرد ہے۔ تو کیا ہوا' میں ہوٹل نہیں جا سکتا اس کے گھر تو جا سکتا ہوں۔

وہ ابھی اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی بہن کمرے میں داخل ہوئی۔ "بھیا ابھی تیار نہیں ہوئے؟" "بس ابھی تیار ہوتا ہوں۔"

"کچھ اور خبر سنی تم نے؟"

"کیسی خبر!"

"میری قسمت ہی خراب ہے۔ وہ ملازمہ جو بڑے اشتیاق سے آپ نے میرے لیے رکھی تھی ---------"

"کیا ہوا اسے؟"

"ملازمت چھوڑ گئی۔"

"ملازمت چھوڑ گئی مگر کیوں؟"

"پتا نہیں۔ کہہ رہی تھی اپنے گاؤں جا رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہیں اور نوکری مل گئی ہے اسے۔ زیادہ پیسے مل رہے ہوں گے وہاں سے۔ ویسے تم فکر مت کرو بھیا۔ میری عادت ابھی اتنی نہیں بگڑی تھی' تمہارے کام اسی طرح ہوتے رہیں گے۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ ایک تو تمہاری قسمت نے تمہارے ساتھ ستم ظریفی کی اوپر سے خدا نے مجھے اس قابل نہیں کیا کہ تمہارے لیے ملازمہ رکھ سکوں۔"

"بھیا۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "تم نے پھر خدا کی ناشکری کی۔ مجھے تو فخر ہے میرا بھائی پروفیسر ہے اور تم ہو کہ ------ تم میری فکر مت کیا کرو۔ میری ٹانگیں سلامت نہیں ہیں مگر ہاتھ تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

مجید نے دیکھا کہ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں نظر آئیں

اور غائب ہو گئیں جیسے کوئی دل پر جبر کر کے مسکرانے لگے۔ "تو فکر مت کر' دوسری ملازمہ آجائے گی۔" مجید نے اپنی بہن سے کہا۔

"ارے بھیا' کیوں خرچا بڑھاتے ہو۔ اس سے تو اچھا یہ ہے کہ ایک عدد نہایت شاندار سی بھابی میرے لیے لے آؤ۔ بھابی کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"جب مجھے لے کر الگ ہو جائے گی ناتب پتا چلے گا۔ بھابی کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے کی بچی۔" اس نے اپنی بہن کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"خبردار جو میری بھابی کو برا کہا ہو گا۔"

"تو تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے وہ یہیں کہیں کسی کونے میں بیٹھی ہے۔"

"ویسے بھیا ایک بات بتاؤ جسے تم ٹیوشن پڑھانے جاتے ہو' وہ لڑکی کیسی ہے؟"

"ایسی کہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آئی ہو گی۔ خوبصورت بھی' ذہین بھی اور محبت کرنے والی بھی۔"

"اچھا بھیا' تو یہ ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے۔"

"کہو تو میں تمہارے ساتھ اس لڑکی کے گھر جاؤں۔"

"کیوں؟"

"بھئی رشتہ مانگنے اور کیوں۔"

"سلطانہ! آئندہ ایسا سوچنا بھی مت۔" وہ ایک دم اداس ہو گیا۔

"معاف کر دو بھیا۔ غلطی ہو گئی۔" وہ سچ مچ رونے لگی۔ وہ جانتی تھی مجید صرف اس وقت اداس ہوتا ہے جب وہ سخت غصے میں ہوتا ہے۔ اس نے اب وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ بھیا میری وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر ان کی یہی ضد ہے تو شاید کبھی شادی نہ کر سکیں۔ مجھے اپاہج کا ہاتھ تھامنے کون آئے گا۔ اس کی بے بسی آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں آگئی۔

اس کے جانے کے بعد مجید نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ وہ افروز کے گھر جائے لیکن وہ خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا۔ ملازمہ ہی چلی

گئی۔ اب میں اضافی آمدنی کے لیے کیوں کوشش کروں۔ وہ پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تنہائی کا وہ عادی تھا لیکن آج تو اس تنہائی میں سناٹا بھی شامل ہو گیا تھا سلطانہ بھی دوبارہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف نظر اٹھائی۔ اب تو وہ مایوس ہو چکی ہو گی یا شاید ابھی تک انتظار کر رہی ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ یوں کسی کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ میں آج تو چلا جاتا۔ جا کر کہہ آتا کہ اب وہ میرا انتظار نہ کرے اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔ اسے انتظار تو نہ ہوتا۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب مجھے اس سے کوئی سروکار ہی نہیں تو پھر کیوں چلا جاتا۔ کسی نے سرگوشی کی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر گھر سے باہر نکل آیا' سڑکوں پر بے مقصد گھومنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک رکشا کو روکا۔

"کہاں چلئے گا صاحب"

"کہیں بھی۔"

رکشا والے نے اس عجیب و غریب مسافر کو غور سے دیکھا جیسے سوچ رہا ہو' اس پاگل کو اپنے رکشے میں بٹھائے کہ نہیں۔ شکل سے پاگل تو نہیں لگتا۔ اس نے اچھی طرح یقین کیا اور پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔ "میمن سنگھ روڈ چلو۔" مجید نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو۔ وہ مسلسل آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی پلکوں کی جھالر اٹھا کے سڑکوں کی روشنی دیکھ لیتا ورنہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

وہ چند سڑکیں اور گلیاں پھلانگتا ہوا افروز کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ ڈھاکہ خاص طور پر ان شوریدگیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس لیے لوگ جلدی ہی گھروں میں دبک جاتے تھے۔ افروز کا مکان بھی تنہائی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اسے شبہ ہوا جیسے چھت پر کوئی سایہ ٹہل رہا ہو۔ وہ دروازے کے قریب گیا اور پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ کسی لڑکی کے گھر وہ اس وقت کیوں آیا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ ایک استاد کو یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا۔ اس وقت تو اس کے والد بھی آ چکے ہوں گے۔ نہیں۔ مجھے لوٹ

جانا چاہیے۔ وہ دروازے کے قریب ہٹ گیا اور گلی سے دور ہوتا چلا گیا۔ سڑک پر اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ ایک رکشا والے نے اسے پیدل جاتا ہوا دیکھ کر خود ہی رکشا روک لیا وہ بھی کوئی سوال کیے بغیر بیٹھ گیا۔

"وہ گھر پہنچا تو سلطانہ اس کے انتظار میں تھی۔

"بھیا تمہاری قسم' بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو کھالے۔ مجھے کیوں پریشان کر رہی ہے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے ڈانٹ کر کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سلطانہ اس کے لہجے کو دیکھ کر ڈر گئی۔ بھیا نے آج تک مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی۔ آج کیا ہو گیا اسے۔ معلوم نہیں کیا پریشانی ہے۔ ابھی پوچھنا ٹھیک نہیں ہے۔ صبح جب غصہ اتر جائے گا تو دیکھا جائے گا۔ وہ بھی بغیر کھانا کھائے بستر پر چلی گئی۔

گھر میں سحر اترتی تھی تو مجید اسے اٹھاتا تھا۔ وہ نیند کی بہت پکی تھی اس لیے ذرا دیر سے سو کر اٹھتی تھی۔ آج اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ سے گھر بھر گیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ آج بھیا نے اسے اٹھایا بھی نہیں۔ بغیر ناشتا کیے ہی کالج چلا گیا۔ پھر اسے یاد آیا' مجید نے رات اسے بہت زور سے ڈانٹا تھا اور وہ بہت دیر تک روئی تھی۔ اسے پھر رونا آگیا۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ وہ مجھ سے اتنا خفا ہے۔ آئے گا تو پوچھوں گی ضرور۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وھیل چیئر کو بستر کے قریب کیا اور بستر سے وھیل چیئر آ گئی۔ ناشتا بعد میں بناؤں گی' پہلے بھیا کے کمرے کی صفائی کروں۔ اس نے سوچا اور وھیل چیئر گھسیٹتے ہوئے مجید کے کمرے کی طرف چل دی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ہنسی آ گئی۔ مجید نہایت آرام سے چاروں خانے چت اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ لو' میں سمجھ رہی تھی بھیا مجھ سے خفا ہیں' بغیر بتائے کالج چلے گئے۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اس نے زور زور سے اسے آواز دی۔ مجید ایسا بے خبر سو رہا تھا کہ ہر آواز اسے تھپکی بن کر سلائے دے رہی تھی۔ سلطانہ نے گھبرا کر اسے جھنجوڑا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے چولھے پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ مجید کا بدن تیز بخار کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ کیا سمجھ رہی تھی' یہ کیا ہو گیا۔ بخار کی شدت سے وہ بے ہوش تھا۔ سلطانہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ وہ وھیل

چیئر کو ٹیلی فون تک لے گئی۔ اس نے اپنے پڑوسی کا نمبر ملایا' مجید کی حالت بتائی اور درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر کو بلا دیں۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی گئیں' انجکشن وغیرہ دیے تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ سوتے جاگتے دن گزر گیا۔ رات میں کہیں اس کا بخار مکمل طور پر اتر گیا اور دوسرے دن وہ معمول کے مطابق کالج چلا گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظریں افروز کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ نئی پابندیوں کی وجہ سے گرلز سیکشن کی طرف نہیں جا سکتا تھا لیکن اسے امید تھی کہ افروز کسی نہ کسی بہانے اس سے ملے گی ضرور۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کی خوشی بڑھتی جا رہی تھی کہ شکر ہے افروز کا نشہ اتر گیا لیکن جب کالج کی چھٹی ہو گئی اور وہ نہیں آئی تو وہ اداس ہو گیا۔ اس کی خوشی بھی بے وجہ تھی اداسی بھی نہ سمجھنے والی۔ وہ کالج سے نکل کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا کہ افروز گزرے گی تو ادھر ہی سے۔ وہ اس وقت کالج کا استاد نہیں' آوارہ طالب علم لگ رہا تھا۔ وہ طالب علم جو گرلز کالجوں کے اردگرد اکثر منڈلاتے ہیں۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے' کیا کر دیا ہے اس لڑکی نے مجھے۔ اس نے انتظار پر لعنت بھیجی اور گھر چلا آیا۔

افروز کے اقرار جرم کے بعد مجید بے قصور ثابت ہو چکا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پرنسپل اس سے معذرت چاہتا اور گرلز سیکشن میں جانے کی پابندی ختم کر دی جاتی لیکن ہوا یہ کہ سازشیوں کو اس کے بے قصور ثابت ہونے سے دھچکا پہنچا۔ انہوں نے پرنسپل کے کان بھرنا شروع کر دیے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ واقعہ درست ہے۔ لیکن لڑکی نے الزام اپنے سر لے کر مجید کی جان چھڑانی چاہی ہے۔ اگر یہ دونوں اسی کالج میں رہے تو یہ کہانی دوبارہ شروع ہو جائے گی۔ اس لیے مجید کا ٹرانسفر کرا دیا جائے۔

''افروز ہی کو ٹی سی کیوں نہ دے دی جائے۔'' پرنسپل نے کہا۔

"اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ ایک لڑکی چلی جائے گی اور بہت سی ہیں۔ مجید صاحب اپنی حرکتوں سے باز تھوڑے آئیں گے۔"

"مجھے تو ان میں کوئی ایسا عیب نظر نہیں آتا۔" پرنسپل نے اس کی صفائی پیش کی۔"

"ارے صاحب' آپ تو کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں' آپ کو کیا معلوم۔ بڑے حضرت ہیں یہ حضرت۔ ہر وقت لڑکیوں میں گھسے رہتے ہیں۔ ہم اتنے عرصے سے پڑھا رہے ہیں مگر کوئی ہمیں پوچھنے نہیں آتی۔ ان سے ملنے والیوں کی اسٹاف روم میں قطار لگی رہتی ہے' چھٹی کے بعد یہ صاحب کبھی اکیلے نہیں جاتے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی ساتھ ہوتی ہے۔ یہ بات ہم آج آپ کو بتا رہے ہیں۔ ہمیں تو خود اچھا نہیں لگتا کہ اپنے ساتھی کی شکایت کریں اور وہ بھی آپ سے جو ایکشن لینے میں دیر ہی نہیں لگاتے۔"

"کئی قہقہے ایک ساتھ گونجے اور پرنسپل صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے والوں نے شکایت بھی کر دی اور پرنسپل صاحب کی تعریف بھی کر دی کہ آپ تو وہ ہیں جو ایکشن لینے میں بھی دیر ہی نہیں لگاتے۔ "مگر سوال یہ ہے کہ مجید صاحب پر چارج کیا لگایا جائے۔" پرنسپل صاحب نے پوچھا۔

"ارے صاحب سوچنا کیا ہے۔ سیدھا سیدھا لکھئے کہ موصوف کا کردار صحیح نہیں ہے۔"

"نہیں' یہ کوئی اچھی بات ہے۔"

"تو پھر آپ جانیں۔"

"وہ تو میں کچھ نہ کچھ لکھ دوں گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجید صاحب سے کیا کہا جائے گا۔"

"ان سے کہیے لڑکیوں کے والدین کی شکایتیں آئی تھیں۔ وہ آپ کو اس کالج میں دیکھنا نہیں چاہتے۔"

سازش کامیاب ہو گئی۔ دوسرے دن مجید کالج پہنچا بھی نہیں تھا کہ اس کے ٹرانسفر آرڈر تیار ہو چکے تھے۔ وہ حسب معمول کلاس لینے جا رہا تھا کہ اسے پرنسپل نے بلا لیا۔ مجید صاحب! آپ کو یہ اطلاع پہنچاتے ہوئے مجھے دکھ ہو رہا ہے کہ آپ اب

اس کالج میں نہیں رہیں گے مگر میں مجبور ہوں۔ میں نے آپ کے ٹرانسفر کی درخواست کی ہے۔ کل تک آپ کو ڈائریکٹوریٹ سے پوسٹنگ آرڈر مل جائے گا۔ دیکھیے کہاں پوسٹنگ ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں مجبوری تھی۔"

"سرکاری ملازمت میں ٹرانسفر کوئی انوکھی بات نہیں لیکن میں پوچھ سکتا ہوں' میرا قصور کیا ہے' مجید نے احتجاج کیا۔

"وہی افروز والا واقعہ۔ بھئی کچھ والدین آئے تھے' ان کا مطالبہ تھا کہ آپ کو یہاں نہیں رہنا چاہیے۔

"مگر اس واقعے کی وضاحت تو ہو گئی تھی اور پھر نکالنا ہی ہے تو اس لڑکی کو نکالنا چاہیے' مجھے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے۔"

"آپ ابھی نئے ہیں۔ بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔ لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ نکالا جائے گا تو وہ اپنا بیان بدل بھی سکتی ہے۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ بھی کھڑا کر سکتی ہے۔ پھر کیا عزت رہ جائے گی آپ کی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ کنارہ کشی کر لیں۔ میں نے ڈائریکٹوریٹ کو اس واقعے کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ آپ اپنی عزت بچا لیں ورنہ بات وہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ پھر عزت بھی جائے گی اور نوکری بھی۔"

مجید کا جی چاہا کہ وہ اس ٹرانسفر کے خلاف بھرپور احتجاج کرے لیکن وہ پرنسپل کے سیاسی اثر و رسوخ سے واقف تھا۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی فضا غیر بنگالیوں کے لیے ہرگز سازگار نہیں تھی۔ اس بوجھ کو یہاں کے لوگ برداشت ضرور کر رہے تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد وہ اس بوجھ کو اتار پھینکیں گے۔ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات نے ایسا جادو کیا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تھپک تھپک کر سلا دی گئی تھیں۔ ایوب خاں کے طویل مارشل لا اور اس کے بعد یحییٰ خاں کے دوسرے مارشل لا نے مشرقی پاکستان کو معاشی بدحالی کے آخری کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ ایک عام بنگالی مغربی پاکستان کو اس کا ذمے دار اور غیر بنگالیوں کو اپنا مجرم سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کا حق چھینا ہے۔ سڑکوں پر بھک منگوں کا غول جب کسی راگیر کے سامنے دست سوال دراز کرتا تو دل ہی دل میں مغربی پاکستان کو گالیاں بک رہا ہوتا تھا ایک عام

نگالی کے لیے شیخ مجیب الرحمٰن اور اب صاف صاف کہنے لگا تھا' میرا مقصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔ عام بنگالی سمجھتا تھا کہ بنگلہ دیش کا قیام اس کی مفلوک الحالی کا واحد حل ہے اور جتنے غیر بنگالی ہیں' وہ اس کی آزادی کی راہ میں حائل ہوں گے لہٰذا انہیں راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ جس شعبے میں وہ ہیں وہاں ان سے انتقام لینا آزادی کی منزل کو قریب کرنا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے ٹرانسفر میں بھی بنگالی اساتذہ کا ہاتھ ہے اس لیے چپ چاپ اس فیصلے کو قبول کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ جب تعصب کی فضا دانشور طبقے تک کی رگوں میں سرایت کر جائے تو پھر بہتری کی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔

اس نفرت کا مشاہدہ اسے اس کالج میں بھی ہوا جہاں اس کا ٹرانسفر کیا گیا۔ اس کالج میں اس کا پہلا دن تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے کالج کی لائبریری دیکھنے پہنچ گیا۔ لائبریرین بنگالی تھا جو اسے ایک ایک شیلف دکھاتا پھر رہا تھا۔ ایک شیلف کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اس نے الماری سے "مرقع چغتائی" نکالا جس میں غالب کے اشعار کی ترجمانی چغتائی آرٹ کے ذریعے کی گئی تھی۔ یہ کتاب بے شک اعلیٰ طباعت کا نادر نمونہ تھی۔

"ملاحظہ ہو قومی دولت کن بے کار کاموں پر صرف ہو رہی ہے۔ مزہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان سے شائع ہونے والی یہ کتابیں ہمیں بھی بھیجی جاتی ہیں۔" لائبریرین نے بنگالی لہجے میں کہا۔

"اسے آپ قومی دولت کا ضیاع کیسے کہہ سکتے ہیں۔ غالب اردو زبان کا بہت بڑا شاعر تھا۔"

"ہو گا! مگر کیا ان لوگوں نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں بھی اس پائے کی کوئی کتاب شائع کی ہے۔"

یہ بات اس خطے کا ایک پڑھا لکھا شہری کہہ رہا تھا جس خطے میں خاص طور سے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی۔ لائبریرین اپنے تبصروں کے ساتھ اسے لائبریری کے مختلف حصے دکھاتا پھر رہا تھا۔

"یہ سارا شیلف تمہارا قائداعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔" ایک

جگہ رک کر اس نے کہا۔ اس کا سارا زور "تمہارے قائداعظم" پر تھا۔ جیسے یہ قائداعظم اس کے کچھ نہیں لگتے۔ اسے اچانک احساس ہوا جیسے وقت اسے چھوڑ کر آگے نکل گیا ہو اور وہ ریل کی پٹڑی کی طرح جاتی ہوئی ریل کو دیکھ رہا ہو۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع ذہنی خلیج حائل ہو چکی ہے جو کبھی نہیں پاٹی جا سکے گی۔ اسے تو وہ پچیّس ہزار فوجی بھی نہیں پاٹ سکتے جو قومی سالمیت کی ضمانت بنا کر یہاں بھیجے گئے تھے۔ اس کی طبیعت آج اتنی مکدر ہوئی کہ کالج سے نکلنے کے بعد نہ اسے سلطانہ کی یاد آئی نہ افروز کا خیال آیا۔ سڑکوں پر وہ یوں بے مصرف گھومتا رہا جیسے اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے اسے کسی مضبوط سہارے کی تلاش ہو، کوئی کار آمد جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔

یحییٰ خان نے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھالی تھی۔ سیاسی جماعتوں نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا تھا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے بائیں بازو کی طلبہ جماعت نے مشعل بردار جلوس نکالا تھا اور سرخ انقلاب کے نعرے لگائے تھے اور آج پلٹن میدان میں عوامی لیگ کا جلسہ تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ دوپہر کی دھوپ کم ہوتے ہی ہوا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔ وہ ابھی تک بے مصرف، سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جگہ جگہ اسے مشتعل افراد کے جلوس مل رہے تھے جو نعرے لگاتے ہوئے پلٹن میدان کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی اس سیلاب میں بہتا ہوا جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کہہ رہے تھے۔ "بنگالیوں نے 1956ء کے دستور میں برابری کے اصول کو تسلیم کر کے سخت غلطی کی تھی۔ اگر بنگلہ دیش پر یہ اصول دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی اور عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔"

یہ جلسہ انتظامی امور کے اعتبار سے نہایت کامیاب تھا۔ عوام کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر ابھی جذبات قابو میں تھے۔ جلسہ گاہ سے واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ لائبریرین اور شیخ مجیب الرحمٰن میں کیا فرق ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب نہیں ہوتے۔ وہ جواب کی حسرت لیے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کی معذور بہن اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ سردی میں شدت آگئی تھی مگر اس کی رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی تعصب سے نفرت کی آگ، قومیت کے الاؤ کی آگ۔ اس کی بہن نے

آج بھی اسے قسم دے کر کھانے پر مجبور کیا لیکن اس کی بھوک کو کسی آگ نے جلا دیا تھا۔

بستر کی گرمی نے اس کے حواس بحال کیے تو اسے افروز یاد آ گئی۔ اس نے کئی دن سے اسے دیکھا نہیں تھا۔ خموشی انگلیاں چٹخانے لگی۔ افروز اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ خاموش تھی جیسی شکایتوں کے انبار تلے دب گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جہاں بھر کے دکھ سمٹ آئے تھے۔ تم تو بہت ہنستی تھی آج اتنی چپ چپ کیوں ہو۔ مجید نے اس سے سرگوشی کی۔ دیکھتے نہیں باہر کتے بھونک رہے ہیں۔ کسی کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ سڑکوں پر خون بکھرا ہوا ہے۔ میں شہر کا ماتم کروں یا چہرے پر ہنسی کا تمغا سجالوں۔ مجید کو وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو آج اس نے دیکھا تھا۔ اسے مغربی پاکستان کے وہ فوجی یاد آنے لگے جو ڈسپلن قائم کرنے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے اور بنگالیوں کے طعنہ و طنز کا نشانہ بنتے تھے۔ پھر ایک اور تکلیف وہ خیال اس کے ذہن میں آیا۔ شہر کے دوسرے طبقوں کی طرح کیا بنگالی سپاہی بھی مغربی پاکستان سے اپنا رابطہ توڑ چکے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا ان پر بھروسا کیا جا سکتا ہے' کیا خانہ جنگی ہماری راہ نہیں تک رہی ہے۔ ڈھاکہ میں تو نہیں کئی اور علاقوں میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں۔ ان جھگڑوں کو فرو کرنے کے لیے بنگالی سپاہیوں نے اگر انکار نہیں کیا تھا تو وہ دلچسپی بھی ظاہر نہیں کی تھی جو اس قسم کے معاملات میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تذبذب کا شکار ہوں' جیسے وقت کا انتظار کر رہے ہوں' جیسے ابھی وقت نہ آیا ہو مگر وقت آنے والا ہو۔ اس نے سینے میں درد کی لہر سے اٹھی۔ افرور بھی تو غیر بنگالی ہے۔ کیا اب وہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ کیا اس کا لڑکپن' جوانی سے گلے ملے بغیر ہی رخصت ہو جائے گا۔ وہ مجھے پکارے گی ضرور لیکن کیا میں اس کی آواز سن سکوں گا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے اپنی پرانی عادت کے مطابق اپنے آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ کیا بحیثیت استاد مجھے یہ زیب دیتا ہے کہ میں اپنی شاگرد کے بارے میں سوچنے کے اس رویے کے بارے میں سوچوں۔ وہ مزاج کی عجیب سواری پر سوار تھا۔ فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ جذبہ محبت میں کشش

محسوس کرتا لیکن دوسرے ہی لمحے مصنوعی تقدس اس پر غالب آ جاتا۔ اس کا پروفیسر اس کے انسان پر غالب آ گیا تھا۔ وہ جب انسان بننے کی کوشش کرتا' اس کے اندر چھپا ہوا پروفیسر ہر جذبے کو قتل کرنے پر تل جاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ خود کو لکڑی کا آدمی سمجھنے لگتا تھا۔ بے حس' بے درد' بے وفا۔ دل اور دماغ کی چکی میں پستے ہوئے اتنے دن ہو گئے تھے کہ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔

دوسرے دن وہ کالج جانے کے لیے نیند سے بوجھل آنکھیں لیے گھر سے نکلا تو سورج اسی شان سے نکلا ہوا تھا۔ سڑکوں پر وہی چہل پہل تھی۔ مسجدوں کے مینار اسی طرح چمک رہے تھے۔ نہ کہیں کتے بھونک رہے تھے' نہ کہیں سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں' نہ سڑکوں پہ خون بہہ رہا تھا۔ اسے اپنی توہم پرستی پر غصہ آنے لگا۔ میری کم ہمتی نے کیسے کیسے اندیشے ایجاد کر لیے تھے۔ اس کا رکشا کالج کے گیٹ کے سامنے پہنچا تو اس کے سارے اندیشے دھل دھلا چکے تھے لیکن زمین پر پاؤں رکھتے ہی ایک مانوس خوشبو نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنی کیفیت میں سرشار' کالج میں داخل ہو گیا۔ ہر چیز یوں نکھری نکھری لگ رہی تھی جیسے درد دیوار کا منہ شبنم نے دھلا دیا ہو۔ اسے اپنی ذہنی حالت کی طرف سے فکر لاحق ہونے لگی۔ وہ خود سے ڈرتا ہوا اسٹاف روم تک پہنچ گیا۔

پیریڈ شروع ہوا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کلاس روم کی طرف چل دیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے آہستہ آہستہ' نہایت وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے چلتا تھا لیکن آج وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو اور اسے پناہ گاہ کی تلاش ہو۔

اس نے تشریح کے لیے شعر پڑھا۔

دیکھتے ہیں تمہیں کہ دیکھتے ہیں
حاصل عمر رائیگاں کی طرف

شعر پڑھنے کے بعد اس نے طائرانہ سی نگاہ کلاس روم پر ڈالی اور پھر وہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا۔ سامنے افروز بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی شرارتی مسکراہٹ تھی البتہ وہ بہت دبلی ہو گئی تھی۔

"آپ کھڑی ہو جائیے۔" مجید نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"سر میں؟" افروز نے بھی کامیاب ایکٹنگ کی۔

"جی آپ۔"

"افروز نے گھبرا کر لڑکیوں کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔"

آپ کو اس سے پہلے کلاس میں نہیں دیکھا۔"

"اس لیے کہ آج ہی میرا ٹرانسفر ہوا ہے۔"

"آپ نے ٹرانسفر کیوں کرایا جبکہ جس کالج سے آپ تشریف لائی ہیں وہ خاصا نامور کالج ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"پھر کیوں ٹرانسفر کرالیا؟"

"آپ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہو گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں میرے ایک پسندیدہ ٹیچر تھے جو وہاں سے چلے گئے' ان کے بعد میرا اس کالج میں دم گھٹنے لگا تھا' میں سانس لینے یہاں چلی آئی۔"

"وہ ٹیچر اس کالج سے کیوں چلے گئے؟"

"میری وجہ سے۔"

"آپ کی وجہ سے۔"

"ہاں۔ میری پسندیدگی کو کوئی اور معنی دینے لگے تھے اور ظاہر ہے اس اعتبار سے میں ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔"

کئی قہقے ایک ساتھ گونجے۔ مجید کو یوں لگا جیسے بھرے بازار میں افروز نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ اس پیریڈ کے بعد آپ مجھ سے لائبریری میں ملئے گا۔" مجید نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا سر' اب میں بہت محتاط ہو گئی ہوں۔ اس لیے بہت بہت معذرت۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اب تک جو کچھ میں پڑھا چکا ہوں'

آپ کو اس سے باخبر کر دوں۔"

"شکریہ۔ میں اپنی ساتھیوں سے پوچھ لوں گی۔" اس نے کہا اور اجازت لیے بغیر اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

مجید نے بڑی شدت سے اپنی بے عزتی کو محسوس کیا اور شاید افرور یہی چاہتی بھی تھی۔ اب مجید کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا اور کلاس روم سے باہر نکل آیا۔ وہ کلاس سے نکل کر سیدھا لائبریری میں پہنچا۔ اسے امید تھی کہ افرور وہاں ضرور آئے گی لیکن افروز وہاں نے وہاں آنا گوارا نہیں کیا۔ یا تو یہ عالم تھا کہ مجید اس سے ملنا ہی چاہتا تھا یا یہ عالم کہ اس کے نہ آنے سے پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اس قدر برہم کیوں ہے اور اگر برہم ہے تو اپنا ٹرانسفر کرا کے میرے تعاقب میں یہاں تک کیوں پہنچی ہے۔ شاید اسی رویے کے مظاہرے کے لیے یہاں آئی ہے جس کا اظہار اس نے آج کیا ہے۔ وہ بے رخی مجھے بدنام کر کے چھوڑے گی۔ میں اس کے ارادوں کو اسی وقت ناکام بنا سکتا ہوں جب اس کی بے رخی کی پروا ہی نہ کروں۔ ایسا بن جاؤں جیسے میں اس سے کبھی ملا ہی نہیں۔

دوسرے دن وہ کلاس روم میں پہنچا تو اپنے ارادے پر قائم تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ موجود بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو بیٹھی کہاں ہے۔ افروز بھی شاید اس کے خیالات سے آگاہ تھی۔ آج وہ اگلی صف میں اتنی نمایاں ہو کر بیٹھی تھی کہ دیکھنے کی زحمت سے پہلے ہی نظر آجائے۔"

بے رخی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مجید نے شعر پڑھا اور پھر اس کی تشریح میں پورا پیریڈ گزار دیا۔ اس شعر کو شاید غالب نے بھی اس شدت سے محسوس نہ کیا ہو جس شدت سے اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا۔ بے رخی کے عجیب عجیب پہلو اس کے سامنے آ رہے تھے اور وہ ہر پہلو کو اس طرح بیان کرتا چلا جا رہا تھا جیسے آج کے بعد وہ پڑھانا چھوڑ دے گا۔ لڑکیاں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ شعر کی تشریح اس طرح

ہی ہو سکتی ہے' خود افروز کا یہ حال تھا کہ وہ بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی مگر آج مجید
کا دن تھا۔ وہ تشریح کے پردے میں اس طرح اس سے مخاطب تھا کہ صاف چھپتے بھی
نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں وہ
سب کچھ سنا دیا جو وہ سب کے سامنے تو کیا سناتا' اکیلے میں کہنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔
اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ افروز کتنی ہی مرتبہ دوپٹے کے کونے
سے بھیگی ہوئی آنکھوں کے گیلے گوشے صاف کر چکی ہے۔

اب افروز سے اس کی ملاقات کالج تک محدود ہو گئی تھی اور وہ اس ملاقات سے
مطمئن بھی تھا لیکن پھر اچانک اس کا امتحان شروع ہو گیا۔ افروز کچھ دن تک تو اس کی
یک طرفہ تقریریں سنتی رہی۔ ان تقریروں میں وہ روایتی محبوب کی سنگ دلی اور بے
وفائی کا نقشہ بڑے مؤثر انداز میں اتارتا تھا۔ پھر افروز نے بھی سوالات کا سلسلہ شروع
کر دیا۔ یہ سوالات اس خوبی سے پوچھے جاتے کہ دوسری لڑکیاں یہی سمجھتیں کہ وہ اپنے
علم میں اضافے کے لیے پوچھ رہی ہے حالانکہ اس کا مقصد مجید کو لاجواب کرنا ہوتا تھا۔
ان اشاروں کو صرف مجید ہی سمجھ سکتا تھا۔ مثلاً" اس نے ایک دن یہ شعر پڑھا۔

تمہیں شکستہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزارہا پہلو

"سر! یہ شعر میں کئی دن سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر سمجھ ہی میں
نہیں آتا۔ آپ سمجھا دیں۔"

"اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے' خیال کرنے کی بات ہے ورنہ مہربانی کرنا چاہو تو
ہزار بہانے ہیں۔ مجبوری ہو تو در گزر کی جا سکتی ہے مگر تمہیں تو کرم کرنے کا خیال ہی
نہیں آتا۔" مجید نے وضاحت کی۔

"مگر سر' شاعر مخاطب کس سے ہے؟"

"محبوب سے اور کس سے۔"

"محبوبہ سے تو نہیں۔"

"اس میں مرد' عورت کی تخصیص نہیں جو جس کو چاہے وہ اس کا محبوب ہو سکتا
ہے۔

"تو پھر بے وفائی میں بھی تخصیص نہیں ہو گی۔"
"ہرگز نہیں۔ بے وفائی کوئی بھی کر سکتا ہے۔"
"آپ بھی ------ سوری سر' میرا مطلب ہے مرد بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔"
لڑکیوں نے قہقہ لگایا۔ مجید کا حلق خشک ہو گیا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا افروز اسے کیا بتانا چاہتی ہے۔ "اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں جنہیں لوگ بے وفائی کہہ دیتے ہیں۔" مجید نے بات گھمانے کی کوشش کی۔
"ان مجبوریوں پر غالب آنا ہی تو وفاداری ہے۔ کیا نہیں ہے؟"
"ہو سکتا ہے' آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"
"بس یہی پوچھنا تھا۔" افروز نے آخری ڈنگ مارا اور خاموشی سے اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔
رفتہ رفتہ افروز کی گستاخیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ مسلسل اسے شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مجید اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر سکتا تھا لیکن ایک دن بھی وہ ایسا نہیں کر سکا۔ جیسے اسے خوف ہو کہ اگر ڈانٹ دیا تو وہ بات کرنا چھوڑ دے گی۔ اسے ان شکایتوں سے تکلیف بھی پہنچتی تھی لیکن صرف کلاس کی حد تک اسے یہ احساس مار ڈالتا تھا کہ ایک استاد شرمندہ ہو رہا ہے لیکن کلاس سے نکلتے ہی شرمندگی کے اس احساس میں لذت بھری مسرت شامل ہو جاتی تھی۔ چاہے جانے کی وہی مسرت جو ہر انسان کے خمیر میں شامل ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس مسرت بھرے خزانے کو کوئی چرا کر لے جاتا تھا۔ وہ اپنے غلط اصولوں کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ احساس جرم اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ میں ایک استاد ہوں۔ مجھے افروز کی دل شکنی کرنی چاہیے۔
وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا اور اپنے آپ سے کون لڑ سکتا ہے۔ ایسی جنگ کون جیت سکا ہے جس میں اپنی لاش خود اٹھانی پڑے۔ اس کے اندر کوئی مرنے کی تیاری کر رہا تھا لیکن وہ جشن منا رہا تھا کہ پروفیسر مجید نے اپنے پیشے کی لاج رکھ لی ہے' اپنے اصول بچا لیے ہیں' ایک معمولی شاگرد کے سامنے اقرار محبت کے جرم سے بچ گیا ہے' وہ ان بہت سے اساتذہ سے بہت بلند ہے جو اس فرق کو قائم نہیں رکھ سکے لیکن یہ سفر تلوار پر چلنے سے کم نہیں تھا۔ وہ جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے غلط اصولوں کی

نازک شاخ پر آشیانہ بنایا تھا۔ کبھی شاخ لچک جاتی تھی' کبھی تنکے بکھر جاتے تھے۔ ہوائیں کسی کی خوشبو میں لدی پھندی آتی تھیں اس سے سانس اکھڑنے لگتا ہے ایک تماشہ تھی جو دل اور ذہن میں جاری تھی۔غلط سمت کو صحیح جان کر چلنے والے اسی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ جو اجالوں کی قدر نہیں کرتے' اندھیرے انہیں نگل جاتے ہیں۔ اندھیرے اسے آہستہ آہستہ نگل رہے تھے۔ وہ اجالوں کی تلاش میں دن بھر سڑکوں پر گھومتا رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی وبا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عوامی لیگ اس آگ کو ہوا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ انتظامیہ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ مارشل لا عام قانون سے بھی زیادہ غیر موثر ہو کر رہ گیا تھا۔ گویا باہر اس سے بھی زیادہ اندھیرا تھا جتنا وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ اس اندھیرے میں ایک ہی روشنی کی کرن تھی اور وہ تھی افروز۔ اس دن اندھیرا بہت پھیل گیا تھا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا۔ رات ہی خبر آئی تھی کہ تقریباً" دس ہزار مزدوروں نے کھلنا جیل پر ہلہ بول دیا۔ دروازے توڑ کے اپنے ساتھیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو قتل کر دیا جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مغربی پاکستان کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ مجید کالج کے لیے نکلا تو سناٹے اور خوف نے اس کا استقبال کیا۔ معلوم ہوا' امتحان کے بائیکاٹ کے لیے یونیورسٹی کے طلبہ نے جلوس نکالا ہے۔ تشدد کے خوف سے بازار بند پڑے ہیں' ٹریفک سڑکوں سے غائب ہو گیا ہے۔ اس نے کئی جگہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع دیکھے جو سڑک چھوڑ کر گلیوں میں پھیل گئے تھے۔ ہر شخص اس بائیکاٹ کا ذمے دار مغربی پاکستان کو ٹھہرا رہا تھا حالانکہ اس بائیکاٹ سے بھلا مغربی پاکستان کا کیا تعلق۔ دراصل مغربی پاکستان کی نفرت ان کے دلوں میں اس قدر بٹھا دی گئی تھی کہ اب اگر چڑیا بھی مرجاتی تو قصور مغربی پاکستان کا ہی ثابت کیا جاتا۔

کالج تک پہنچتے پہنچتے اس آگ کے شعلے اسے اپنے دامن سے لپٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ بنگلہ دیش اور آزادی کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ جلوس اب اسی کی طرف آ رہا تھا۔ نعروں کے ساتھ ساتھ فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ غالباً" وہ

لوگ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ اس نے راستہ بدل لیا۔ اب کالج جانا بے کار تھا۔ اس ہنگامہ آرائی میں کالج کی چھٹی ہو گئی ہو گی۔ دکانیں تک بند ہو گئی ہیں' تعلیمی ادارے تو سیاسی اکھاڑے ہیں۔ معلوم نہیں افروز آج کالج کے لیے گھر سے نکلی ہو گی یا نہیں۔ بائیکاٹ کا اعلان تو تھا' جلوس نکلے گا یہ بھی معلوم تھا لیکن اس طرح کرفیو کا سماں طاری ہو جائے گا یہ نہیں معلوم تھا۔ افروز کا خیال آتے ہی آج نہ جانے کیوں اسے اپنی بے حسی کا خیال آ گیا۔ آج ایک بنگالی کس طرح دوسرے بنگالی کی خبر گیری کر رہا ہے۔ ایک میں ہوں کہ افروز کو اس طرح نظر انداز کر رہا ہوں جیسے وہ مغربی پاکستان ہو اور میں مشرقی پاکستان۔ مجھے اس کی خبر لینی چاہیے۔ کیا خبر اسے میری مدد کی ضرورت ہو۔ اس کی خواہش نے انسانی ہمدردی کی پناہ گاہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ کیا میں بھی قومیت کی وبا کا شکار ہو گیا ہوں۔ اس نے خود کو ملامت کی لیکن آج طوفان اتنا تیز تھا کہ خود اس کی آواز اس کے کانوں میں نہ آ سکی۔ اس کے قدم افروز کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ سڑک کو چھوڑ کر گلیوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی اس نے چند گلیاں ہی عبور کی تھیں کہ اس نے کئی زوردار دھماکے سنے۔ پھر فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ ہوائی فائرنگ نہیں تھی۔ فائر ہوتا تھا' پھر اس کا جواب دیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب ہے تصادم ہو گیا مگر کس سے؟ مقابلے پر تو کوئی ہے ہی نہیں۔ فوج یا پولیس؟ اگر ان میں سے کسی سے تصادم ہوا ہے تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

"بھائی صاحب' آپ کہاں جا رہے ہیں۔" کسی نے اسے آواز دی۔

"مجھے اپنے ایک دوست سے ملنا ہے۔" اسے افروز کو دوست کہتے ہوئے بہت اچھا لگا۔

"آپ بہاری معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں اور وہ میرا دوست بھی بہاری ہے۔" اسے اپنے دوست کو بہاری کہنا اور اچھا لگا۔

"بھائی صاحب' واپس چلے جاؤ تو اچھا ہے۔ بڑے زور کا دنگا ہونے والا ہے۔"

"دنگا؟ مگر کیوں۔ یونیورسٹی کے طلبہ جلوس نکال رہے ہیں۔ ایسے جلوس تو روز

ہی نکلتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ بنگالی اور غیر بنگالی طلبہ کے درمیان تصادم ہو گیا ہے۔ دو لاشیں تو میں دیکھ کر آیا تھا۔"

"فوج نہیں ہے؟"

"کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے ورنہ اور نقصان ہو گا۔"

قومیت کا زہر اس حد تک سرایت کر گیا ہے کہ ایک ہی مقصد کے لیے لڑنے والے طلبہ بھی بنگالی' غیر بنگالی میں تقسیم ہو گئے۔ یہ تو ہم خانہ جنگی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس نے سوچا واپس چلا جائے مگر آج تو اس کے قدم کسی اور طرف چلنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ فوج نے گولی چلا دی ہے۔ منتشر ہوتا ہوا جلوس گلیوں میں پھیل گیا۔ غیر بنگالی آبادیاں سمٹے ہوئے پرندے کی طرح خاموش تھیں۔ بلوائی طلبہ نعرے لگاتے' گھروں کی کھڑکیوں کے شیشے توڑتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اس نے بھی بے تحاشا افروز کے گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

کہیں سے کوئی پتھر آیا اور اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا۔ پتھر اس کے سر پر لگا تھا۔ اس نے اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے اور وہ اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں شور گونج رہا تھا جیسے بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں۔ پھر کسی نے کہا' مارو اور پھر کئی گھونسے ایک ساتھ اس کی پیٹھ پر پڑے۔ وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں اوندھے منہ لیٹ گیا۔

"بہاری ہے' بہاری۔" کسی نے کہا۔

"مارو سالے کو۔" کئی لاتیں اس کی پسلیوں کو چیرتی ہوئی چلی گئیں۔ وہ دل ہی دل میں چیخ رہا تھا۔ اسے صرف اتنا ہوش تھا کہ اب وہ مرنے والا ہے۔

"فوج کا ٹرک آ رہا ہے۔" کہیں سے آواز آئی۔

یہ آواز نہیں تھی اس کی زندگی کا پروانہ تھا۔ آواز سنتے ہی جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب گلی میں موت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ابھی فوجی آئیں گے اور اسے بلوائی سمجھ کر ٹرک میں ڈال کر لے جائیں گے جو کسر رہ گئی ہے

اسے وہ پوری کر دیں گے لیکن جب بہت دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے ایک آنکھ کھول کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا بس ایک کتا اس کے قریب کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی کتے کا ساتھ دیا اور بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ گھر کی کھڑکی سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید اتنی ہمت نہیں تھی کہ نیچے اتر کر اس کی مدد کرتا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نیند آ رہی تھی کہیں وہ لوگ پھر نہ آ جائیں۔ خوف اس کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ مجھے گھر چلنا چاہیے۔ اس نے اٹھنے کے لیے ہمت جمع کی۔ اسے یوں لگا جیسے کئی پسلیاں ایک ساتھ ٹوٹ گئی ہوں۔ وہ دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پورے بدن میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ خون سے انگلیاں چپک گئی تھیں۔ اس نے کچھ دیر تک زمین پر پڑے پڑے گہری گہری سانسیں لی اور پھر یوں اٹھ گیا جیسے اب نہ اٹھا تو کبھی نہیں اٹھ سکے گا۔ ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہ لٹے ہوئے جواری کی طرح بیچ گلی میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر لوگوں کی بزدلی پر انہیں گالیاں دے لیکن وہ خاموش رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ وہ کہاں ہے۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے اپنی یادداشت بھول گیا تھا۔ اسے یاد تو آ رہا تھا کہ وہ یہاں آ چکا ہے مگر یہ جگہ کون سی ہے‘ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں اب بھی کوئی کھڑا تھا۔ اسے یاد آ گیا‘ یہ تو افروز کا گھر ہے۔ تو کیا کھڑکی میں افروز کھڑی تھی؟ اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ یہ کیسی کھڑکی ہے جہاں سے صرف تماشے دیکھے جاتے ہیں‘ کوئی مدد کو نہیں آتا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک لڑکی باہر نکلی۔

آسمان کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں افروز کھڑی تھی؟

”سر آپ۔ اف میرے خدا! تو یہ آپ تھے۔ میں سمجھتی تھی کوئی راہ گیر ہے۔“

”کسی راہ گیر کا یہ حق نہیں اس گلی کے لوگ اس کی مدد کو آئیں۔“

”اوہ! آپ کے تو بہت خون نکل رہا ہے۔“ افروز نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ”آیئے‘ گھر میں آیئے۔ میں ابو کو بتاتی ہوں۔“

”نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں اب گھر جاؤں گا۔“

"اس حالت میں آپ گھر کیسے جائیں گے۔"

اب کئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔

"آیئے نا۔" افروز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ اس میں تو اب مزاحمت کرنے کی قوت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ افروز کے ساتھ اندر چلا آیا۔ "آپ جا کہاں رہے تھے جو ان غنڈوں نے آپ کو گھیر لیا۔" افروز نے اسے صوفے پر لٹاتے ہوئے پوچھا۔ اب اس کی امی اور ابو بھی کمرے میں آ گئے تھے۔

مجید کا جی چاہا' کہہ دے کہ تم سے ملنے آیا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے تم سے باتیں نہیں کی تھیں۔ تم بہت یاد آتی ہو مگر وہ صرف یہ کہہ سکا۔ "میں ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا کہ ــــــــــ"

"اب اسے سوال جواب میں کیوں الجھا رہی ہے۔ اس کی حالت نہیں دیکھتی۔ جا' جا کے پانی گرم کر۔ سر کا زخم دھلے گا پھر دوا لگے گی۔"

"فرسٹ ایڈ کا بکس بھی لیتی آنا۔" افروز کے والد نے کہا۔

"آپ لوگ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر مل جائے گا' ڈریسنگ کرالوں گا۔"

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ کوالیفائڈ کمپاؤنڈر ہوں۔" افروز کے والد نے کہا۔ افروز پانی گرم کر کے لے آئی تو انہوں نے زخم دھویا اور ڈریسنگ کر دی۔

"شکر ہے زخم گہرا نہیں تھا ورنہ ٹانکے لگانے پڑتے' اس کے لیے واقعی کسی ڈاکٹر کی تلاش کرنا پڑتا۔ سب سامان تھوڑی ہے میرے پاس۔"

وہ ڈریسنگ کے بعد لیٹا ہوا تھا کہ محلے کے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ہر ایک کو اس کی خیریت کی فکر تھی۔ ہر ایک اپنی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔ "میں بس نکلنے ہی والا تھا کہ غنڈے بھاگ گئے۔ میں سمجھا یہ صاحب بھی چلے گئے ہوں گے۔ میں مطمئن ہو گیا۔"

"بالکل یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔" اپنی اپنی شرمندگی سب چھپا رہے تھے مگر ان میں سب سے بہادر افروز تھی جس نے پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور سب سے پہلے گھر سے باہر بھی وہی آئی تھی مگر وہ اس وقت خاموش تھی البتہ اس کا چہرہ بتا

رہا تھا کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک اندوہناک خبر اس تک پہنچی کہ شہر میں غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس خبر پر اس کے علاوہ سب نے سکھ کا سانس لیا۔

"مکانوں پر حملوں کے پروگرام بنائے جا رہے تھے۔"

"ہم کب تک کرفیو پر بھروسا کریں گے۔ ہمیں خود اپنے دفاع کا انتظام کرنا چاہیے۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔ جہاں کوئی بنگالی ملے چھرا گھونپو اور لٹا دو۔ تب انہیں احساس ہو گا کہ کوئی کیسے مرتا ہے۔"

وہ سب کی باتیں سن رہا تھا۔ بہت کچھ سوچ سکتا تھا لیکن اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ گھر کیسے جائے گا۔ نہ گیا تو سلطانہ پر کیا گزرے گی۔ اس کے پڑوس میں تو بنگالی فیملی آباد ہے، شہر میں جس تعصب کا بازار گرم کیا جا رہا ہے، کیا اس میں کوئی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ سلطانہ کا خیال رکھیں گے۔ شہر میں جس قسم کی وارداتیں ہو رہی ہیں انہیں دیکھتے ہوئے کیا وہ مجھے زندہ سمجھ رہی ہو گی۔ کچھ بھی ہو جائے، میں گھر ضرور جاؤں گا۔ میں فوجیوں سے کہوں گا، ایک معذور لڑکی میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ میرے ساتھ کھانا کھانے کی عادی ہے۔ میں نہ گیا تو بھوک اسے نگل جائے گی۔ ہو سکتا ہے تعصب کا کوئی عفریت اس کی تلاش میں ہو۔ وہ بلک رہی ہو گی، مجھے آوازیں دے رہی ہو گی۔ مجھے ہر حال میں جانا ہو گا۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اب اپنی کسی چوٹ کا احساس نہیں تھا۔

"میری بہن گھر پر اکیلی ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔" وہ اتنی زور سے چیخا جیسے وہ ان فوجیوں سے مخاطب ہو جو کرفیو توڑنے کے الزام میں اس کا سینہ چھلنی کر دینا چاہتے ہوں۔"

"بھائی صاحب، آپ ہوش میں تو ہیں؟ دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔"

"ہوا کرے مگر میں جاؤں گا ضرور۔"

"آپ پورے محلے کو پھنسوائیں گے۔ فوجی تو یہی کہیں گے، کرفیو توڑنے وا

اس محلے سے نکلا تھا۔"

"میری بہن وہاں اکیلی ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"وہ معذور ہے۔"

اس انکشاف کے ساتھ ہی کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ ہر آدمی اس کا منہ تک رہا تھا کہ اب اس بے بس آدمی کو کن لفظوں میں تسلی دی جائے۔

"پروفیسر صاحب۔" یہ افروز کہہ رہی تھی "آپ کے گھر میں ٹیلی فون ہے۔"

"جی ہاں' ہے تو۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ اسے ٹیلی فون کر دو۔ کم از کم اس کی ڈھارس تو بندھ جائے گی۔ پھر کچھ سوچیں گے' کیا کیا جائے۔" پہلی مرتبہ افروز کے والد نے گفتگو میں دخل دیا۔

مجید کا جی چاہا کہ اپنی عقل پر ماتم کرے۔ یہ کام تو اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کمرے میں اب بھی مسلسل خاموشی تھی۔ اس نے پھر نمبر ملایا "وہ ٹیلی فون اٹھا کیوں نہیں رہی ہے۔" اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔

"بیل جا رہی ہے؟" کسی نے پوچھا۔

اسے جواب دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اس کی انگلیاں پھر ڈائل پر گھومنے لگیں۔ جواب میں ہر مرتبہ نیا اندیشہ ملتا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"خدا خیر کرے۔" کمرا پھر آوازوں سے بھر گیا۔

"آس پڑوس کا کوئی نمبر ہے آپ کے پاس؟" افروز کے والد نے پوچھا۔

"ہاں' ہے تو۔"

"وہاں کر کے دیکھو۔ شاید کوئی جواب مل جائے ورنہ تم فکر مت کرو۔ علاقے کے تھانے میں فون کر کے صورت حال معلوم کر لی جائے گی۔ دو ایک واقف کار ہیں وہاں میرے۔" اتنی دیر میں مجید نمبر ملا چکا تھا اور جواب کے انتظار میں تھا۔ تیسری بیل کے بعد کسی نے فون اٹھایا۔

”ہیلو!“

”جی۔“

”عبدالرحمٰن صاحب؟“

”جی بول رہا ہوں۔“

”دیکھیے میں آپ کا پڑوسی پروفیسر مجید بول رہا ہوں“

”اچھا۔ مجید بابو مگر آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ خیریت تو ہے؟“

”آپ دیکھ رہے ہیں شہر میں کیا ہو رہا ہے؟“

”سن بھی رہا ہوں مگر آپ ہیں کہاں؟“

”میں اپنے ایک دوست کے گھر آیا تھا کہ کرفیو لگ گیا۔ گھر پر ٹیلی فون کیا تھا مگر وہ اٹھا ہی نہیں رہی ہے' آپ ذرا جلدی سے دیکھ کر بتائیں وہاں خیریت تو ہے“

”اچھا' تو اس لیے گھبراہٹ طاری ہے آپ پر۔ بھئی وہ فون کیسے اٹھائے گی جب وہ گھر ہی نہیں۔“

”کیا مطلب! کیا ہوا اسے؟ کہاں گئی وہ؟“

”دھیرج رکھو وہ کہیں نہیں گئی۔ یہاں ہے میرے پاس۔ ہمارے گھر میں۔ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں۔“

”آپ کے گھر میں؟ مگر کیوں؟ کیا ہوا میرے گھر کو؟“

”کچھ نہیں ہوا بابا۔ آپ آئے نہیں تھے۔ بچی اکیلے میں ڈر رہی تھی۔ پھر مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ پاگل فسادیوں کا کیا بھروسا۔ بعض محلوں سے خبریں آئی ہیں کہ غیر بنگالیوں کے مکانات پر حملے ہوئے ہیں۔ بس یہی سب سوچ کر ہم اسے یہاں لے آئے اور اس وقت وہ اپنی بھابی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔“

”اس نے کھانا کھا لیا؟“

”لو تم خود اسی سے پوچھ لو۔“ عبدالرحمٰن نے ٹیلی فون سلطانہ کو دے دیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی جیسے دونوں پہل کرنے سے جھجک رہے ہوں۔ سلطانہ نے خاموشی کو الفاظ دیے۔

”ہیلو' بھیا!“

"ہاں گڑیا۔ کیسی ہے تو؟"

"بہت مزے میں مگر تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے برسوں سے میں اکیلی ہوں۔"

"سن نہیں رہی ہے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہو گا بھیا۔ میں دن رات تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔"

"اچھا یہ بتا' کھانا کھا لیا؟"

"خدا کی قسم بہت بھوک لگ رہی تھی۔ پھر ان لوگوں نے ضد کی اور میں نے کھا لیا۔"

"کرفیو کا وقفہ ہوتے ہی میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ گھبرانا مت۔"

"نہیں بھیا۔ تمہاری بہن بہت بہادر ہے۔"

"تم یہ نمبر لکھ لو۔ کوئی بات ہو تو اس نمبر پر فون کر دینا۔" اس نے افروز کا ٹیلی فون نمبر اسے لکھوا دیا۔

"بھیا' یہ اسی ٹیوشن والی لڑکی کا نمبر ہے نا؟"

"ہاں وہی ہے۔ اب تو ٹیلی فون بند کر دے۔"

دوسری جانب سے سلطانہ کی ہنسی کی آواز آئی اور پھر ٹیلی فون بند ہو گیا۔ بہت دیر سے رکی ہوئی سانس اس کے سینے سے باہر آئی اور وہ مطمئن ہو گیا۔ ایک بوجھ تھا کہ اتر گیا' ایک کاج تھا کہ سنور گیا۔ محلے والوں کو ان باتوں سے کیا سروکار ہوتا ہے۔ ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد افروز کی ماں بھی اسی کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں' جہاں وہ بیٹھا تھا۔ افروز بہت دیر سے نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اسے ڈھونڈ ضرور رہی تھیں لیکن کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اسی اثنا میں کھانے کا وقت ہو گیا بلکہ یوں کہئے وقت تو بہت پہلے ہو چکا تھا فرصت اب ملی تھی۔ دسترخوان پر بھی افروز موجود نہیں تھی۔ کیا وہ میرا سامنا کرتے ہوئے کترا رہی ہے مگر کیوں؟ کیا اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی؟ ایسا نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو کرب تھا وہ کسی غیر کے لیے نہیں ہوتا۔ پھر وہ گئی کہاں؟ یہ عجیب بات تھی کہ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا مسلسل افروز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی کے بارے میں جس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ تو یہاں آنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر آ گیا اور اس طرح آیا کہ اب یہاں کم از کم ایک رات رکنا بھی پڑے گا۔ قدرت بھی اس کے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"افروز نظر نہیں آ رہی ہے۔" آخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں وہ ذرا پڑوس میں گئی ہے مجھ سے کہہ گئی تھی۔" اس کی ماں نے جواب دیا۔

مجید کو اپنی بے عزتی کا شدید احساس ہوا۔ میری موجودگی کے باوجود اسے سہیلی کی یاد کیسے آ گئی۔ اسے اس خبر سے نہ جانے کیوں دکھ پہنچا جیسے وہ چاہ رہا ہو کہ افروز اس کے پاس بیٹھی رہے' اسے اہمیت دیتی رہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ سامنے آتی تھی تو وہ سوچتا تھا یہ پاگل لڑکی چلی کیوں نہیں جاتی۔ چلی جاتی تھی تو سوچتا تھا' چلی کیوں گئی۔ یہ نفسیات کی گتھی تھی کہ جسے سلجھاتے سلجھاتے اس کے ناخن زخمی ہو گئے تھے۔ اس نے بے دلی سے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دیوار پر افروز کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ کسی بات پر بے اختیار ہنس رہی تھی۔ پاگل کہیں کی! اس نے دل میں سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سو کر اٹھا تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ برابر کے کمرے سے افروز کی آواز آ رہی تھی۔ گلی میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ "آپ جاگ گئے میں تو کئی مرتبہ آپ کو دیکھنے آئی۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ آج ابو گھر پر ہیں اس لیے میں احتیاط کر رہی ہوں۔" اس نے خالص لڑکیوں کے انداز میں کہا۔

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ تمہیں نہ خود پر بھروسا ہے نہ مجھ پر۔" اس نے وہی کلمات دہرا دیے جو کبھی افروز نے اس سے کہے تھے۔

محبت میں دل کمزور ہو جاتا ہو گا حافظہ قوی ہو جاتا ہے۔ ایک ایک بات یاد رہ جاتی ہے۔ افروز کو بھی یاد آ گیا کہ وہ اس کا قرض لوٹا رہا ہے جو کلمات کبھی اس نے کہے تھے وہی سننے کو مل رہے ہیں۔ "تو آپ طعنہ دے رہے ہیں۔"

"نہیں' یہ بتا رہا ہوں کہ احتیاط بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور میں جو ایک روز تمہاری امی کی غیر موجودگی میں یہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا تو میں نے درست کیا تھا غلط نہیں۔"

"مگر اس وقت ان باتوں کا کیا ذکر۔

"یہی کہ احتیاط بڑی اچھی چیز ہے۔ آج تمہارے ابو گھر پر ہیں۔ اس لیے اب "ذرا" یہاں سے چلی جاؤ۔"

اتنی دیر کی قربت کے بعد پھر اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ مجید نہیں' پروفیسر مجید ہے۔ "میں ذرا باہر نکل کر دیکھوں' گلی میں کیا ہو رہا ہے۔" مجید نے جب دیکھا کہ وہ جانے کو تیار نہیں تو خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آیئے چھت پر چلتے ہیں۔ وہاں سے دور تک نظر آتا ہے۔"

تجویز معقول تھی لیکن وہاں افروز بھی ساتھ جاتی اور یہ اسے منظور نہیں تھا۔ اس نے خاموش رہ کر اس کی تجویز کو رد کیا اور گلی میں نکل آیا۔ گلی میں بچوں کا راج تھا جو کرفیو سے بے نیاز کھیل کود رہے تھے۔ اس گلی میں شاید بنگالی کوئی نہیں تھا ورنہ فضا مختلف ہوتی۔ چند مکان چھوڑ کر پان سگریٹ کا ایک کھوکھا بھی کھلا ہوا تھا۔ مجید ٹہلتا ہوا کھوکھے تک چلا گیا۔ کھوکھے پر ایک بوڑھا بنگالی بیٹھا ہوا تھا۔ مجید کو اسے اس طرح دکان کھولے بیٹھا دیکھ کر تعجب ہوا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن بات آگے بڑھانے کے لیے اس نے ایک سگریٹ خرید لیا۔ "ماچس دینا۔"

"آپ کرفیو میں دکان کھولے ہوئے ہیں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔

"گلی میں کون دیکھنے آ رہا ہے۔" بوڑھے نے اسے مشتبہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔ "آپ اس محلے کے تو نہیں لگتے۔"

"نہیں۔ میں یہاں اپنے دوست سے ملنے آیا تھا کہ کرفیو لگ گیا۔ اب ظاہر ہے اس وقت جا سکوں گا جب وقفہ ہو گا۔"

"ہاں صاحب' یہ اچھی زبردستی ہے۔ انتظام سنبھلتا نہیں ہے پھر لوگوں کو قید کر دیتے ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"لوگ بھی تو اب دنگے فساد پر اتر آئے ہیں۔" مجید نے بات کو اور آگے بڑھایا۔

"کیوں نہ اتر آئیں۔ مغربی پاکستان نے ہمیں دیا کیا ہے۔ بھوک' افلاس' اور

اب یہ فوجی بھیج دیے ہمارے بھوکے بچوں کے سینوں میں گولیاں اتارنے کے لیے۔"
مجید نے محسوس کیا کہ یہ بوڑھا بھی دوسرے بنگالیوں سے مختلف نہیں
پروپیگنڈے کا زہر اس حد تک پھیلایا گیا ہے کہ یہ بوڑھا بھی یقیناً" یہی سمجھتا ہے
مغربی پاکستان میں شاید کوئی غریب رہتا ہی نہیں۔ "غربت تو پورے ملک ہی میں ہے۔"
"مگر اتنی نہیں جتنی یہاں ہے۔ ہماری پٹ سن' ہماری چائے' پان' لکڑی ہر
چلی جاتی ہے۔ مجیب صاحب ٹھیک کہتے ہیں' ہمیں ہمارا حق ملنا چاہئے۔ ہم نے
نہیں لیا ہے مغربی پاکستان کا۔"

"اگر یہ سچ بھی ہے تو قصور تو حکومتوں کا ہوا۔"

"اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں یہاں ہماری حکومت ہو۔ پھر دیکھنا یہ کھوکھا دکان
جائے گی۔"

"ہم کسی قانون کو ماننے پر تیار نہیں۔"

"مگر جو لوگ برسوں سے آپ کے ساتھ رہ رہے ہیں' ان کا کیا قصور ہے
انہیں کیوں مارا جا رہا ہے۔"

"جو بھی مغربی پاکستان کی حمایت کرے گا' ہمارا دشمن ہے۔ چاہیے وہ فوج
کیوں نہ ہو۔"

"اس طرح تو خانہ جنگی ہو جائے گی۔"

"وہ تو سمجھو ہوئی رکھی ہے۔" بوڑھے نے اتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی
کوئی بات ہی نہ ہو۔ مجید نے اس سے ایک سگریٹ اور خریدا کھڑے کھڑے اسے
اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو حسرت بھری نظر
سے دیکھا۔ ہوا ایسی چل رہی ہے کہ اگر موسم نہ بدلا تو یہ بچے مرجھائے ہوئے پھو
کی طرح بکھر جائیں گے۔ اس نے غیر ارادی طور پر گردن اوپر اٹھائی۔ کھڑکی کھلی
تھی۔ ایک سایہ اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ یقیناً" یہ افروز ہو گی۔ یہ خیال آتے
سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کیا سوچے گی' میں استاد ہو کر سگریٹ پی
ہوں۔ وہ اس طرح سمٹ سکڑ گیا جیسے کوئی تابع شاگرد اپنے استاد کے سامنے سگریٹ
ہوا پکڑا جائے۔

گھر آ کر اس نے سلطانہ سے ٹیلی فون پر بات کی۔ رات کا کھانا کھایا اور سونے کے لیے چھت پر چلا گیا۔ جہاں اس کا بستر کیا گیا تھا۔ اندھیرے آسمان پر روشن ستارے بڑا دلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔ آسمان کی چھت پر سنہرا قالین بکھرا ہوا تھا۔ پورا شہر خاموشی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ چھت پر تھا اس لیے کسی کسی گھر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں یا کبھی کبھی کوئی بچہ رونے لگتا تھا۔ اس خاموشی کو اگر کوئی چیز توڑ رہی تھی تو وہ وقفے وقفے سے سڑکوں پر گزرنے والے فوجی ٹرکوں کی آوازیں تھیں۔

کل اس شہر کا مقدر کیا ہو گا؟ اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑا سوالیہ نشان اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے سوچا' اب تک کے سیاسی مدو جزر میں حکومت محض تماشائی بنی ہوئی ہے۔ عوامی لیگ ابھرتی جا رہی ہے اور اس کے حریف ڈوبتے جا رہے ہیں۔ سرگرم سیاسی پارٹیوں میں عوامی لیگ'جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) ہیں۔ اس کے علاوہ کرشک سرامک پارٹی' پاکستان نیشنل لیگ' پاکستان ڈیمو کرٹیک پارٹی' جمعیت علمائے پاکستان اور مسلم لیگ کے تین گروپ بھی اکھاڑے میں اترے ہوئے ہیں لیکن اصل طاقت عوامی لیگ کی ہے۔ وہ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ سول یا فوجی انتظامیہ واقعات کے بہاؤ میں کوئی مداخلت نہیں کر رہی ہے۔ یحییٰ خان کا رویہ مجیب کی طرف سے بے حد نرم ہے۔ وہ ایک ڈکٹیٹر ہے لیکن ایک سیاسی لیڈر کے مطالبات پر مطالبات مانتا چلا جا رہا ہے۔ یہ رعایتیں ایک ایسے شخص کے لیے ہیں جسے ان کا پیشرو ایوب خان غدار سمجھتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یحییٰ خاں مارشل لا اٹھ جانے کے بعد بھی ملک کے صدر رہنا چاہتے ہیں اور مجیب کی تائید کے بغیر یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ بظاہر تو صرف یہ نظر آتا ہے کہ یحییٰ خان' پاکستان کے' آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں اور مجیب کو اس صوبے کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ جذبہ قابل تعریف ہے لیکن انہوں نے مجیب کے ذہن کو اچھی طرح بالادستی قائم کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو وہ آنے والے انتخابات میں پولنگ سے پہلے ہی الیکشن جیت لیا جائے گا۔ یہ طاقت ملتے ہی اگر اس نے آزادی کا مطالبہ کر دیا اور اس کی مزاحمت کی گئی تو کرفیو لگیں گے ضرور لیکن ٹوٹنے کے لئے۔ عوام کے

سیلاب کے سامنے کوئی نہیں ٹک سکے گا جو اس سیلاب کو روکے گا مارا جائے گا۔

وہ بہت دیر تک ان باتوں پر غور کرتا رہا جس پر اس جیسا ہر محب وطن غور کرنے پر مجبور تھا لیکن بعض سوالوں کے جواب صرف آنے والے وقت کے پاس ہوتے ہیں۔ وقت سے پہلے ان پر سوچا جائے تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس کا سر بھی دکھنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی وہ سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ خواب بہت دیکھتا تھا۔ وہ سمجھا اسے نیند آ گئی ہے اور اب وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ کسی نے کہا' سر مجید' اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ افروز اس کے پیروں کی طرف کھڑی ہوئی تھی۔ مجید نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کتنا ہی پکارے گی' آنکھیں نہیں کھولے گا۔ اب کوئی اسے جگا نہیں رہا تھا لیکن کسی کی موجودگی کا احساس اسے اب بھی ہو رہا تھا۔ وہ سانس روکے لیٹا ہوا تھا کہ گہری گہری سانسوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ یہ سانسیں' سسکیوں میں بدل گئی تھیں۔ مجید کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ پھر پانی کے دو قطرے اس کے دونوں پیروں پر گرے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ افروز رو کیوں رہی ہے۔ دو قطرے پھر گرے۔ اس نے گھبرا کر پاؤں سمیٹ لیے۔

آنکھیں بند کر لینے سے طوفان ٹل نہیں جاتا۔ مجید جانتا تھا کہ افروز نہایت ضدی ہے۔ اگر میں نہیں اٹھا تو وہ صبح تک اسی طرح کھڑی رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چھت پر ہی میری چارپائی سے لگ کر سو جائے اور پھر اسی طرح مجھے اٹھانا پڑے جس طرح وہ مجھے اٹھا رہی ہے۔ کسی نے اگر اسے یہاں دیکھ لیا تو کون یہ تسلیم کرے گا کہ میں سو رہا تھا۔ اس کے گھر والے کیا کہیں گے کہ میں نے ان کے احسانات کا کیسا گھناؤنا بدلہ دیا ہے۔ اگر میں عام سا آدمی ہوتا تو خیر کوئی بات نہیں تھی میں تو پروفیسر بھی ہوں۔ کیا سوچیں گے لوگ میرے بارے میں۔ اسے بغیر دیکھے محسوس ہونے لگا کہ اس کا پورا بدن پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ اب اس کے لیے آنکھیں بند کر کے پڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ "کون؟ افروز تم؟" مجید نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہا جیسے ابھی اس کی آنکھ کھلی ہے۔

"ہاں سر' میں ہوں۔"

"اندھیرے میں وہ افروز کے چہرے پر پھیلے ہوئے رنگ تو نہیں دیکھ سکا لیکن سرگوشی کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سخت ڈری ہوئی ہے۔ "ٹھہرو' میں روشنی کردوں۔" مجید نے کہا۔

"نہیں سر' یہ غضب نہ کیجئے گا۔" افروز نے نہ صرف گھبرا کر کہا بلکہ سختی سے مجید کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں سمجھی تھی' آپ جاگ رہے ہوں گے۔"

"اب پتا چل گیا کہ میں سو چکا تھا۔ اب جاؤ۔"

"مگر اب تو جاگ گئے ہیں۔"

"دوبارہ سونے کے لئے۔"

"سر' آپ مجھ سے اتنے بیزار کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ تم میں عقل کی کمی ہے۔ تمیں نہ اپنی عزت کا خیال رہتا ہے نہ میری۔ اب یہی دیکھ لو۔ یہ کوئی وقت ہے یہاں آنے کا۔ نیچے تمہاری تلاش ہوئی تو طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"یہ سب آپ کی غلطی سے ہے۔" اس کی آواز میں چٹان کی طرح سختی تھی۔

"میری غلطی سے۔"

"جی! اگر آپ مجھ سے شادی کر لیتے تو یہ خوف نہ مجھے ہوتا نہ آپ کو۔"

مجید کو یوں لگا جیسے وہ افروز کی زبان سے یہ الفاظ سننے کا بہت دن سے مشتاق تھا۔ آسمان پر چمکنے والے تمام ستارے اس کی روح میں اتر گئے۔ وہ خوشی کی چاندنی سے نہا گیا مگر دوسرے ہی لمحے اداس ہو گیا۔ اگر کوئی دوسری لڑکی اس سے یہ بات کہتی تو ٹھیک تھا مگر افروز تو میری شاگرد ہے۔ "تمہیں معلوم ہے تم یہ بات کس سے کہہ رہی ہو؟"

"سر مجید سے۔"

"سر بھی کہتی ہو اور شادی کی خواہش مند بھی ہو۔"

"کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

"استاد اپنی شاگرد سے محبت تو کر سکتا ہے شادی نہیں۔"

"یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟۔

"ضروری نہیں کہ ہر لفظ کسی نہ کسی کتاب میں لکھا ہو۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔'

"مگر یہ غلط ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں مگر دل مانتا۔"

"اگر آپ یہ نوکری چھوڑ دیں تو؟ پھر تو کر لیں گے آپ شادی؟"

"تم اسے نوکری کہتی ہو۔ پروفیسر شپ تو میرا عشق ہے' پہلا عشق۔"

"آپ میری خاطر اس عشق کو چھوڑ دیں۔"

"پاگل مت بنو۔ بچوں کی ضدیں بڑوں کا امتحان بن جاتی ہیں۔ بڑوں کو اس امتحان میں مت ڈالو۔"

"یہ کسی کا امتحان نہیں ہے۔ امی کو تو شاید بالکل ہی اعتراض نہ ہو۔ ابو کو میں منالوں گی۔"

"مگر مجھے سخت اعتراض ہے۔"

"آپ کو اعتراض ہوا کرے۔ میری شادی تو آپ سے ہو گی۔ اب کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"تمہارا آئیڈیل پروفیسر ہے نا' مگر یہ پروفیسر تمہارا استاد ہے۔ کسی اور پروفیسر سے شادی کر لو۔"

"کس نے کہہ دیا پروفیسر میرا آئیڈیل ہے۔ زہر لگتے ہیں پروفیسر مجھے۔ موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے۔ دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن۔ میرے آئیڈیل تو آپ ہیں۔ وعدہ کریں کہ آپ یہ نوکری چھوڑ دیں گے۔ ایسی پروفیسری کس کام کی کہ آپ سے میری شادی بھی نہ ہو سکے۔ وعدہ کریں' آپ اس نوکری کو چھوڑدیں گے۔ میری خاطر۔"

"اچھا میں سوچوں گا مگر تم اس وقت چلی جاؤ۔"

"مجھے معلوم ہے آپ نہیں سوچیں گے لیکن کبھی یہ ضرور سوچیں گے کہ آپ کا اصول غلط تھا۔" افروز نے کہا اور یوں اٹھ کر چلی گئی جیسے دیکھتے ہی دیکھتے اچھے دن

گزر جاتے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک اس کے اندر جنگ چھڑی رہی۔ افروز ٹھیک کہتی ہے۔ میں اگر نوکری چھوڑ دوں تو میری بات بھی رہ جائے گی اور افروز کی خوشی بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے بچپن سے شوق تھا کہ میں پروفیسر بنوں گا' میری آرزو پوری ہو گئی۔ اب میں کس طرح واپس ہو سکتا ہوں۔

صبح کی سپیدی نمودار ہو گئی لیکن وہ جاگتا رہا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ چھت سے نیچے اتر آیا۔ اسے صبح کے وقفے کے دوران اپنے گھر پہنچنا تھا۔ اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور صبح کے آٹھ بجتے ہی اس نے افروز کے گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ سڑکوں پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ دکانیں کھل گئی تھیں لیکن ٹرانسپورٹ غائب تھی۔ البتہ غریب رکشا والے سواریوں کی تلاش میں تھے۔ اس نے ایک رکشا کو روکا اور گھر جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

دو دن کے کرفیو کے بعد زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ وہ وقت مقررہ پر کالج جاتا تھا۔ افروز کے تقاضے بڑھتے گئے اور اس کے ذہنی انتشار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ باہر کا منظر یہ تھا کہ تعصب کی چنگاریاں اس کے دامن تک پہنچ گئی تھیں۔ اس کالج کا تمام اسٹاف دو ایک کو چھوڑ کر تمام کا تمام بنگالیوں پر مشتمل تھا جو اس کے منہ پر غیر بنگالیوں کو مغلظات بکتے اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ انہی دنوں سرکاری ملازمین نے ہڑتال کر دی' ان ملازمین میں کالج کے اساتذہ بھی شامل تھے۔ ہڑتال پر تھے۔ تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ مجیب نے اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ہڑتالیوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس کی حمایت نے دوسرے کئی طبقوں کو بھی شیر بنا دیا۔ سنار' صحافی' خاندانی منصوبہ بندی کے عملے' چمڑے کے کارخانوں اور چائے کے باغات میں کام کرنے والوں نے بھی ہڑتالیں شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ گداگروں نے بھی اپنی انجمن بنا کر پلٹن میدان میں ایک جلسہ کر ڈالا۔ ان ہڑتالوں نے زندگی کو معذور بنا کر رکھ دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انتظامیہ کی مشینری کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ ہر طبقے کو حکومت سے شکایت ہے۔ ان ہڑتالوں سے یہی باور کرانا مقصود تھا۔ مجیب الرحمٰن کے ہمدردانہ بیانات یہی تاثر قائم کر رہے تھے کہ عوام کی ہمدرد حکومت نہیں مجیب الرحمٰن ہیں۔ اس کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

کالج بند تھے لہٰذا مجید گھر میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اس فرصت میں افروز کا خیال اس کی مصروفیت کا واحد بہانہ تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے خیالوں سے باتیں کرتا اور سنجیدگی سے اس کے مشورے پر عمل کر کے نوکری چھوڑنے کا ارادہ کرنے لگا۔ وہ وقت گزاری کے لیے شام کے وقت ایک سرکاری لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس روز بھی وہ اور بہت سے لوگوں کے ساتھ مطالعے میں مصروف تھا کہ تین نوجوان لڑکے عمارت میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بنگالی زبان میں وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کیا۔ یہ لائبریری خالی کردو ہم یہاں بم پھینکنے آئے ہیں۔ "انہوں نے اتنے آرام سے یہ بات کہی جیسے بم نہیں اخبار پھینکنے آئے ہوں۔

حالات کے خوف سے لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ کسی کو ان لڑکوں سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھااور اٹھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ "جلدی کرو۔" ان لڑکوں نے پھر کہا اور اس کے ساتھ لائبریری خالی ہوگئی۔ مجید بھی ان لوگوں کے ساتھ اٹھ کر عمارت کی بالائی منزل سے نیچے اتر آیا۔ "ان لڑکوں نے دو بم پھینکے اور اطمینان سے جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ دو دھماکے یکے بعد دیگرے ہوئے اور پھر پوری عمارت آگ کے شعلوں میں گھر گئی۔ مجید' چند اور تماشائیوں کے ساتھ گلی میں کھڑا' فرنیچر اور کتابوں کو جلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس عمارت کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ یہاں اردو کی کتابیں موجود ہیں۔

شرپسندوں کو روکنا کس کے بس میں تھا مگر یہ تو بس میں تھا کہ پریشان ہو لیا جاتا' قومی یک جہتی کے مستقبل پر غور کیا جاتا مگر غور کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں سب کچھ تھا ایک یہی چیز نہیں تھی۔ جب ذرا سکون ہونے لگتا' نیا دھماکا نیا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ ان دھماکوں کی خبریں کھلنا' چٹاگانگ' رنگ پور اور دوسرے مقامات سے بھی آ رہی تھیں مگر مجید تو ڈھاکہ میں تھا۔ اسے تو یہاں [illegible] روکار تھا۔ اس کا سکون تو اس شہر سے وابستہ تھا۔ اس کا مستقبل تو اسی شہر کی ایک گلی میں رہتا تھا۔ اب تو کالج بھی بند ہو گئے تھے جہاں افروز اسے دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن وہ اس کی خیر خیریت دریافت کرنے اس کے گھر چلا جاتا لیکن کب تک جاتا رہتا رفتہ

رفتہ اس میں بھی کمی آنے لگی۔ یہ دھماکے جس مقصد کے لیے کیے جا رہے تھے آخر وہ مقصد حاصل ہو کر رہا۔ مارشل لا حکومت نے ملک میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ اس خبر کو ہر حلقے میں خوش دلی کے ساتھ سنا گیا۔ اب یہ امید بندھ گئی تھی کہ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی سیاسی حل نکل آئے گا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نہ اس رات مشعل بردار جلوس نکالا۔ یہ بات خاص اہمیت رکھتی تھی کہ ہر اس دھما چوکڑی میں تشدد کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔ بعض دلوں میں ایک اندیشہ ضرور تھا کہ اگر یہ انتخابات کسی خاص منصوبے کے تحت کرائے گئے اور مجیب کی عوامی لیگ کو شکست ہو گئی تو مجیب کے حامی اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کریں گے۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہنگامے پھوٹیں گے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

باہر سکون ہو گیا تھا جیسے موسلا دھار بارش کے بعد کچھ دیر کو مطلع صاف ہو جائے لیکن مجید کے دل میں طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ اسے وہ رات رہ رہ کر یاد آتی تھی جو اس نے افروز کی چھت پر گزاری تھی۔ ایسی ہزار راتیں نصیب ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اندر کے پروفیسر کو قتل کر دیتا۔ یہ خون ریزی اسے منظور نہیں تھی۔ اسے رہ رہ کر افروز کے وہ کلمات یاد آتے تھے جن میں اس نے کہا تھا' پروفیسر مجھے زہر لگتے ہیں۔ آپ یہ نوکری چھوڑ دیں۔ پھر تو مجھ سے شادی کر سکیں گے۔ نوکری چھوڑنا اس کے بس میں تو تھا لیکن اس کے بعد کیا کرے گا' یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے باز رہنا چاہتا تھا لیکن اب اسے امید تھی کہ حالات پرسکون ہو جائیں گے۔ مجیب کی فتح یقینی تھی بس پولنگ کے ذریعے اس کی رسمی توثیق ہونا باقی تھی۔ اس نے سوچا جیتنے کے بعد ان کے کارکنوں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگر خطرہ ہو گا بھی تو ان بڑے لوگوں کو جو مجیب کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ اگر سازش کیس کے ذمے داروں کو خطرہ ہو یا چند فوجی افسروں کو۔ اس کو یا اس جیسے عام آدمی کو کیا خطرہ۔ یہ سوچ کر اس نے ملازمت سے استعفی دے دیا۔

اس روز وہ اداس تو بہت تھا لیکن احساس رہائی سے شاداں بھی بہت تھا۔ وہ اس طرح افروز کے گھر کی طرف جا رہا تھا جیسے کوئی نئی ملازمت کی خوش خبری کسی کو سنانے جاتا ہے اور واقعی اس کے لیے یہ ماجرا کسی بڑی خوشی سے کم نہیں تھا۔ آج پہلا دن تھا

کہ افروز کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ جرم کا احساس اس سے کوسوں دور تھا۔ وہ آج افروز کو اس بے باکی سے دیکھ رہا تھا کہ جو کبھی نہیں شرماتی تھی آج شرمائے جا رہی تھی۔ پھولوں سے لدی شاخ کی طرح اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ دیکھنے کا مفہوم آج اس پر ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے آج معلوم ہوا تھا کہ نظر کی گرمی کسے کہتے ہیں۔ آنکھیں باتیں کرتی ہیں تو دل کی دنیا پر کیا گزرتی ہے۔ گھبراہٹ کسے کہتے ہیں' پسینہ کیسے آتا ہے۔ کئی باتیں ایک ساتھ اسے معلوم ہو گئیں قینچی کی طرح چلنے والی زبان آج خاموش تھی۔

"تم میرے ساتھ کہیں باہر چل سکتی ہو۔" مجید نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔

افروز حیران تھی کہ سورج مشرق ہی سے نکلا تھا مگر یہ ماجرا کیا ہے۔ جسے گھر میں بھی بات کرتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی آج باہر چلنے کی ضد کر رہا ہے۔

"بولو' چل سکتی ہو باہر۔" مجید نے پھر کہا۔

"سر' بات کیا ہے۔ گھر میں تو آیئے۔" افروز نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"خبردار' آئندہ مجھے سر نہ کہنا۔ زہر لگتا ہے مجھے یہ لفظ۔ میں نے اس قید سے رہائی حاصل کر لی ہے۔ ہر بندھن سے آزاد ہو کر پہنچا ہوں یہاں تک۔ اب تم مجھے صرف مجید کہو گی۔ میں نے پروفیسر مجید کو دفن کر دیا ہے۔ بہت گہرا دفنایا ہے۔ اب میں کسی جھوٹے اصول کے جال میں گرفتار نہیں ہوں۔ بہت دن بعد میں نے کھلی فضا میں سانس لی ہے۔ بولو' میرے ساتھ سانس لو گی؟"

افروز کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اب اسے مجید سے خوف آ رہا تھا۔ "ٹھہریے! میں امی کو بلاتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" افروز نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔

"ٹھہرو!" مجید نے اس کی کلائی پکڑلی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"میں تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گا۔ آؤ کہیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"آپ سڑک پر میرا انتظار کریں' میں کوئی بہانہ کر کے آتی ہوں۔"

مجید دروازے ہی سے واپس ہو گیا اور سڑک پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد افروز اپنے گھر سے نکلی اور سڑک پر پہنچ گئی۔ جس بات کی جھوٹی شہرت کالج میں ہو گئی تھی' آج وہ بات حقیقت بن گئی تھی۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے فیملی روم میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ "جانتی ہو میں تمہیں یہاں لے کر کیوں آیا ہوں؟"

"نہیں تو۔"

"یہ بتانے کے لیے کہ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔"

"سچ!" افروز کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"ہاں افروز! میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا تھا کہ میں اپنی شاگرد کی محبت میں اسیر ہوں۔ محبت کی قید سے رہائی ممکن نہیں تھی' نوکری سے آزاد ہو گیا۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں پروفیسر شپ زہر لگتی ہے۔ میں نے اپنے دانتوں سے یہ زہر نوچ کر پھینک دیا ہے۔"

"اف' آپ کتنے اچھے ہیں۔ نوکری تو آپ کا عشق تھی۔ آپ نے اپنا عشق مجھ پر قربان کردیا۔ جلدی کیجئے اور میری جان مانگ لیجئے۔ میں جان دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں نے تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے یہ قربانی دی ہے۔ تمہاری جان مانگنے کے لیے نہیں۔"

"جان میرے اختیار میں ہے' ہاتھ نہیں۔"

"مگر تم تو اس طرح کہتی تھی جیسے سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔"

"اس وقت آپ پروفیسر تھے۔ میں جس وقت کہتی میرے والدین خوشی خوشی میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیتے لیکن اب کی بات اور ہے۔"

"اب کیا کمی آگئی ہے مجھ میں؟"

"اب آپ بے روزگار ہیں۔ آپ کہیں ملازمت کر لیں یا بزنس شروع کر دیں۔ میں کچھ تو بتاؤں گی کسی کو۔"

"وہ تو میں کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔"

"تو پھر میرا وعدہ ہے میں آپ کا انتظار کروں گا۔ جان دے دوں گی مگر کہیں اور شادی نہیں کروں گی مگر میرے سامنے پروفیسر مجید بن کر نہیں' مجید بن کر آیئے گا۔ ورنہ آپ پھر کہہ دیں گے کہ میں اپنی شاگرد سے محبت کر سکتا ہوں شادی نہیں کر سکتا۔"

مجید کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ افروز کا جواب معقول تھا۔ ایک بے روزگار کو اپنی بیٹی کون دے سکتا ہے۔ "جب تک میں اس قابل نہیں ہو جاتا کہ تم میرا حوالہ کسی کو دے سکو میں تم سے نہیں ملوں گا۔"

"آپ ہر بات میں جذباتی ہو جاتے ہیں میں نے یہ قید تو نہیں لگائی۔"

"مگر میں یہ قید اپنے اوپر عائد کرتا ہوں۔ اگر بالکل ہی مجبور نہیں ہو گیا تو میں تم سے نہیں ملوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ قسم اس لیے نہیں کھاتا کہ بعض اوقات انسان کو اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔"

"آپ نہیں آئیں گے تو میں آ جاؤں گی۔ مجھ پر تو پابندی نہیں ہے۔ آپ کا ایڈریس تو میرے پاس ہے ہی۔"

"تم بھی نہ آؤ تو اچھا ہے۔ میں کوئی اچھا مہمان نواز نہیں ہوں اور شاید میں اب یہاں رہوں بھی نہیں۔ سلمٹ میں میرا ایک دوست ہے' اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار کروں گا۔ کیا کروں گا' ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔"

"ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔ اگر میں یہاں ہوا تو تمہیں ٹیلی فون ضرور کر لیا کروں گا۔"

وہ دونوں اس طرح ہوٹل سے نکلے جیسے ایک دوسرے سے ناواقف ہوں۔ بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

ابھی وہ پوری طرح خوش بھی نہیں ہوا تھا کہ فضا میں ایک مرتبہ پھر بارود کی بو پھیلنے لگی۔ پورا شہر اس طرح ایک جگہ رک کر کھڑا ہو گیا جیسے دوڑ میں شریک ہونے آیا تھا' فتح بھی یقینی تھی لیکن اب یقین نہ ہو کہ دوڑ ہو گی بھی یا نہیں۔ ہر طرف یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ بری فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل حمید نے جنرل یحییٰ سے اقتدار چھین لیا ہے۔ اقتدار کی چھین جھپٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ افواہیں تو یہ تھیں

ا۔ وہ کسی وقت بھی انتخابات منسوخ کر دیں گے۔ ماحول میں تناؤ کی کیفیت صاف دیکھی
جا سکتی تھی۔ دونوں جنرل اس وقت ڈھاکہ میں موجود تھے۔ یہ خبریں ان کے کانوں میں
بھی پہنچ رہی ہوں گی لیکن اس طرف سے کوئی وضاحت نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک
کہ الیکشن سے چار روز قبل جب جنرل یحییٰ خان' مغربی پاکستان روانہ ہونے کے لیے
ڈھاکہ ائرپورٹ پہنچے تو ایک غیر ملکی صحافی نے ان سے پوچھا "مسٹر پریذیڈنٹ' کیا اب بھی
ملک کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے؟"

"کون ہے جو میرے اختیارات میں شریک ہو سکتا ہے۔ جب تک میں نہ
چاہوں' کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" یحییٰ خاں نے اپنی بھاری پلکیں تیز تیز جھپکتے ہوئے
کہا۔ ان کے اس بیان سے اس افواہ نے دم توڑ دیا لیکن مجیب الرحمٰن نے ایک مرتبہ
پھر اپنے اس عزم کو دہرایا کہ ان انتخابات کو میری پارٹی چھ نکات پر ریفرنڈم سمجھتی ہے۔

مجید' اور بہت سے لوگوں کی طرح یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ اعلان نہایت
خطرناک ہے۔ اگر آئندہ انتخابات کو چھ نکات پر ریفرنڈم تسلیم کر لیا گیا اور مغربی پاکستان
نے اس کی حمایت نہ کی تو دونوں صوبوں کا الگ ہو جانا لازمی ہے۔ یہ سب تو الیکشن
کے بعد کی باتیں تھیں۔ الیکشن سے پہلے ہر پارٹی اسی طرح کی باتیں کرتی ہے۔ اس
وقت تو مجید کو الیکشن کی فکر تھی کہ بخیر و خوبی یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ حالات ٹھیک
ہوں تو وہ اپنے کاروبار کی فکر کرے۔

7 دسمبر کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ متعلقہ افسروں نے
آپریشن روم میں اپنے فرائض سنبھالے اور جنگی ہیلی کاپٹر ہوا میں تیرنے لگے۔ یہ ہیلی
کاپٹر پولنگ اسٹیشنوں کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ لوگوں کے ہجوم پولنگ اسٹیشنوں کی
طرف رواں دواں تھے۔ مگر پر امن اور منظم! دوپہر تک تناؤ کی ہر کیفیت ختم ہو چکی
تھی۔ یقین ہو چلا تھا کہ اب باقی دن بھی خیریت سے گزر جائے گا۔

مجید جو صبح سے گھر میں [illegible] سلطانہ کی منت سماجت کرنے کے بعد گھر سے نکلا
اور چل پھر کر پولنگ اسٹیشنوں کا جائزہ لے۔ کئی اسٹیشنوں پر اس کے پروفیسر دوست
پریذائیڈنگ افسر کے فرائض انجام دے رہے تھے جن سے ملنے کے بہانے وہ پولنگ
اسٹیشنوں کے اندر جا سکتا تھا۔ سڑکوں پر حالات پرسکون تھے لیکن پولنگ اسٹیشنوں پہ

حالت مختلف تھی۔ عوامی لیگ کے کارکنوں نے اکثر مقامات پر انتظامات سنبھال رکھے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے ووٹ ڈلوا رہے تھے۔ فوجی افسر یہاں بے بس تھے کیونکہ انہیں صرف یہ حکم تھا کہ جب امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو صرف اس وقت دخل دیں۔ ووٹ کون کس کو ڈال رہا ہے یہ ان کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ اس کے لیے پریذائیڈنگ افسر سے شکایت کی جائے۔ وہ ایک پولنگ اسٹیشن پر بیٹھا تھا کہ ایک بارہ سالہ لڑکا اندر آیا۔ عوامی لیگ' زندہ باد' اس نے نعرہ لگایا اور ووٹ ڈالنے پر بضد ہو گیا۔ عوامی لیگ کا مخالف ایجنٹ اسے پکڑ کر کیپٹن کے پاس لے گیا۔ "اول تو یہ لڑکا نو عمر ہے۔ ووٹ دینے کا اہل نہیں۔ دوم یہ کہ اسٹیشن کے اندر نعرے لگا کر قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے۔"

"میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں' میں اس کا مجاز نہیں۔ آپ اس کی شکایت پریذائیڈنگ افسر سے کریں۔"

اس سے زیادہ اور کیا دیکھ سکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ عوامی لیگ جیت گئی۔ نتیجہ سننا ہے تو گھر چل کر سنا جائے۔ الیکشن نہایت پر امن ماحول میں ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 162 میں سے 160 سیٹیں عوامی لیگ کی جھولی میں آ گریں۔ مگر مغربی پاکستان میں اسے کوئی بھی سیٹ نہ مل سکی۔ یہاں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹی تھی۔ طاقت کا یہ عدم توازن خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اپنی فتح کے بعد لاہور میں کہا۔ "میری جماعت کے بغیر نہ تو کوئی دستور بنایا جا سکتا ہے' نہ مرکز میں کوئی حکومت چلائی جا سکتی ہے۔" ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے جنرل سیکریٹری تاج الدین نے اس بیان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "عوامی لیگ' ملک کا دستور بنانے اور مرکز میں حکومت چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم کسی پارٹی کے تعاون کے بغیر بھی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔"

مجید ان سیاسی بیان بازیوں سے پریشان ضرور تھا لیکن اسے امید تھی کہ سیاست دان کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ دوسرے یہ کہ اب یہ جنگ اخباروں میں لڑی جا رہی تھی گلیوں میں نہیں۔ اس نے سوچا جب تک اس کا شور گلیوں میں سنائی دے' اسے اپنے دوست کے پاس سلمٹ جا کر کاروبار کی فکر کرنی چاہیے۔ کام نہیں بنا تو وہ

پھر ڈھاکہ لوٹ آئے گا۔ اسے شک اس لیے تھا کہ اس کا یہ دوست بنگالی تھا اور بنگالیوں سے آج کل کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ ڈھاکہ کو سیاست کی آگ میں جلتا ہوا چھوڑ کر سلمٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ ابھی صرف حالات کا جائزہ لینے جا رہا تھا اس لیے سلطانہ کو لے کر نہیں گیا۔ اسے دو دن بعد واپس آ جانا تھا۔ سلمٹ کے حالات بھی ڈھاکہ سے مختلف نہیں تھے۔ اس کا دوست چائے کا کاروبار کرتا تھا۔ باغات سے جو چائے کی پتیاں آتی تھیں' اس کے کارخانے میں وہ پتیاں سکھا کر اور انہیں مختلف مراحل سے گزار کر باہر بھیجا جاتا تھا۔ مجید کا خیال یہ تھا کہ وہ اس کام کو سیکھے گا۔ کچھ تجربہ حاصل کرے گا اور پھر ڈھاکہ کا مکان فروخت کر کے سلمٹ منتقل ہو جائے گا۔

اس کا دوست' خلاف توقع اس سے اچھی طرح ملا لیکن وہ حالات سے مایوس تھا۔ ''میرے دوست' تم نے مجھے غلط وقت آواز دی ہے۔ آئے دن کی ہڑتالوں نے کاروبار کا بیڑا کر دیا ہے۔ آرڈر آئے پڑے ہیں' مزدور آئے دن ہڑتال پر چلے جاتے ہیں' سپلائی رکی ہوئی ہے۔''

''مگر میں بے روزگار ہوں یار۔ مجھے کوئی لمبی چوڑی رقم نہیں چاہیے ہے۔ بس میں تو یہ چاہتا ہوں' دو وقت کی روٹی مل جائے اور کچھ تجربہ حاصل ہو جائے۔ میرا کنبہ ہی کتنا ہے۔ میں اور میری بہن۔''

''ٹھیک ہے۔ جو کچھ بھی ہے حاضر ہے۔ میں والد صاحب سے بات کروں گا۔''

مجید اس کے والد سے بھی ملا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ اکھڑے اکھڑے ہیں۔ پریشانی میں آدمی ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اس نے سوچا اور مطمئن ہو گیا۔ وہ سونے کے لیے لیٹ چکا تھا کہ برابر کے کمرے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جو چوکنا ہو گیا۔ ''صبح تک اس لڑکے کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' اس کے دوست کے والد کہہ رہے تھے۔

''مگر وہ یہاں امید سے آیا ہے' پریشان ہے۔''

''ہماری کسی کا دوست نہیں۔ اسے ہم اپنے صوبے سے نکال دینا چاہتے ہیں' تم اسے گھر میں لے آئے۔''

''تو کون سی قیامت آ گئی۔''

"نہیں آئی تو اب آجائے گی۔ کیا خبر کل کیا حالات ہوں۔ ہم اسے پناہ دینے کے الزام میں پھنس سکتے ہیں۔"

"کل کی کل دیکھیں گے۔ آج حالات اتنے خراب نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں تو میں کردوں گا۔ کل ہی عوامی لیگ کے غنڈے بلواتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں' کیسے رہتا ہے وہ یہاں۔"

"میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں' اب اس سے کیسے کہوں۔"

"تم نہیں کہہ سکتے تو میں کہہ دوں گا اور اس طرح سمجھا کر کہہ دوں گا کہ تمہاری دوستی بھی متاثر نہ ہو۔ شاباش' اب سو جاؤ۔"

"مجید نے محسوس کیا کہ اس کے دوست کے والد غیر معمولی طور پر بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ جیسے وہ چاہتے ہوں کہ مہمان اگر جاگ رہا ہو تو سن لے۔ اب اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ اپنے دوست کو امتحان میں ڈالتا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی دور تک پھیلے ہوئے چائے کے باغات میں ابھی سورج کی کرنوں نے قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ بغیر کسی کو بتائے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہ دوسرے ہی دن گھر پہنچ گیا تو سلطانہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ حقائق سے بے خبر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا اس کا بھائی کس مہم پر گیا تھا اور کتنا ناکام لوٹا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجید نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ تعلیمی ادارے ان دنوں ہڑتال کی نذر ہو رہے ہیں اس لیے مجید کو فرصت کو تفریح کی مصروفیت میں بدلنے کے لیے وہ سلمٹ گیا تھا لیکن میری وجہ سے دل نہیں لگا ہو گا لہٰذا ایک دن پہلے ہی واپس آ گیا۔ "بھیا' میری خاطر تم کب تک اپنا دل مارتے رہو گے۔" اس نے کہا۔

"میں کون سا دل مار رہا ہوں۔ جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ جہاں جی چاہتا ہے جاتا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو سلمٹ گیا تھا کہ نہیں۔"

"کیا خاک گئے تھے۔ ایک دن میں تو لوٹ آئے۔ میرے بغیر دل نہیں لگا ہو گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تیرے بغیر دل ہی نہیں لگا۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں بھیا' شادی کر لو۔ بھابی ساتھ ہوں گی تو میری یاد نہیں آئے گی۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"کردوں گا تیری یہ حسرت بھی پوری۔ فی الحال تو بھوک لگ رہی ہے۔"

"بھیا' تمہاری قسم مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی تھی۔"

"تجھے کب بھوک نہیں لگتی۔ چل جلدی سے کھانا نکال کر لے آ۔"

وہ وھیل چیئر گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ مجید اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا' یہی حال رہا تو اس گھر میں روٹی کب تک پکے گی۔ مجید' گھر کا چولہا روشن کرنے کے لیے سرگرداں تھا' ادھر سیاست کے چولھے میں آہستہ آہستہ آگ جلنا شروع ہو گئی تھی۔ کبھی یہ آگ دھیمی پڑ جاتی' کبھی بھڑکنے لگتی۔ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی لیگ سے مذاکرات کی خواہش ظاہر کی تھی اور تحفے میں یہ بیان بھیجا تھا۔ "ہم مشرقی پاکستان کی اکثریت کا خیر مقدم کرتے ہیں' ہمیں ان پر اعتماد ہے۔"

اچھے تحفوں کے جواب میں شکریے کے الفاظ ہی ادا کیے جاتے ہیں چنانچہ مجیب الرحمٰن نے جواب دیا "اسمبلی میں اکثریت رکھنے کے باجود میں یہ نہیں کہتا کہ دستور سازی کے مرحلے میں ہمیں مغربی پاکستان کے تعاون کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یقیناً" ان کا تعاون چاہیے۔"

فضا میں موجود تناؤ کا زور گھٹ گیا۔ مشرقی صوبے نے بہت دیر کی رکی ہوئی سانس کو باہر نکالا۔ چابی کے کھلونوں کی طرح ٹھہری ہوئی چیزوں میں حرکت آ گئی۔ کاروبار پوری آب و تاب سے چمکنے لگے۔ اس کے دوست کا خط آیا تھا کہ اب چونکہ دونوں صوبوں میں محاذ آرائی کا خطرہ ٹلتا جا رہا ہے۔ کاروبار پھر سے شروع ہو رہے ہیں۔ نفرتیں بھی کم ہو جائیں گی لہٰذا اگر وہ چاہے تو سلمٹ چلا آئے لیکن اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اس خط کا مثبت جواب دے اور چپکا ہو کر بیٹھ گیا۔

ایک مہینہ گزرا تھا کہ امیدوں کا محل گرتا ہوا نظر آنے لگا۔ عوامی لیگ نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے تمام اراکین کو جمع کیا اور سرعام ان سے چھ نکات سے وفاداری کا

حلف لیا۔ مجید کو محسوس ہوا جہاں سے وہ چلا تھا وہیں لوٹ آیا ہو۔ افہام و تفہیم کے تمام راستے مسدود ہوتے نظر آنے لگے۔ کاروباری حضرات کے کان پھر کھڑے ہو گئے۔ اس کے دوست کا خط پھر آیا کہ فی الحال وہ سلمٹ نہ آئے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز گھڑی کے پنڈولم کی طرح سیاست کی چابی سے چل رہی ہے۔

اب سلطانہ کو بھی شک ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اس کا بھائی کالج کیوں نہیں جا رہا ہے اور جب اس کا شک یقین میں بدل گیا تو اسے فکر لاحق ہو گئی۔ ”بھیا کاروبار تمہارے بس کا کہاں ہے۔“

”لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔“

”ملازمت کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتے ہو۔ اول تو کاروبار کے لیے رقم درکار ہوتی ہے۔ اگر رقم ہو بھی تو ان حالات میں کیا ضمانت ہے کہ یہ رقم ڈوب نہیں جائے گی۔“ وہ کئی دن سے یہی بات سوچ رہا تھا جس پر سلطانہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب اس کی تمام کوششیں ملازمت کے لیے تھیں' کاروبار کا خیال اس نے دل سے نکال دیا تھا۔ کئی دن جوتیاں چٹخانے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ یہ کام بھی اتنا آسان نہیں۔ سرکاری ملازمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پرائیویٹ ادارے اپنے اخراجات کم کر رہے تھے' نئے ملازم کیوں رکھنے لگے تھے۔

وہ اس شام آخری نوٹ بھنا کر گھر کے لیے راشن لایا تھا جو بہ مشکل ایک ہفتے چل سکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہو گا۔ یہ سوچنا ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ ہر دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ عام حالات میں یہ دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا لیکن اب مجبوری تھی۔ اس راستے کی پیش کش اسے بہت دن سے ہو رہی تھی لیکن وہ اس پر چلنے کے تیار نہیں تھا لیکن اب فاقے اسے نظر آ رہے تھے۔ وہ سبھاش بابو کے پاس پہنچ گیا۔ سبھاش بابو ہندو تھے۔ کاروباری حلقوں میں ایک ٹیکسٹائل ملز کے مالک مشہور تھے لیکن دراصل ان کے کچھ شیئرز تھے جو ایک ٹیکسٹائل مل میں لگے ہوئے تھے۔ بڑی رقم لگی ہوئی تھی اس لیے چند اہم پارٹنرز میں سے ایک تھے۔ لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ انڈین ایجنٹ ہیں۔ ایسے کئی ایجنٹ اس وقت کام

کر رہے تھے۔ ان کا کام رائے عامہ کو تبدیل کرنا اور سیاست دانوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا سمجھا جاتا تھا۔ سبھاش بابو سیاست دان نہیں تھے لیکن سیاست دانوں میں ان کے اثرو رسوخ کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہو جاتی تھی۔ مجید خود ان کے گھر پر کئی اہم سیاست دانوں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ ان سے کئی سال پہلے اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک دوست کی معرفت مل چکا تھا۔ یہ پیش کش اسے اس وقت بھی ہوئی تھی لیکن اس نے حقارت سے اسے ٹھکرا دیا تھا۔

بات پرانی ہو گئی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ سبھاش بابو کو اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہو گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ ایسے لوگوں کا حافظہ بہت قوی ہوتا ہے۔ اسے نہیں تو ان صاحب کو وہ ضرور پہچان لیں گے جن کی معرفت وہ ان سے ملا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ ڈھاکہ شہر خوف اور اندیشے کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ مجید فل آستین کا ۔۔۔۔ سوئٹر پہنے مفلر گلے میں ڈالے باتانی کالونی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ فیشن ایبل علاقہ ڈھاکہ کا گلبرگ کہلاتا تھا۔ مجید یہاں کے راستوں سے زیادہ واقف نہیں تھا کہ وہ سبھاش بابو کے گھر تک بہ آسانی پہنچ جائے گا مگر اسے اتنا یقین تھا کہ وہ جس آدمی کے گھر جا رہا ہے وہ اتنا مشہور ہے کہ اسے زیادہ گھومنا نہیں پڑے گا۔ یہی ہوا بھی۔ ایک دو گلیوں کی گردش کے بعد اس نے اپنے میزبان کا نام لیا اور پتا مل گیا۔ آہنی پھاٹک کے سامنے پہنچ کر اس نے اپنی سانسیں درست کیں۔ بے اختیاری سے اپنے بڑھے ہوئے شیو پر کئی مرتبہ ہاتھ پھیرا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ کافی دیر گزر گئی لیکن کسی نے باہر جھانکا تک نہیں۔ ممکن ہے بیل خراب ہو۔ اس نے سوچا اور پوری طاقت سے پھاٹک پر ہتھوڑوں کی طرح ہاتھ برسا دیے۔ کسی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کچھ دیر اس کی طرف غور سے دیکھا' پھر اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ بولو شاب' کس سے ملنا ہے۔" بولنے والا بنگالی تھا۔

"سبھاش بابو ہیں؟"

"اپنا نام بولو۔"

اس نے پہلے سے لکھا ہوا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لے جا کر انہیں دے دو۔"

"اچھا شاب۔" اس نے کہا اور گردن اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ایک زوردار آواز سے آہنی پھاٹک کھلا اور اسے اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔

سفید قمیض پہنے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ مجید کو اسے پہچاننے میں قطعی دقت نہیں ہوئی "ہیلو پروفیسر۔" اس نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجید کو تعجب ہو رہا تھا کہ اسے یہ کس طرح معلوم ہے کہ میں پروفیسر ہو گیا ہوں یا ہو گیا تھا۔ جس وقت میں اس سے ملا تھا اس وقت تو محض طالب علم تھا۔ "مجھے پروفیسر نہ کہیں پلیز۔" مجید نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم نے استعفیٰ دے دیا ہے لیکن تمہاری قابلیت کا میں بہت قائل ہوں۔ اسی لیے میں تمہیں پروفیسر کہہ رہا ہوں۔"

مجید کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں نے استعفیٰ کیوں دیا ہے؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہی ہے کہ تم ان دنوں پریشان ہو۔ میرے پاس کس لیے آئے ہو' یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ سبھاش کو کیا نہیں معلوم۔"

"جب آپ کو معلوم ہی ہے تو بتائیے مجھے موجود حالات میں کیا کرنا ہے۔ میں تیار ہوں۔"

"گڈ ---- ویری گڈ۔ یہی تو حالات ہیں جن میں کام کرنے کا مزہ آئے گا۔ کام مشکل نہیں ہے اور تنخواہ اتنی ملے گی جتنی کالج میں ملتی تھی۔ چلے گی؟"

"چلے گی۔ کام بتائیے۔"

"ارے کچھ نہیں۔ ان کالے بنگالیوں کے دل میں مغربی پاکستان کی طرف سے زہر بھرنا تمہارا کام ہو گا۔ غیر بنگالیوں کے دل بنگالیوں کی طرف سے برے کرنے ہوں گے۔ کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ ہمارا ڈس انفارمیشن سیل تمہیں ہدایات جاری کرتا رہے گا۔"

"یہ سیل کہاں ہے؟"

"یہ جاننا تمہارا کام نہیں۔"

"یہ کام میں کس طرح انجام دوں گا؟"

"ایک ساتھی تمہیں دیا جائے گا۔ تم دونوں کسی بھی پبلک مقام مثلاً" ہوٹل' سینما گھر' بسوں وغیرہ میں بحث کرو گے اور افواہیں اتنی زور زور سے پھیلاؤ گے کہ سب کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ پھر یہ خود آگے بڑھ جائیں گی۔ تم اکیلے بھی کسی جگہ بیٹھو گے تو انہی ہدایات کے مطابق بات کرو گے۔ اور یاد رکھو' ہر جگہ تمہاری نگرانی ہو رہی ہو گی۔ جو شخص تمہیں خبریں پہنچائے گا اس کا نام ہے "دھان کی بالی" یہ شخص بدلتا رہے گا لیکن نام اس کا یہی رہے گا۔ تمہاری منزل عام طور چھوٹے چھوٹے چائے خانے ہوں گے۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"اب تم جا سکتے ہو۔ کل صبح دس بجے ایک آدمی تمہارے گھر آئے گا۔ اپنا نام فرمان بتائے گا۔ وہ تمہیں کچھ رقم دے گا۔ یہ تمہاری ایڈوانس تنخواہ ہو گی۔ وہ جہاں لے جائے اس کے ساتھ چلے جانا۔ یہ شخص تمہارا کل کا ساتھی ہے۔ باقی باتیں خود معلوم ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی سبھاش اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور اس طرح اسے چھوڑ کر باہر نکل گیا کہ اسے بد تمیزی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

"آیئے شاب۔" وہی ملازم جو اسے دروازے پر ملا تھا اسے بلانے آیا تھا۔ مجید اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آیا اور باہر نکل آیا۔ اس کی جیب میں آخری دس کا نوٹ تھا۔ عام حالات میں وہ اس نوٹ کو بچا کر رکھتا لیکن اب امید ہو گئی تھی کہ کل پیسے مل جائیں گے۔ لہٰذا پیدل جانے کی بجائے اس نے سواری کا انتخاب کر لیا۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے معلوم تھا' کون ہو گا لیکن پھر بھی سینے میں اس کا دل زور سے دھڑکا۔ "میرا نام فرمان ہے۔"

"مجید۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"یہ لفافہ گھر میں رکھ کر آؤ اور میرے ساتھ چلو۔" مجید نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ وصول کیا اور گھر میں آ گیا۔ اس نے نوٹ گنے بھی نہیں کہ کہیں سلطانہ کو کوئی شک نہ ہو جائے۔

"کون تھا بھیا؟"

"ایک دوست ہے۔"

"تو بلاؤ نا۔"

"نہیں، میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"کہا؟"

"نوکری کی تلاش میں۔"

"کب تک آؤ گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا، تم کھانا کھا لینا۔"

"اچھا بھیا۔ تمہاری قسم بہت بھوک لگتی ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" دونوں بہن بھائی ایک ساتھ ہنسے اور مجید اسے خدا کے سپرد کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔

ڈھاکہ کے ایک مضافاتی علاقے میں وہ ایک سستا سا ہوٹل تھا۔ ہوٹل اسے صرف اس لیے کہا جا سکتا تھا کہ یہاں کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ایک قطعہ زمین کو چٹائیوں اور بانسوں سے گھیر لیا گیا تھا جس میں چند لکڑی کی بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ شیشے کے میلے گلاسوں میں لوگوں کو چائے پیتا دیکھ کر مجید کو متلی آنے لگی۔

"کچھ دیر یہاں بیٹھیں گے۔ پھر آگے چلیں گے۔"

"یہاں! اس غلاظت میں؟"

"یہ جاہل لوگ ہی تو ہماری باتوں پر یقین کریں گے۔"

ابھی مجید کچھ اور کہنے والا تھا کہ وہ چائے خانہ اتنے قریب آ گیا کہ اسے چپ ہو جانا پڑا۔ "جو میں کہوں، اسے خاموشی سے سننا اور اس طرح گردن ہلانا جیسے تمہیں ہر بات پر یقین ہے۔"

مجید نے یہ ہدایت بھی غور سے سنی اور اسی طرح گردن ہلائی جیسے فرمان نے اس سے کہا تھا۔ ویٹر نے دو گلاسوں میں چائے لا کر میز پر رکھ دی۔ غالباً یہاں آرڈر دینے کا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ "اب میں کہنا شروع کرتا ہوں۔ تم غور سے سنو۔"

مجید اس کی بات سننے کے لیے آگے کی طرف جھک گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا فرمان اس سے سرگوشیوں میں مخاطب ہو گا جیسے مجید سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو۔ "جنرل

یحیٰی آئے تھے ہمارے مجیب صاحب سے گفتگو کرنے یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا۔"

"ہاں معلوم ہے۔"

"بس جناب لڑ پڑے بھری میٹنگ میں۔ وہ تو بھلا ہو ان کا۔ کیا نام ہے جنرل پیرزادہ کا ورنہ ہاتھا پائی جاتی۔ مجیب نے بھی ایسی سنائیں کہ بس!"

برابر کی بینچ سے سے اٹھ کر ایک آدمی ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر کئی دوسرے آ گئے۔ "کیا بھیا' لڑائی ہو گئی؟"

"اور نہیں تو کیا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ ایک تو چھ نکات نہیں مان رہا تھا' اوپر سے کہنے لگا' مغربی پاکستان تم پر اسی طرح حکومت کرتا رہے گا۔ تم ہو ہی اس قابل۔"

"اچھا یہ بولا! ہمارے مجیب اس قابل ہیں؟"

"ارے اسے اپنی فوجی طاقت پہ بڑا ناز ہے۔"

"چٹکیوں میں اڑا دیں گے' اس کی فوجی طاقت کو۔"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو۔ وہ کہہ رہا تھا' چمڑی ادھیڑ دے گا بنگالیوں کی۔"

کوئی اور یہ بات کہتا تو شاید انہیں یقین بھی نہیں آتا لیکن کہنے والا بنگالی تھا' اس لیے سب کے سب اثبات میں سر ہلانے لگے۔ "بھائی' بہت برا وقت آنے والا ہے۔ اس کی تو یہ ضد ہے کہ اس وقت اقتدار منتقل کرے گا جب اسے صدر بنایا جائے۔ اب بتاؤ ایسا متعصب آدمی صدر بنے گا تو ہمارا کیا حشر ہو گا۔"

"اس کا تو باپ بھی صدر نہیں بن سکتا۔"

مجمع اب جوش میں آ گیا تھا۔ ایک دو نے تو عوامی لیگ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ فرمان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے چائے کے پیسے ادا کیے اور اٹھ گیا۔ جتنے لوگ جمع ہو گئے تھے' اب اسی موضوع کو بڑھا چڑھا کر باتیں کر رہے تھے۔ دوسرے دن مجید کے پڑوسی عبدالرحمٰن اسے ملے تو انہوں نے عجیب ہی کہانی سنائی۔ "سنا ہے یحیٰی نے مجیب کے ساتھی کے تھپڑ مار دیا جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ مجیب نے کہہ دیا' ڈھاکہ سے فوراً" نکل جاؤ۔ تم نے سنا نہیں' کل وہ ڈھاکہ سے چلے گئے۔ ڈر کے بھاگا ہے۔"

مجید' افواہوں کی طاقت کا قائل ہو گیا۔ جو بات انہوں نے ڈھاکہ کے مضافات میں پھیلائی تھی' وہ نہ صرف یہاں تک پہنچ گئی تھی بلکہ کسی دوسرے ہی رنگ میں پہنچی تھی۔

یحییٰ خاں' ایک دن کراچی میں ستانے کے بعد سیدھے لاڑکانہ گئے' تاکہ عوامی لیگ سے ہونے والے مذاکرات سے انہیں آگاہ کر سکیں۔ جنرل عبدالحمید بھی ان کے ساتھ تھے۔ یحییٰ خاں اس وقت بھٹو صاحب کے لیے بہت قیمتی تھے اور یوں بھی وہ ان کے مہمان تھے۔ ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ مرغابیوں کا شکار کھیلا' المرتضیٰ کے سبزہ زار پر چہل قدمی کی اور گفت و شنید کی۔

دھان کی بالی کے نام سے ایک شخص مجید کے پاس آئے گا جس کے ساتھ آپ کو یونیورسٹی جانا ہے۔ "خبر کیا ہے؟"

"یحییٰ کی لاڑکانہ روانگی کو سازش قرار دے کر شہر کے کونے کونے میں پھیلانا ہے۔ کل دن بھر آپ کو یہی کام کرنا ہے۔"

دوسرے دن وہ طالب علم اس کے گھر پہنچ گیا۔ بیس اکیس سال کا یہ نوجوان اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ بظاہر یونیورسٹی کا طالب علم معلوم ہو۔ یونیورسٹی کا طالب علم معلوم ہو۔ یونیورسٹی کی کینٹین طلبہ و طالبات سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہاں پہلے ہی سیاسی فضا گرم تھی۔ موضوع اقتدار کی منتقلی تھا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑے جذباتی انداز میں بحث و مباحثے میں مصروف تھے۔ مجید کے ساتھ آئے ہوئے طالب علم نے کرسی پر بیٹھتے ہی اس طرح دھواں دار بولنا شروع کر دیا جیسے وہ دونوں باہر ہی سے بحث کرتے ہوئے آئے تھے اور دونوں کے درمیان کوئی اختلاف ہے۔

"کیا بات کر رہے ہو یار۔ سازش ہو رہی ہے لاڑکانہ میں۔ سازش۔"

"مگر معلوم تو ہو' سازش ہے کس کے خلاف۔"

"مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف اور کس کے خلاف۔"

"مگر وہ سازش کیوں کریں گے؟" مجید نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب وہ معاملے کو سمجھتا جا رہا تھا۔"

"لو' جناب پوچھ رہے ہیں کیوں کرے گا وہ سازش۔" اس طالب علم نے

دوسرے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تاکہ وہ بھی گفتگو میں شریک ہو جائیں۔

"یہ صاحب بہاری معلوم ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیٹ میں پاکستان کا درد بہت اٹھتا ہے۔ اسی لیے انہیں کوئی سازش نظر نہیں آتی۔"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو خود بہت خلاف ہیں مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"تو تم سمجھا دو۔"

"ہاں وہی تو کر رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی سن لیں۔ میرے ایک رشتے دار بنگال رجمنٹ میں ہیں' اس لیے سننے والے اپنی کرسیاں گھسیٹ کر اس کے قریب آ گئے۔

"پچھلے دنوں آپ نے سنا ہو گا کہ مجیب نے یحییٰ خان کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ وہ ڈھاکہ چھوڑ دیں۔ اسی سخت رویے کی سزا دینے کے لیے سازش کی جا رہی ہے۔"

"سوال پھر بھی یہ بنتا ہے کہ کیسی سازش۔" ایک طالب علم نے پوچھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب بات غور سے سنی جا رہی تھی۔

"میں بتاتا ہوں۔ دیکھو! جب یحییٰ خاں یہاں آتا ہے۔ یہاں' ڈھاکہ تو مجیب الرحمٰن کو ایوان صدر میں طلب کرتا ہے۔ خود ملنے ان کے گھر نہیں جاتا جبکہ مجیب الرحمٰن اکثریتی پارٹی کے سربراہ ہیں اور جب مغربی پاکستان جاتا ہے تو مسٹر بھٹو کے گھر جا کر ٹھہرتا ہے۔ کیا یہ جمہوریت کے خلاف' ہمارے خلاف سازش نہیں ہے۔"

"ہے تو سازش۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"میرے رشتے دار نے تو مجھے یہ تک بتایا ہے کہ یحییٰ خاں نے مجیب کو راستے سے ہٹانے کے لیے بھٹو سے خفیہ سمجھوتا کیا ہے۔" اس نے افواہ میں جان ڈالنے کے لیے نہایت یقین سے گپ ہانکی۔

"میری بات کا اب بھی یقین نہ آئے تو کل کا اخبار دیکھ لینا۔"

"کیا ہو گا کل کے اخبار میں؟" سب نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لینا اور اپنے مجیب کو بچانے کے لیے اتنی زور سے آواز اٹھانا کہ جس کی گونج لاڑکانہ تک پہنچے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ مجید بھی اس کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس دن وہ کئی اور پبلک مقامات پر بھی گئے اور یہی زہر انڈیل

کر آگے بڑھتے گئے۔ "اب کل باہر مت نکلنا۔ آرام سے گھر میں بیٹھنا اور دیکھنا کیسا مزہ آتا ہے۔"

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو اخبارات کے صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی ہوئی تھی جس میں جنرل یحییٰ خاں اور مسٹر بھٹو کو "المرتضیٰ" کے وسیع اور خوبصورت سبزہ زار پر چہل قدمی کرتے دکھایا گیا تھا۔ مجید کو سبھاش کے لمبے ہاتھوں کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے اسے کل ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ تصویر چھپ رہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اخباروں کو تصویر اسی نے فراہم کی ہو۔ اس پر اب یہ عقدہ بھی کھلتا جا رہا تھا کہ یہ جنگ مجیب اکیلا نہیں لڑ رہا ہے' کئی دوسری طاقتیں بھی اس میں شریک ہیں جن کا ایک نمائندہ سبھاش ہی سے کیا' اب تو وہ خود بھی اس خطرناک کھیل کا ایک کردار بن گیا ہے۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ کیسی باعزت زندگی گزار رہا تھا اور اب ذلت کی کس دلدل میں اتر گیا ہے۔ ان افواہوں کی بدولت اگر کوئی لاوا پھوٹا' کوئی جان تلف ہوئی یا ملک ٹوٹا تو اس کا ذمے دار وہ خود بھی ہو گا۔ اسے آج افروز کی یاد بھی شدت سے آئی۔ وہ دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی تھی' فرصت ملتے ہی خوشبو کی طرح اس کے وجود میں پھیل گئی۔ وہ شکایت کر رہی تھی' تم ملنے بھی نہیں آئے۔ ایسے بھولے کے بس بھول ہی گئے۔ میں خود ہی ملنے آ جاتی مگر تم تو ڈھاکہ میں ہو گے ہی نہیں۔ تم نے کہا تھا' سلمٹ چلے جاؤ گے۔ تم نے تو وہاں پہنچ کر خط بھی نہیں لکھا۔ تمہیں خط لکھ کر ہی باتیں کر لیتی۔ حالات دیکھ رہے ہو کیا ہو رہے ہیں۔ کیا ہم ملے بغیر ہی بچھڑ جائیں گے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کے خیالوں کا محل مسمار کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹیلی فون کو تکتا رہا۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے گھبرا کر ٹیلی فون پر ہاتھ ڈالا "ہیلو۔"

یہ اس کے پڑوسی عبدالرحمٰن کا ٹیلی فون تھا جو اس وقت اپنے دفتر سے بات کر رہے تھے۔ "ہیلو' مجید بابو!"

"بول رہا ہوں۔"

"شکر ہے آپ مل گئے۔ باہر نہ نکلئے گا۔ بڑے زور کا دنگا ہوا ہے۔ گولی چل گئی

ہے۔ سنا ہے چھ لاشیں گری ہیں۔"

"کہاں؟ کب؟"

"یونیورسٹی کے لڑکوں نے جلوس نکالا تھا جو بعد میں تشدد پر اتر آیا۔ غضب یہ ہوا کہ لڑکے چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ فوج کو مجبوراً گولی چلانی پڑ گئی۔ میں نے سوچا آپ کو اطلاع کر دوں۔"

اس اطلاع نے اس کی رگوں سے لہو نچوڑ لیا۔ سبھاش کی یہ چال بھی کامیاب ہو گئی تھی۔ آج چار لاشیں گری تھیں' کل ان لاشوں کا جلوس امن قائم نہیں رہنے دیں گے۔ جب کوئی سیاسی سمجھوتا ہونے لگے گا' یہ افواہوں کا بازار گرم کر دیں گے۔ اس کا جی چاہا' باہر نکل کر زور زور سے چلائے۔ یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔ مجیب کو راستے سے ہٹانے کا کوئی منصوبہ زیر غور نہیں۔ یہ من گھڑت کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں پر کیوں اپنی جان دیتے ہو مگر اس کی سنے گا کون۔ جب طوفان آتا ہے تو اس کا زور خود گھٹتا ہے۔ کوئی ہوا پر حکم نہیں چلا سکتا۔ کوئی لہروں کو پیروں سے نہیں روک سکتا۔ اگر بالفرض میں اسے روک بھی لوں تو میری نگرانی کی جا رہی ہو گی۔ مجھے زندہ کون چھوڑے گا۔ میرے بعد سلطانہ کا کیا ہو گا۔ اسے تو بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ اسے کھانا کون کھلائے گا۔ طوفان تو پھر بھی نہیں تھمے گا۔ میری جگہ کوئی اور اس نوکری پر آجائے گا۔ افواہیں تو پھیلتی ہی رہیں گی۔ پھر میں ہی کیوں نہیں۔ افروز کا کیا ہو گا؟ اسے کیا معلوم میں کیا کر رہا ہوں۔ کبھی ملا تو کہہ دوں گا' مجھے نوکری مل گئی ہے۔ حالات ذرا سازگار ہو جائیں' میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔ چار دن کے سخت کرفیو کے بعد ڈھاکہ شہر ہوش میں آیا تو ایک اور ہوش ربا خبر منہ کھولے سامنے کھڑی تھی "دھان کی بالی" نے اطلاع فراہم کی کہ مسٹر بھٹو عوامی لیگ کی قیادت سے ملاقات کے لیے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ ابھی تک لاڑکانہ سازش کے مہیب سائے گردش میں ہیں۔ تم یہ افواہ گرم کر دو کہ ان کی آمد اسی سازش کا حصہ ہے۔ انہیں نہیں آنا چاہیے۔

شہر میں ان کی آمد کے خلاف نعروں اور جلوسوں کا بازار گرم ہو گیا۔ خود عوامی لیگ کی انتظامی کمیٹی کے بعض ارکان بھی اس دورے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ یحییٰ خاں کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ پہنچتے تو بات دوسری تھی۔

البتہ بعض ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ اگر یحییٰ خاں ہماری بات نہیں مانتے تو ہمیں دوسری بڑی سیاسی پارٹی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔

یہ حالات تھے کہ بھٹو اور ان کے رفقا کو لے کر آنے والا طیارہ ڈھاکہ ائرپورٹ پر اترا۔ زمین پر دور تک سبزے کا قالین بچھا ہوا تھا۔ آسمان پر ادھر ادھر بادل کے دبیر ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ خنک ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ماحول میں پراسرار سناٹا تھا۔ ائرپورٹ کے بنگالی ملازمین ناگواری سے ادھر ادھر دوڑ بھاگ رہے تھے مسٹر بھٹو کچھ دیر ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج کے دبیر صوفے پر سستانے کے لیے بیٹھے رہے پھر نقرئی نمبر پلیٹ والی سیاہ کار میں ایئرپورٹ سے روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن انہوں نے مجیب الرحمٰن سے تنہائی میں ملاقات کی۔ اس کے بعد دونوں پارٹیوں کے آئنی ماہیرین بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے۔ بات چیت تین روز جاری رہی مگر عدم اعتماد کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

"ہم نکات میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کریں گے۔" مجیب نے بات صاف کر دی۔

"ہم علیحدگی کی اس در پردہ اسکیم کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔" بھٹو نے بھی نہایت صفائی سے جواب دیا۔

مجید اپنی ملازمت کی مجبوری سے اس ملاقات اور اس میں ہونے والی گفتگو کو نئے نئے معنی پہناتا پھر رہا تھا۔ ڈھاکہ شہر افواہوں کے بوجھ تلے دبا ہولے ہولے سانسیں لے رہا تھا۔ اسی بوجھل خاموشی میں دس دن گزر گئے۔ پھر یکایک ٹھہرے ہوئے بادلوں کو حرکت ہوئی۔ چند چھینٹے پڑے اور فضا خوش گوار ہو گئی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ 71ء کو ڈھاکہ میں ہو گا۔

سبھاش کے محل نما مکان میں زلزلہ آ گیا۔ اجلاس میں کئی بڑے شریک تھے۔ مجید کو بھی بلایا گیا تھا۔ اس روز مجید کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیسے معتبر نام' سبھاش کے حلقہ' ارادیت میں شامل ہیں اور اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ "یہ اجلاس کسی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔" سبھاش کی آواز گونجی۔

"آپ کہیں تو اسمبلی میں بم رکھوا دیں۔"

"کچھ بھی کرو' میں اجلاس نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سیاست دان اگر مل کر بیٹھ گئے تو میں اجلاس تو ہماری ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔"

اس سے پہلے کہ اس اجلاس میں طے ہونے والی تجویزوں پر عمل ہوتا بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا۔ 16 فروری کا روزنامہ ڈان سبھاش کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اس اخبار میں بھٹو کی دھمکی جلی حروف میں شائع ہوئی تھی "پی پی پی کو نظرانداز کیا گیا تو خیبر سے کراچی تک طوفان برپا کر دوں گا۔"

سبھاش کی تو جیسے مراد بر آئی۔ اس نے بے تابی سے ٹیلی فون اٹھایااور کسی کو خوش خبری سنائی۔ "مبارک ہو۔ ہمیں انگلی بھی ہلانی نہیں پڑی اور کام ہو گیا۔ اب کوئی طاقت مشرقی پاکستانکو بنگلہ دیش بنانے سے نہیں روک سکتی۔"

بھٹو کے اعلان کے بعد صدر یحییٰ نے کابینہ کو برخاست کر دیا اور ملک ایک مرتبہ پھر مارشل لا کی گرفت میں آ گیا۔ ایسٹ پاکستان کی مخصوص صورت حال نے فوجیوں کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ ہیڈکوارٹر ایسٹرن کمانڈر نے ایک پلان تیار کیا تھا جس کے مطابق اندرونی طور پر حالات خراب ہونے کی صورت میں کاروائی کرنی تھی۔ جنرل یعقوب راولپنڈی سے ہدایات لے کر لوٹے اور اس پلان پر عمل کرنے کے احکامات نافذ کر دیے۔ احکامات پر عمل درآمد کے لیے مغربی پاکستان سے فوجی پہنچنا شروع ہو گئے۔ فروری سے مارچ تک دو پلٹنیں پی آئی اے سے ڈھاکہ پہنچ گئیں۔ اس تازہ نفری کی آمد کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ فوجیوں کو سادہ کپڑوں میں ڈھاکہ لایا گیا۔ طیاروں سے ایک جیسی وضع قطع رکھنے والے ہزار ڈیڑھ ہزار افراد جو —— نمودار ہوئے' بنگالی ملازمین کو شک ہو گیا۔ جناح کیپ لگانے کے باوجود یہ افراد سویلین نہیں ہیں۔ یہ وہ فوجی ہیں جنہیں ہم پر مسلط کرنے کے لیے خفیہ طور پر لایا جا رہا ہے۔

سبھاش کے گھر آج پھر ایک اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں وہ ملازم مرکزی حیثیت رکھتا تھا جس نے ائرپورٹ پر ان فوجیوں کو اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ "سن لیا' ہمارا یہ کارندہ کیا خبر لایا ہے۔ یہ خبر ہماری موت کے پروانے پر دستخط کی طرح ہے۔ مغربی پاکستان فوجی یلغار کے لیے تیار ہو گیا ہے لیکن ہمارے خیال میں ابھی یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اچھا ہے، ایک ہی مرتبہ ہو جائے جو ہونا ہے۔" کسی ممبر نے جوش میں آ کر کہا۔

"جذباتی زبان بہت اچھی لگتی ہے لیکن فوج سے لڑنا مذاق نہیں ہے۔ عوامی لیگ کے پاس ابھی مدافعت کی طاقت نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ یہ وقت اگر کسی طرح عوامی لیگ کو مل جائے تو مقابلہ ٹھیک ٹھاک ہو سکتا ہے، اگر پہلے ہی حملے میں وہ چنگاری کی طرح بجھ گئی تو ہمیں بھی اپنا بوریا بستر باندھنا پڑے گا۔ جہاں فوجیوں کا راج ہو وہاں کس کا داؤ چلے گا۔"

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کی نظر ایک چہرے پر جم گئی "آپ تو عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت سے بہت قریب ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیے کہ اگر کوئی فوجی کاروائی ہونے والی ہے تو اسے اس وقت نہیں ہونا چاہیے۔ کسی نہ کسی طرح اسے رکوا لیں۔

یہ شخص ایک بنگالی اخبار کا ایڈیٹر تھا اور عوامی لیگ سے بہت قریب تھا۔ اس نے سبھاش کے مشورے پر گردن کو ہلکا سا خم کیا جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے دن عوامی لیگ کی مجلس عاملہ کے دو اراکین اس اخبار کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ایڈیٹر انہیں نیک و بد سمجھا رہا تھا۔ "صدر مملکت کو فوراً ڈھاکہ آنا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات بہت نازک ہیں۔" ایڈیٹر نے انہیں سمجھایا۔

"لیکن وہ یہاں کیوں آنے لگے تھے۔" ایک رکن نے کہا۔

"آپ انہیں بلائیں۔"

"ان کی نقل و حرکت ہمارے اختیار میں نہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ انہیں ضمانت دیں کہ اگر وہ تشریف لے آئیں تو عوامی لیگ ان کے احترام میں چھ نکات میں ایسی ترمیم کر دے گی کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے قابل قبول ہو گی۔"

"مگر یہ تو ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ اس کا تو اب وقت ہی گزر چکا ہے۔"

پالیسی سے پھرنے کے لیے میں کب کہہ رہا ہوں۔ یہ تو سیاست ہے۔ پھر

قلابازی کھا لیجئے گا۔ جب وہ آئیں گے تو اس ترمیم کے عوض کئی باتیں آپ کی بھی تو تسلیم کریں گے۔ ان کا فائدہ تو آپ کو مل ہی جائے گا' کچھ نہیں تو فوجی ایکشن تو کچھ دن کے لیے ٹل ہی جائے گا۔ ان کی نیت معلوم ہو ہی گئی ہے۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اس حد تک جا سکتے ہیں لہٰذا اپنی تیاری کرتے رہیے۔"

"واہ ایڈیٹر صاحب! تو مناسب ہے لیکن انہیں یہ دعوت دی کیسے جائے۔"

"آپ مجیب الرحمٰن سے بات کریں۔ اگر وہ اس تجویز سے متفق ہوں تو انہیں چاہیے' وہ جنرل یعقوب سے بات کریں۔"

جنرل یحییٰ تو نہیں آئے یہ خبر آئی کہ 3 مارچ کو ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ بعد میں اس کی توثیق بھی کر دی گئی۔ یہ صورت حال سبھاش کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ اس کے کارندے جن میں مجید بھی شامل تھا گلی گلی پھیل گئے۔ بنگالیوں کی حق تلفی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ پورا بنگال سراپا احتجاج بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس روز ریڈیو پر اعلان ہونا تھا۔ توقع یہ کی جا رہی تھی کہ التوا کے ساتھ ہی نئی تاریخ کا اعلان ہو جائے گا لیکن صرف التوا کا اعلان ہوا۔ اعلان کے آدھے گھنٹے بعد پورا شہر سڑکوں پر امڈ آیا۔ بانس' لاٹھیاں' سریے اٹھائے بپھرے ہوئے عوام غصے سے کانپ رہے تھے۔ ان کے راستے میں جو چیز آئی خس و خاشاک بن گئی' تہس نہس ہو گئی۔ دکانیں لٹ گئیں' گاڑیاں جل گئیں اور کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ بنگالیوں کے غصے کا نشانہ ظاہر ہے غیر بنگالیوں ہی کو بننا تھا۔ جتنی دکانیں لٹیں' سب کی سب بہاریوں کی تھیں۔

"مجید اپنے گھر میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس فتیلے کو آگ دکھانے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ یہ احساس اسے کاٹے ڈال رہا تھا۔ یہ آگ اسے اپنے گھر کی طرف بھی بڑھتی نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی غیر بنگالی تھا۔ آج کے ہنگاموں نے یہ منظر پیش کر دیا تھا کہ آئندہ ہونے والا کوئی ہنگامہ' غیر بنگالیوں کی املاک کی تباہی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گا۔ اسے پیغام ملا کہ آج شام مجیب الرحمٰن ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔ تمہیں اس میں شریک ہونا ہے۔ شام سے پہلے پہلے اسے دعوت نامہ بھی مل گیا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ یہ سبھاش آخر چاہتا کیا ہے۔ اسے معلوم ہے' میں غیر بنگالی ہوں۔

غیر بنگالیوں کے لیے جو نفرت پیدا ہو گئی ہے کیا اس کے باوجود مجھے وہاں جانا چاہیے؟ جواب انکار میں آیا لیکن سبھاش کی حکم عدولی کی ہمت بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے سوچا' وہ پریس کانفرنس ہے۔ صحافی موجود ہوں گے' عوامی لیگ میزبان ہو گی لہٰذا کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ پریس کانفریس میں کسی آنکھ نے اسے نفرت سے نہیں دیکھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ غیر بنگالی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا خوف دور ہو گیا۔ مجیب کہہ رہا تھا "اس صورت حال کو ہم چیلنج کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ 3 مارچ کو سارے صوبے میں مکمل ہڑتال کی جائے گی اور 7 مارچ کو آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے گا۔"

پریس کانفرنس اتنی زور دار تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے مجید بھی اپنے آپ کو عوامی لیگ کا رکن سمجھنے لگا۔ اسے مجیب کی ایک ایک بات سے اتفاق ہو رہا تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد صحافیوں کو ان علاقوں کے دورے پر جانا تھا جہاں دن پھر فساد ہوا تھا۔ مجید بھی ایک دوست کے ساتھ اس قافلے میں شریک ہو گیا۔ بازار بند پڑے تھے۔ سڑکوں پر وہ سامان ابھی تک بکھرا پڑا تھا جو لٹ مار سے محفوظ رہ گیا تھا یا جل کر کوئلہ بن گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت گزرے کچھ ہی دیر ہوئی ہو۔ کچھ دکانوں کے شٹر پگھل کر ڈھیر ہو گئے تھے۔ ایک دکان کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ سائن بورڈ جلنے سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہ افروز کے والد کی دکان تھی۔ آخر یہ آگ میرے گھر تک پہنچ ہی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ملبے کے ڈھیر پر افروز بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس لڑکی نے کسی مرحلے پر میرا ساتھ چھوڑا لیکن شاید اب وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ اس کی تباہی میں میرا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا فسادیوں کا۔ دیا سلائی میں نے فراہم کی تھی' آگ دوسروں نے لگائی۔

وہ قافلے کے ساتھ گیا تھا' اکیلا واپس آیا لیکن اس طرح جیسے دفنانے والے پہلے آ گئے' قبر سے مردہ اٹھ کر بعد میں آ رہا ہو۔ سلطانہ اس مردے کو دیکھ کر چیخ مارنے کی بجائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس وقت اس کا ہنسنا اسے شاق گزر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کوئی اسے دیکھ کر روئے۔ اس پر لعنت بھیجے' اس کے منہ پر تھوکے۔ جس نے اپنی محسن کو دغا دی' جس نے اپنی محبت کو سر بازار جلا دیا' جس نے افروز کا نوالہ اس سے چھین لیا لیکن وہ تھی کہ ہنسے جا رہی تھی۔ "بھیا' میں تو اس لیے ہنس رہی ہوں کہ

تم جس بات کو چھپا رہے تھے' وہ مجھ پر خود بخود ظاہر ہو گئی اور تم یہی سمجھ رہے ہو گے کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"کیا چھپا رہا تھا میں' کیا ظاہر ہو گیا تجھ پر۔"

"افروز آئی تھی۔" سلطانہ نے کہا اور مجید کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی۔

مجید کے چہرے پر کلیاں سی چٹکنے لگیں۔ یا تو دھواں سا پھیلا ہوا تھا یا جیسے کسی نے گلال مل دیا ہو۔ اس کے اندر کوئی ہولی کھیلنے لگا۔ "افروز آئی تھی؟ کیا کہہ رہی تھی۔ مجھے پوچھ رہی ہو گی۔"

اس کے منہ سے الفاظ خود بخود نکلے جیسے کسی نے دل کے تاروں پر انگلی رکھ دی ہو۔ پھر اسے اچانک احساس ہوا کہ اس نے کیا کہہ دیا "کون افروز۔ میں تو کسی افروز کو نہیں جانتا۔"

وہی افروز جسے تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔" اس کی ہنسی اب مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"اچھا وہ افروز' کیا کہہ رہی تھی۔ کیا پھر ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہے؟"

بھیا' اب بنو مت۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ تم روز اس کی طرف جاتے ہو مگر آج معلوم ہوا' وہ کہہ رہی تھی' تم نے اس سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔"

"میرے پاس وقت کہاں ہے۔"

"اس بے چاری کے ساتھ تو بہت برا ہوا ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"اس کے باپ کی دکان جلا کر خاک کر دی بنگالیوں نے۔"

"مجھے معلوم ہو گیا"

"اس صدمے سے ان بے چاروں پر دل کا دورہ پڑا ہے' ہسپتال میں داخل ہیں وہ یہی بتانے آئی تھی۔"

"ہسپتال میں داخل ہیں!"

اس کے علاوہ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکل سکا۔ وہ اسی وقت جاتا لیکن وہ دن' رات کے وقت گھر نکلنے کے نہیں تھے۔ وہ تمام رات انگارے سمیٹتا

کانٹے بٹورتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے سبھاش کو اطلاع دی کہ وہ ہسپتال جا رہا ہے۔ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ گھر سے کہیں بھی جائے گا' اس کی اطلاع کرے گا۔ یہ ایک رسمی کاروائی تھی ورنہ سبھاش نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔

وہ اسے کمرے سے باہر وارڈ میں ٹہلتی ہوئی مل گئی۔ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید اسی کا۔ "آ گئے آپ! مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔ آپ اس لئے نہیں آرہے تھے نا کہ میں آپ کو بلاؤں گی جب آئیں گے۔ اسی لیے مجھ سے نہیں رہا گیا۔ کل میں آپ کے گھر چلی گئی۔ آپ کو برا تو نہیں لگا میرا آنا۔" وہ سانس لیے بغیر بولے چلی جا رہی تھی۔

نہیں۔ اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ میں تو کل سے یہی سوچے جا رہی تھی۔"

"کیسی ہے تمہارے ابو کی حالت۔"

"ٹھیک ہے اب تو۔ آپ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔"

"میری فکر چھوڑو۔ چلو اندر چلو' تمہارے ابو سے تو مل لوں۔"

"وہ سو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے' جب تک خود نہ اٹھ جائیں' کوئی انہیں اٹھائے نہیں۔"

"اوہ! میں تو پھر ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔"

"ابھی تو نہیں جا رہے۔"

"نہیں' دس بجے تک تو ہوں۔"

"آیئے یہاں کینٹین ہے۔ بڑی اچھی چائے ملتی ہے۔ اس وقت تک شاید ابو بھی جاگ جائیں ورنہ شام کو پھر آجایئے گا۔"

"وہ شاید رات بھر نہیں سوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ "ابو کے پاس تم ٹھہری تھیں رات کو؟"

"ہاں۔ امی نے کہا حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ ہسپتال میں رہتیں تو مجھے گھر پر رہنا پڑتا۔ ان کے خیال میں ہسپتال محفوظ ہے۔ جب گھر غیر محفوظ اور ہسپتال محفوظ ہو جائیں تو ہسپتال بھر جاتے ہیں۔ ہسپتال بھرنے کے دن قریب آنے لگے ہیں' حالات اسی

سمت جا رہے ہیں۔"

وہ کبھی کبھی اتنے پتے کی بات کہہ جاتی تھی کہ مجید کو اس کی ذہانت سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا افروز اسے لے کر کینٹین میں داخل ہو چکی تھی۔ ان کے علاوہ کینٹین میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی بیٹھ سکتے تھے اور بیٹھ گئے۔ مجید کو یہ شک ہو رہا تھا کہ اس کے والد سوئے ہوئے نہیں تھے۔ اس لیے وہ باہر ٹہل رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں آؤں گا۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے کے لیے یہاں آئی ہے۔ ورنہ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ ایسی باتیں کی جاتیں۔

"اب تو آپ کی ملازمت بھی ہو گئی۔" اس نے بغیر تمہید کے عجیب بے تکا سا سوال کر ڈالا۔

"ہاں' ہو تو گئی ہے۔"

"مگر زیادہ اچھی ملازمت نہیں ہے۔ یہی نا۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

"میں لڑکی ہو کر آپ سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔ اسی سے بڑی مجبوری اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ نے کہا تھا' آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ اب تو آپ پروفیسر نہیں ہیں۔"

"میں نے کہا ضرور تھا لیکن یہ کہا تھا' میں اپنا کاروبار کروں گا۔"

"مجید صاحب۔ اب نہ میرے پاس وقت ہے' نہ ابو کے پاس اور نہ میرے ملک کے پاس۔ کسی کے ساتھ' کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے دیر کی تو میں قلاش ہو جاؤں گی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ ہماری اس صوبے میں بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دھماکا ہو آپ میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔"

"مگر یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم تو یہ بتاؤ دکان کیسے جلی۔ کیا ہوا تھا؟"

کن کن دکانوں کا احوال پوچھتے پھرو گے۔ یہ تو اب یہاں روز ہو گا۔ یہاں سے بھاگنے کی فکر کرو۔ اب یہ آگ پھیلتی رہے گی۔ سامان سمیٹو' تمہارے سامان کا ایک حصہ میں بھی ہوں۔ مجھے جلنے سے بچالو۔ آج ہی میرے ابو سے بات کر لو۔ شاید یہی

خوشی ان کی صحت کا پیغام بن جائے۔"

"اس خبر سے انہیں صدمہ بھی ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے تمہارے لیے کیا سوچ رکھا ہو۔ میں اب معمولی کلرک ہوں، پروفیسر نہیں۔"

"تو پھر امی سے ------"

"وہ بھی یہی کہیں گی کہ تمہارے ابو ٹھیک ہو کر گھر آجائیں پھر سوچیں گے۔"

"مجید صاحب، آپ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں آپ کے قابل نہیں۔ مجھے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں مار رہے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا جسے چھپانے کے لیے وہ کرسی سے اٹھ گئی۔

یہ بات نہیں۔" مجید نے اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا "یہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ تمہارے ابو ٹھیک ہو جائیں، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان سے بات کروں گا۔"

"سچ۔" دو قطرے اس کے رخساروں پر بہہ گئے۔ وہ تو اس کے سامنے چابی کی گڑیا بن جاتی تھی۔ مجید چاہتا، اسے رلا دیتا، مجید چاہتا اسے ہنسا دیتا۔ وہ تو برسات کی دھوپ بن گئی تھی۔ کبھی ہنستی کبھی رونے لگتی۔

وہ ہسپتال سے نکلا تو افواہوں کی گرمی سے سارا شہر جل رہا تھا۔ خبر گرم تھی کہ گورنر مشرقی پاکستان وائس ایڈ مرل ایس، ایم احسن کو سبک دوش کر دیا گیا ہے۔ بظاہر اس خبر میں کوئی ایسی سنگینی نہیں تھی لیکن لوگ اس سے یہ مطلب نکال رہے تھے کہ ڈھاکہ کی انتظامیہ کا رویہ ہمدردانہ ہے لیکن راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے لوگ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ گورنر کو اسی کی سزا ملی ہے۔ اب فوج کشی کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ گورنر کی علیحدگی کو خطرے کا سگنل سمجھا جا رہا تھا۔ شام تک اس نے یہ بھی سن لیا کہ مجیب الرحمٰن نے عدم تعاون کی تحریک چلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اگلے دن اس نے اس کا مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ بنگالی عملے نے اس وقت کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جب بوئنگ طیارے فوجی جوانوں سے لدے ہوئے اتر رہے تھے۔

"جن طیاروں میں ارکان اسمبلی کو آنا چاہیے تھا، ان میں بنگالی عوام کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کے لیے فوجی جوانوں کو لایا جا رہا ہے۔ مجید کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔

۱۰ مارچ کی شام کو کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ کرفیو کے نفاذ کے لیے فوجی شہر میں داخل ہوئے لیکن بوٹوں کی دھمک ابھی اچھی طرح گونجی بھی نہیں تھی کہ عوامی لیگ نے اپنے کارکنوں کو ہدایات دی' کرفیو ضرور توڑنا ہے چاہے اس میں جان چلی جائے۔

وقت چوروں کی چال چل رہا تھا۔ دبے پاؤں لیکن ہوشیار' چوکنا۔ سناٹے کے اندھیرے چوروں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ کہیں سے کوئی گولی نہیں چلی' کہیں سے کوئی دھمکی نہیں ملی۔ فوج تھی کہ دم سادھے کھڑی تھی۔ فوج پر پھبتیاں کسی جانے لگیں' انہیں گالیاں دی جا رہی تھی مگر حکم نہیں تھا کہ بندوق کی نال کوئی سیدھی کرتا۔ آزمائش کے چند گھنٹے اور گزر گئے۔ اشتعال انگزیاں بڑھتی گئیں' سپاہیوں کا صبر گھٹتا گیا۔ ہجوم نے نفرت کا اظہار پتھروں سے کیا۔ سپاہیوں نے گولیوں سے جواب دیا چھ بنگالی ڈھیر ہو گئے۔ یہ چھ لاشیں عوامی لیگ کے لیے زندگی کی علامت بن گئیں۔



مارشل لا ہیڈکواٹر میں درجہ حرارت بڑھا ہوا تھا۔ جنرل یعقوب سخت فکر مند تھے۔ کبھی بیٹھ جاتے۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ اس وقت رات کے گیارہ کا عمل تھا۔

"مجیب الرحمٰن کو ٹیلی فون پر بلاؤ۔" انہوں نے اے ڈی سی سے کہا۔

"سر! مجیب الرحمٰن۔" اے ڈی سی نے فون ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

خاموشی اور گہری ہو گئی۔ فوجی افسران سانس روکے بیٹھے تھے۔ کسی افسر کی چھڑی بار بار اس کے بوٹوں کو نشانہ مشق بنا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی آواز ایک ردھم پیدا کر رہی تھی۔ "ہیلو۔" جنرل یعقوب کی سخت آواز نے سکوت کو توڑا۔ "آپ کا ایک بیان مجھے موصول ہوا جس میں آپ نے' اپنے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہماری غیر قانونی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور صرف عوامی نمائندوں کو اصل طاقت سمجھیں۔"

"جی ہاں۔ بالکل درست سمجھا آپ نے ۔ ہم مارشل لا کو غیر قانونی حکومت سمجھتے ہیں۔"

"لیکن آپ کو معلوم ہے اس سے کتنا بڑا فساد پھیلے گا۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں' مجھے اس کا علم نہیں؟ لیکن آپ نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ ہم سے وعدہ خلافی کی۔ ہماری نمائندگی کو بوٹوں تلے دبا دیا ہے۔"

"دیکھو مسٹر مجیب' ہم طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں آپ یہ بیان واپس لے لیں۔"

"اب یہ میرے اختیار میں نہیں۔ مجھ پر بہت دباؤ ہے۔"

"تو پھر اس بیان کو نرم کر دیں۔"

"آخر اس میں ایسی کون سی اشتعال انگیز بات ہے۔ یہ تو ایک سیاسی بیان ہے۔"

"پھر تو یہ کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ سیاسی بیان میں تبدیلی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔" جنرل یعقوب نے دلیل دی۔

دوسری جانب خاموشی پھیل گئی جیسے مجیب کچھ سوچ رہا ہو یا کسی سے مشورہ کر رہا ہو۔ "میں نے کہا نا' اب یہ میری اختیار میں نہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے گرفتار کر لیں۔ ابھی فون پر کہہ دیں' میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ ایک ٹیلی فون میں اخبارات کو بھی کروں۔ انہیں روک دوں کہ یہ بیان نہ چھاپیں۔"

"یہ آپ کا فرض ہے لیکن کسی اخبار کی اتنی ہمت نہیں کہ میرا بیان نہ چھاپے۔"

جنرل یعقوب چالیس منٹ تک اس سے محو گفتگو رہے۔ کبھی دلیل دیتے کبھی مصالحانہ رویہ اختیار کرتے۔ ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا لیکن ہر وار خالی' ہر دلیل بے اثر ہو گئی۔ "نہیں مانتا۔ کہتا ہے بیان نرم نہیں کر سکتا۔" جنرل یعقوب نے اس جملے کو بار بار دہرایا جو ان کے ذہنی اضطراب کو ظاہر کر رہا تھا۔ انہوں نے فوراً" تین سینئر افسروں کی میٹنگ بلائی۔ اس میں میجر جنرل خادم حسین راجا' میجر جنرل راؤ فرمان علی اور بریگیڈیر غلام جیلانی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں متفقہ رائے فرمان علی اور بریگیڈیر غلام جلانی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں متفقہ رائے سے یہ طے ہوا کہ مجیب کے انکار کے بعد ایک یہی راستہ کھلا رہ جاتا ہے کہ صوبے بھر میں متعین افواج کو پیشگی اطلاع

ں جائے کہ اس بیان سے نمٹنے کے لیے تیار رہیں۔

فوج تو تیار ہو گئی مگر عوامی لیگ کے کارکن بھی تیار تھے۔ اس بیان پر رد عمل دا اور خوب ہوا۔ مشتعل ہجوم، فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس باہم دست و گریباں ہو گئے۔ پہلے ہی دن ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال اور منٹو روڈ ہسپتال میں ایک و پچپن زخمی داخل ہوئے۔ اگلے دو دن آٹھ مارے گئے۔ ابھی فوج کو شہر میں داخل ہوئے بمشکل دو دن گزرے تھے کہ عوامی لیگ نے فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجنے کا مطالبہ کر دیا۔ عوام کے سامنے ایک اور مطالبہ آ گیا۔ وہ دل و جان سے اس مطالبے کے حق میں سینہ سپر ہو گئے۔ انتظامیہ کو اس مطالبے پر بظاہر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اگر فوج کو چھاؤنی میں بھیج دیا جائے تو شہر میں امن و امان کون بحال رکھے گا۔ اس کی ذمے داری مجیب الرحمٰن لینے پر آمادہ ہو گیا۔ مجیب نے بڑی خوب صورتی سے ایسٹ پاکستان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ فوج کے درمیان سے ہٹتے ہی غیر بنگالیوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ مجیب اپنی سیاسی قلابازیوں کی طرح امن و امان کی ذمے داریوں کے وعدے کو بھی بھلا بیٹھا یا پھر کارکن اتنے بے قابو ہو گئے تھے کہ اس کے قابو میں بھی نہیں رہے تھے۔ اب ہلاکت کی خبریں ڈھاکہ کے علاوہ چٹاگانگ، جیسور، کھلنا، سلہٹ اور رنگ پور سے بھی آنے لگیں۔

وہ سہمے ہوئے پرندے کی طرح اپنے آشیانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کچھ ہونے والا ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا ہو گا، جو ہو رہا ہے۔ شاید اس سے بھی سوا کچھ ہو جائے۔ ٹیلی فون بھی ڈیڈ پڑا ہوا تھا ورنہ وہ افروز کی خیریت تو معلوم کر ہی لیتا۔ سبھاش کی بھی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ وہ اب پروانہ رہائی چاہتا تھا۔ اسے اب اس ملازمت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اب جہنم سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سبھاش اس کی راہ میں مزاحم ہو گا۔ وہ اس قضیئے سے نمٹنے کے لیے سبھاش سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اسے کوئی قدم اٹھانا تھا۔ اسے معلوم تھا، وہ مکڑی کے جس جالے میں پھنس گیا ہے، وہاں افروز سے یا کسی سے بھی لڑکی سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہنوں کی آنکھوں میں بھائیوں کے لیے وہ تجسس نہیں ہوتا جو شوہر کے لئے ہوتا ہے۔ بیوی کی آنکھوں میں مقناطیس

لگا ہوتا ہے جو شوہر کے رازوں کو کھینچ کر قریب کر لیتا ہے۔ وہ ضرور پوچھے گی' کہاں جاتے ہو' کیا کیا کرتے ہو۔ پھر یہ کہ معاہدے کے مطابق وہ پابند تھا کہ اپنی شادی کی اجازت اس سے حاصل کرے یا ملازمت سے علیحدہ ہو جائے۔ نہیں' میں افروز کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ پہلے مجھے سبھاش سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کے خیالوں کو چرا لیا۔ ٹیلی فون تو ڈیڈ پڑا تھا۔ شاید ٹھیک ہو گیا "ہیلو۔" اس نے کہا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ دوسری طرف سبھاش تھا۔

"ٹیلی فون ڈیڈ کیے بیٹھے ہو۔ پہلے تمہارا ٹیلی فون ٹھیک کرایا' اب بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی آپ سے ملنا چاہ رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ آپ ہمارے نہایت ذمے دار کارکن ہیں۔ آپ کو ہدایات کا انتظار رہتا ہے۔"

"یہ بات نہیں' مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"میرے پاس بے کار باتوں کے لیے آج کل وقت نہیں ہے۔ کام کی بات سنو۔"

"جو میں کہنا چاہتا ہوں' وہ بے کار بات نہیں ہے۔ میری زندگی کا سوال ہے۔"

"جو بات میں کہہ رہا ہوں' وہ میری زندگی کا سوال ہے۔" سبھاش کی آواز گونجی۔"

"ہر شخص کو اپنی زندگی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔"

"مجھے انکار نہیں۔ تم یہ کام کردو۔ اس کے بعد تمہاری زندگی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا مگر اس سے پہلے ہرگز نہیں۔"

فرمایئے۔" مجید کی آواز میں شکست کا دکھ شامل تھا۔

"تمہیں ہائی کورٹ کی چیف جسٹس صدیقی کے پاس جانا ہو گا۔"

"حالات آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہم غیر بنگالیوں کے لیے کتنے ناساز گار ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے جو کام تمہارے لیے منتخب کیا ہے اس میں تمہیں عوام سے نہیں' چیف جسٹس سے ملنا ہے جسے اس سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ تم کون ہو۔"

"یہ کام آپ کسی اور سے بھی لے سکتے ہیں۔"

"تمہارے لہجے سے بغاوت کی بو آ رہی ہے۔ بغاوت کی سزا تمہیں معلوم ہے اور تمہارے گھر تو صرف ایک بنگالی بھیجنے کی دیر ہو گی۔ اس لیے کہ تم غیر بنگالی ہو۔"

آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔"

"مشورہ دے رہا ہوں۔ جب تک ہمارے ساتھ ہو' تمہاری جان اور املاک کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ یقین نہ ہو تو باہر نکلو اور اپنے دروازے کو غور سے دیکھو۔"

مجید نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اس وقت اس سے مخالفت مول نہ لے۔

"فرمایئے' مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

"تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ جنرل یعقوب مستعفی ہو گئے ہیں لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ ان کی جگہ لینے کون آ رہا ہے۔ یہ جنرل ٹکا خاں ہیں۔ چیف جسٹس ان سے حلف لیں گے۔ ہم چاہتے ہیں' وہ حلف نہ لیں۔"

کیا اس لیے کہ جنرل یعقوب آپ کے لیے زیادہ موزوں تھے۔"

"نہیں' موزوں تو ٹکا خاں ہی زیادہ ہوں گے۔ وہ سخت گیر مشہور ہیں۔ وہ جتنا ظلم یہاں کریں گے' ہمارا کام اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔"

"پھر آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ حلف نہ اٹھا سکیں؟"

"ہم عوام کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ چیف جسٹس بھی مارشل لا کے احکامات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہوں گے اور اس وقت حوصلے ہی کی ضرورت ہے۔"

"کیا وہ میری بات مان لیں گے؟"

"جان کسے عزیز نہیں ہوتی۔"

"مجھے کب جانا ہے؟"

"یہ ہم بعد میں بتائیں گے۔ اس وقت تک تم گھر سے نہیں نکلو گے۔ ہاں ٹیلی فون استعمال کر سکتے ہو۔ اگر دوبارہ ڈیڈ نہ ہو جائے"

اس نے فون کریڈل پر پٹکا اور بھاگ کر گلی میں آیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا' دروازے

پر کیا لکھا ہے۔ دوروازے پر انگریزی کے حروف A.S کھدے ہوئے تھے۔ ان حروف کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد یہ معما حل ہو گیا۔ عوامی لیگ اور سبھاش۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا ہو رہا ہے مجید بابو۔" اس کے پڑوسی عبدالرحمٰن نے پوچھا جو ابھی گھر سے نکلے تھے۔

"کچھ نہیں۔ دل گھبرا رہا تھا باہر نکل آیا۔"

"ہاں صاحب' آدمی کب تک گھر میں پڑا رہے۔ ویسے آپنے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں؟"

"ممکن ہے کچھ دن بعد ایسٹ پاکستان میں آپ کا رہنا دوبھر ہو جائے۔"

"آپ کے ہوتے مجھے کیا فکر۔" مجید نے تکلفاً کہا۔

"وحشت کی جو ہوا چلی ہے' وہ میری روکے بھی نہیں نہیں رکے گی۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اب بھی وقت ہے' آپ مغربی پاکستان چلے جائیں۔"

"ٹکٹ کیسے ملیں گے۔ اتنی تو پروازیں بھی نہیں ہیں جتنے امید وار ہیں۔ لوگ اپنی زندگی بھر کی کمائی دے کر ڈھائی سو روپے کا ایک ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ ایسے میں میری کون سنے گا۔"

"اتنی مدد میں آپ کی کرسکتا ہوں۔ میرے ایسے تعلقات ہیں' ٹکٹ میں آپ کو لادوں گا"

"مسئلہ اس مکان کا بھی ہے۔"

"اس کی دیکھ بھال میں کر لوں گا۔ کبھی آپ آئے تو آپ کی امانت آپ کو مل جائے گی۔"

"جانے کے بعد کون آتا ہے۔ آپ یہ مکان مجھ سے خرید لیں۔"

"مجید بابو' میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں۔ آپ کا مکان تو بہت شاندار ہے۔"

"آپ کے پاس جتنے پیسے ہوں دے دیجئے گا۔"

"ٹکٹ کب کے لادوں۔" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس کے بعد میں آپ کو بتا دوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"



ڈھاکہ شہر مستقل افواہوں اور خدشوں کی لپیٹ میں تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن رمنا ریس کورس میں جلسہ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ اس جلسے میں بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کریں گے۔ خدشہ یہ تھا کہ اس اعلان پر مسلح افواج خاموش نہیں بیٹھے گی۔ وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری ہو گی۔ دھان منڈی میں مجیب کے گھر شادی کا سماں تھا۔ غیر معمولی روشنیوں میں نہائے ہوئے مہمان مجیب کو مبارکبادیں دے رہے تھے۔ ایک دن بعد مجیب کو آزادی کا اعلان کرنا تھا۔ عوامی لیگ کا انتہا پسند حلقہ خاص طور پر سرگرم تھا اور اس بات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا کہ مجیب اپنا فیصلہ بدل نہ دیں۔

دو آدمی جو کمبل میں لپٹے ہوئے تھے' مکان کی پچھلی دیوار سے باہر کودے اور بھاگتے ہوئے اس گاڑی کے قریب پہنچ گئے جو ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی ہوا ہو گئی۔ ان کا رخ ڈھاکہ چھاؤنی کی طرف تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے کہ میجر جنرل خادم حسین جی او' سی کے گھر کی گھنٹی بجی۔

جنرل صاحب کو اطلاع دی گئی کہ عوامی لیگ کے دو آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں حال یہ تھا کہ اگر عوامی لیگ کی طرف سے ہوا کا جھونکا بھی آ جاتا تو ہزار اندیشے جنم لیتے تھے۔ یہ تو دو آدمی تھے اور رات کے دو بجے آئے تھے۔ ضرور کوئی خاص خبر لائے ہوں گے۔ جنرل نے انہیں اندر بلوایا۔ وہ دونوں بہت جلدی میں تھے۔ آتے ہی انہوں نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ بات ہی ایسی تھی کہ جنرل انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"انتہا پسند عناصر شیخ مجیب پر بے انتہا دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سہ پہر کو آزادی کا یک طرفہ اعلان کر دیں۔ اس وقت بھی وہ انہیں یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب

اب تک ان کے مطالبات ٹالتے رہے ہیں لیکن اب ان میں مزاحمت کی ہمت نہیں رہی۔ انہوں نے درخواست کی ہے کہ فوج انہیں اپنی تحویل میں لے لے۔"

جنرل کو یقین تو تھا کہ بات کوئی غیر معمولی ہے لیکن یہ بات ہو گی ان کے گمان میں بھی نہیں ہوگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے پھر گویا ہوئے۔ آپ آپ مجیب صاحب سے میری طرف سے کہئے گا کہ میں کل رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں موجود ہوں گا اور انہیں یہ بھی بتا دیجئے گا کہ اگر انہوں نے پاکستان کی سلامتی کے خلاف کوئی بات کی تو ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ نہ حکومت کرنے والا کوئی باقی بچے گا نہ حکومت کرنے کے لیے کچھ رہے گا۔ دونوں افرادیوں اٹھ کر چلے گئے جیسے خزانے کا نقشہ مانگنے آئے تھے اور وہ نقشہ انہیں مل گیا۔

7 مارچ کا سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ پاکستان میں متعین امریکی سفیر فار لینڈ مجیب کے گھر داخل ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد امریکی سفیر رخصت ہوا تو مجیب کے قریبی حلقوں میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ اب مجیب آزادی کا اعلان نہیں کر سکیں گے اور وہی ہوا بھی۔ دس لاکھ بپھرے ہوئے انسانوں کا مجمع بنگلہ بندھو مجیب الرحمٰن کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کی ایک آواز پر کٹ مرنے کو تیار تھا۔ مجیب نے تقریر کا آغاز گھن گرج سے کیا لیکن آہستہ آہستہ اس کے اونچے سر کو مل ہوتے چلے گئے۔ مجیب ایک جادوگر تھا کہ جب چاہتا جذبات کو بھڑکا دیتا' جب چاہتا سلگتے ہوئے جذبات پر پانی چھڑک دیتا۔

جلسے کے اختتام پر لوگ اس طرح پرامن طور پر منتشر ہو گئے جیسے عبادت گاہ سے واپس لوٹ رہے ہوں جبکہ مجیب نے اعلان آزادی نہ کر کے ان کے جذبات کو دھچکا پہنچایا تھا۔ یہ بڑی مصیبت تھی جو ٹل گئی ورنہ اس مشتعل ہجوم کو اگر وہ چھاؤنی کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیتا تو کوئی ٹینک انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ اتنے سروں کا فیصلہ چند ہزار گولیوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

مجید کے ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ سبھاش کی افسردہ آواز صاف بتا رہی تھی کہ اسے اس فیصلے سے دکھ پہنچا ہے۔ "میں نے اپنے تمام کارکنوں کو اپنے گھر طلب کیا ہے۔ تم چونکہ میرے حلقہ احباب میں واحد بہاری ہو اور تمہارا یہاں تک پہنچنا مناسب نہیں اس لیے فون پر تمہیں بتا دوں کہ ہماری جنگ اب شروع ہوئی ہے۔ اب سے

کچھ دیر بعد ٹکا خاں ڈھاکہ پہنچنے والے ہیں۔ کل صبح تمہیں چیف جسٹس کے پاس پہنچنا ہے۔ تم خود کو عوامی لیگ کا آدمی کہو گے۔ انہیں دھمکی دو گے کہ اگر انہوں نے ٹکا خان سے حلف لیا تو انہیں زندہ رہنے نہیں دیا جائے گا۔ کل صبح ایک گاڑی آئے گی جو تمہیں لے جائے گی۔ اب تم آرام کرو۔" مجید خلاؤں میں گھورتا رہ گیا۔ ٹیلی فون خاموش تھا بالکل اپنے مقدر کی طرح۔

سینئر فوجی افسران ائرپورٹ پر موجود تھے۔ طیارہ پہنچ چکا تھا۔ جنرل ٹکا خاں نیلے رنگ کے سوٹ میں ہشاش بشاش طیارے سے اترے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد کاروں کا قافلہ روانہ ہوا۔ سب سے آگے سیاہ مرسڈیز کار تھی جس میں ٹکا خاں سوار تھے جن کے کاندھوں پر بہ یک وقت تین ذمے داریاں تھیں۔ مشرقی پاکستان میں متعین افواج کے کمانڈر، مارشل لا ایڈ منسٹریٹر اور گورنر کے عہدے کے لیے انہیں حلف اٹھانا تھا۔

مقررہ وقت پر کار مجید کے دروازے پر پہنچ گئی۔ کار ایسی شاندار تھی کہ چوکیدار کو شک بھی نہیں ہوا۔ اس میں بیٹھا ہوا آدمی شاندار سوٹ پہنے ہوئے تھا، صورت شکل سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا اور پھر بنگالی نہیں بہاری تھا لہٰذا جسٹس صدیقی کو اس سے ملنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مجید ان کے گھر سے باہر آیا تو جسٹس صدیقی فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ ناسازی طبع بتائی۔ مگر اصل وجہ عوامی لیگ کا اثر تھا۔ جسٹس صدیقی کے اس انکار نے بنگالی عوام میں نیا حوصلہ پھونک دیا۔ بنگالی عوام اپنے احتجاج کو مبنی برحق سمجھنے لگے۔ اس انکار سے یہ تاثر بھی ملا کہ انتظامیہ سے لے کر عدلیہ تک عوامی لیگ کا اثر پھیل چکا ہے۔ ان کے اس اقدام کو اتنا سراہا گیا کہ ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن نے باقاعدہ قرار داد پاس کی جس میں اس جرات مندانہ اقدام کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

مجید، افروز کی طرف سے بہت پریشان تھا لیکن وہ اسے اپنی وجہ سے کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ وہ نادانستگی میں عوامی لیگ کا رکن بن چکا تھا۔ ایسا رکن جو اگر مرجائے تو اس کی ذمے داری کوئی قبول نہیں کرتا، اس کا نام کہیں درج نہیں ہوتا۔ سبھاش کا تعلق بھارت سے ہے اور

بھارت، مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے کم سودے پر کبھی تیار نہیں ہو گا۔ سبھاش بھی اس وقت تک ڈھاکہ میں مقیم رہے گا جب تک وہ یہاں موجود ہے۔ میں آزاد نہیں ہو سکتا، میں نے اگر افروز سے شادی کر لی تو کسی نہ کسی دن میرے جرائم اس پر ضرور کھل جائیں گے۔ اب ایک ہی راستہ ہے۔ وہ ہچکچائے بغیر فیصلے پر پہنچ گیا۔ اپنے پڑوسی کی پیشکش پر وہ برابر غور کر رہا تھا۔ یہی وہ محفوظ راستہ تھا جو اسے منزل تک پہنچا سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور پڑوسی کے دروازے پر پہنچ گیا۔

خیریت ہے مجید بابو۔" پڑوسی نے پوچھا۔

"آپ اپنی پیشکش پر قائم ہیں؟"

"کون سے پیشکش پر؟"

"آپ میرا مکان خرید لیں۔ میں مغربی پاکستان جانا چاہتا ہوں۔"

"میں نے کہا نا، میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"مجھے صرف پانچ ٹکٹ چاہییے ہیں۔"

"پانچ ٹکٹ! مگر آپ تو دو ہیں۔"

"تین میرے رشتے دار ہیں جنہیں میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔"

اس کام سے نمٹنے کے بعد اس نے افروز کو ٹیلی فون کیا "تم کچھ دیر کے لیے میرے گھر آ سکتی ہو؟"

"آپ آجائیں۔"

"میری کچھ مجبوری ہے، میں نہیں آ سکتا۔"

"آپ خود سوچیں، کیا میں اکیلی ان حالات میں آ سکتی ہوں۔"

"کچھ بھی کرو۔ تمہارا آنا بہت ضروری ہے۔"

"آپ کہہ رہے ہیں تو میں جان پر کھیل کر آؤں گی۔ مگر اماں سے کیا کہوں۔"

"تمہارے ابو کہاں ہیں؟"

"کل ہی ہسپتال سے گھر آئے ہیں۔"

"ہسپتال کے بہانے سے آ سکتی تھیں مگر اب یہ بہانہ بھی نہیں۔ بہرحال کچھ بھی

رو' مجھ سے فوراً" ملو۔"

"اگر میں کسی سہیلی کو ساتھ لے آؤں؟"

"نہیں تم تنہا آؤ گی بلکہ کسی سے کہو گی بھی نہیں کہ کہاں جا رہی ہو۔"

"کیا مجھے اغوا کرنے کی ٹھان لی ہے؟"

"کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی۔ آج سوچتا ہوں' میرے غلط اصولوں نے کتنا وقت ضائع کر دیا۔ اب تمہارا امتحان ہے۔ یہ وقت بھی ضائع ہو گیا تو ہم ملیں نہ ملیں کسی کو خبر بھی نہیں ہے۔"

"تمہاری افروز تمہیں مایوس نہیں کرے گی۔ میں پہنچ رہی ہوں مجید' میرا انتظار کرنا۔" اس نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

اس نے اپنی مٹھیوں سے اپنا گریبان تھام لیا۔ ہاتھوں سے حوصلہ چھٹ کر دور جا گرا۔ ان چھ مہینوں میں چھ صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ کسی کے لہو سے رنگے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ارمانوں کا لہو انگلیوں پر کب ہوتا ہے لیکن میں قاتل ضرور ہوں۔ سلطانہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔

"کہاں جا رہے ہو بھیا؟" اس نے مجید کی طرف حیران آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو وہ نظم بن کر رہ گیا ہوں جسے عنوان کی تلاش ہو۔ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہا تو تلاش کے سفر پر کون روانہ ہو گا۔ بیٹھے بیٹھے مقدر کی طرح پاؤں بھی سو گئے ہیں۔ سوچتا ہوں گھر سے باہر نکلوں' پاؤں تو سیدھے کر لوں۔"

ننگے پاؤں! جوتے تو پہن لو۔"

اس نے پیروں کی طرف دیکھا پریشانی میں سر بھی ننگا ہو جاتا ہے' پاؤں بھی۔ وہ پریشانی کی مکمل تصویر بنا کھڑا تھا۔

"بھیا مجھ سے کچھ چھپاتے ہو۔ کیا بات ہے۔"

"سنتی نہیں ہو۔ اس سناٹے میں کیسا شور مچا ہوا ہے۔ کوئی گھر ہے جو ماتم کیے بغیر اپنی بنیادوں پر کھڑا ہو؟ ہم بھی تو انہی عزاداروں میں ہیں۔ آگ ہمارے سائبان تک

نہیں پہنچی ہے مگر تپش تو پہنچ رہی ہے۔ میں کیا' ان تاریخوں میں جو دن آ رہے ہیں وہ بھی پریشان ہوں گے۔ میری طرح ان کے پاؤں بھی ننگے ہوں گے۔"

سلطانہ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس کے بھائی نے آج پہلی مرتبہ بولنا سیکھا ہو۔ حالات کی سنگینی کا اسے بھی احساس تھا۔ وہ گھر میں بند ضرور تھی مگر اس کے کان تو کھلے ہوئے تھے۔ اب جو بھائی کے زخم کھلے ہوئے دیکھے تو سر سے چادر اتر گئی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ دھوپ کمرے تک آ گئی ہے۔ اس نے دھوپ سے نظریں بچا کر مجید کی طرف دیکھا مگر وہ جا چکا تھا۔ وہ بے چینی سے گلی میں ٹہل رہا تھا۔ انتظار ہو تو لمحے سال بن جاتے ہیں۔ وہ گھر کی دیوار میں لگی ساری اینٹیں گن چکا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک ایک اینٹ کو سجدے کیے۔ بہت دیر تک دروازے کی چوکھٹ پکڑے کھڑا رہا۔ اسی چوکھٹ سے ہو کر وہ کئی مرتبہ اپنے باپ کی گود میں یہاں سے گزرا تھا۔ انہیں گلیوں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کی بہن انہی گلیوں میں گھٹنوں کے بل چلتی رہی تھی۔ اب یہی گلی اسے بہاری کہہ کر دھتکار رہی تھی۔ وہ کل نہیں تو پرسوں یہاں سے چلا جائے گا۔ شاید پھر کبھی نہ آ سکے۔ آیا بھی تو ان دیواروں پر اس کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ اس کی سوچ بھی اب اس کی نہیں رہی تھی۔ کبھی سبھاش اس کی تنہائی پر چھاپا مار دیتا تھا' اب افروز آ گئی۔

"کیا قد ناپ رہے ہیں۔" افرور نے اسے چوکھٹ سے لگے کھڑے دیکھ کر کہا۔

"آؤ اندر آ جاؤ۔" مجید نے یوں گھبراتے ہوئے کہا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ سلطانہ تو اسے دیکھ کر اس طرح خوشی سے اچھلی جیسے اس کا بھائی افروز کو دلہن بنا کر گھر لایا ہو۔

"سلطانہ! افروز کو میں نے ایک ضروری بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"ظاہر ہے' اتنی دور سے بلایا ہے تو کوئی ضروری بات کرنی ہو گی۔ بڑوں کی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔"

"اچھا بڑی بی۔ ضرورت پڑی تو بلا لیں گے۔" مجید نے افروز کو اشارہ کیا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

"مجھے اس کی فکر کھائے جاتی ہے۔ اب تو بھاگنے والے بھی مارے جاتے ہیں۔

یہ بے چاری تو اپنے پیروں پر چل بھی نہیں سکتی۔ خیر چھوڑو۔ اس وقت تو وہ سنو جس کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ شاید وہ رات آ گئی ہے جس کی سحر کہیں اور ہوتی ہے۔ میں نے یہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

"کہاں جانے کا؟"

"ڈھاکہ سے اور کہاں سے۔ میں مغربی پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

"بس' یہی کہنے کو بلایا تھا؟"

"نہیں' یہ کہنا کو بلایا تھا کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔"

"سچ!" خوشی سے اس کی آواز کانپ گئی لیکن فوراً" ہی وہ خزاں کے پھولوں کی طرح مرجھا کر رہ گئی۔

"مگر میں آپ کے ساتھ کیسے جا سکوں گی۔"

"میرے ساتھ نہیں' تم اپنے ابو امی کے ساتھ جاؤ گی۔"

"میں سمجھی نہیں۔ آپ پہلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔ صاف صاف بتائیں بات کیا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میں نے پانچ ٹکٹ منگوائے ہیں۔ تین تمہارے' دو میرے۔"

"یہ بات آپ کو ابو سے کرنا تھی' نہ کہ مجھ سے۔ آپ نے وہ حق حاصل ہی کہاں کیا کہ امی ابو کے بغیر بھی آپ مجھے لے جا سکتے ہیں۔"

"پاگل مت بنو۔ اب وہ حق حاصل کرنے کا وقت نکل چکا۔ حالات اتنے نازک ہوتے جا رہے ہیں کہ پھر فرار کے راستے بھی بند ہو جائیں گے۔ ہم بہ حفاظت مغربی پاکستان پہنچ جائیں' پھر میں یہ حق بھی حاصل کر لوں گا۔"

پھر بھی آپ ابو سے بات کریں۔ میرا کیا ہے' میں تو اب بھی وہیں رہتی ہوں جہاں آپ رہتے ہیں۔ آپ یہاں سے چلے گئے تو میں بھی خیالوں کے اڑن کھٹولے پر آپ کے پڑوس میں کہیں جا اتروں گی۔"

"اگر فرض کیجئے وہ تیار نہیں ہوئے۔" افروز نے کہا۔

"پھر میں ان سے اجازت نہیں' تمہیں مانگوں گا۔ یہ نکاح اگر ائرپورٹ پر بھی ہوا تو بھی تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"جانے سے پہلے ہی مجھے کیوں نہیں مانگ لیتے۔"

"اس لیے کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر ساتھ چلنے پر بھی رضا مند نہیں ہوں گے۔"

"میں ان کے انکار کے باوجود آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"دیوانی مت بنو۔ کل تک میرا انتظار کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب دونوں کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

"بھیا! میری ضرورت پڑی کہ نہیں؟" سلطانہ نے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ سلطانہ۔"

سلطانہ اپنی وھیل چیئر گھسیٹتی ہوئی اندر آ گئی۔ "میں نے چائے بنا دی ہے۔ بھیا تم جا کر لے آؤ۔ میں افروز سے باتیں کروں گی۔" جتنی دیر میں مجید چائے لے کر آتا' اتنی دیر میں سلطانہ نے ڈھیر ساری باتیں کر لیں۔ باتیں کیا تھیں' مجید کی تعریفوں کے قصیدے تھے۔ افروز بیٹھی سنتی رہی۔ مجید کی تعریفیں اس سے زیادہ کون کر سکتا تھا مگر اس وقت تو وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

"سلطانہ' مجھے تم سے بھی بات کرنی تھی۔" مجید نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

سلطانہ کو یقین تھا کہ یہ بات یقیناً" افروز سے متعلق ہو گی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ابھر آئی۔ لیکن بات کچھ اور تھی۔ "سلطانہ بہت جلد ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ میں چاہتا ہوں' تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ بلکہ ضروری سامان بھی باندھ کر تیار رکھو۔"

نہیں بھیا' میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میری امی کا گھر ہے۔ تمہیں کیا معلوم' امی ہر وقت یہاں رہتی ہیں۔ میں کبھی تنہا نہیں رہتی۔ کیا خبر نیا گھر انہیں معلوم ہو کہ نہ ہو۔"

"پگلی' ہم ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں حالات ٹھیک ہوتے ہی پھر آجائیں گے۔"

"حالات کو کیا ہوا۔ ٹھیک تو ہیں حالات اور پھر مجھ معذور سے کسی کو کیا دشمنی۔

ایک کونے میں تو پڑی ہوئی ہوں۔ اس شہر کی کتنی جگہ گھیر لوں گی۔ ہمارے پڑوسی اتنے اچھے ہیں' ہم پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔"

"تمہیں نہیں معلوم سلطانہ' تم گھر کے اندر رہتی ہو۔ اب اس زمین کو ہمارا وجود برداشت نہیں ہو گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن بس میں نہیں جاؤں گی۔"

"میرے بغیر رہ لو گی؟"

"تم بھی مت جاؤ بھیا۔"

"میری جان کو خطرہ ہے۔"

"تم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"کسی نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا مگر جب آندھی آتی ہے تو درختوں کا انتخاب نہیں کرتی۔ ہمارا گناہ یہ ہے کہ ہم بہاری ہیں۔ نہ تم اس داغ کو دھو سکتی ہو نہ میں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔"

سوال یہ تھا کہ اس کا بھائی کس خطرے میں ہے۔ زبان سے پھر بھی کچھ نہ کہہ سکی' سر جھکا لیا۔ اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ "افروز اور ان کے گھر والے بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔" مجید نے کچھ دیر کے توقف کے بعد کہا۔

سلطانہ نے گردن اٹھا کر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ تھرتھرائے اور پھر ایک ہنسی پھیل گی۔ جیسے چپکے سے ویرانے میں بہار آ جائے۔ "ایک شرط پہ جاؤں گی۔"

"آج تک وہ کون سی تمہاری خواہش ہے جو میں نے پوری نہیں کی ہے۔"

"مجھ سے وعدہ کرو کہ افروز کو میری بھابھی بناؤ گے۔"

"یہ کام تمہارا ہے۔ زندگی جب بھی کسی ڈگر پر آجائے' تم انہیں تیار کر لینا۔ میں تیار ہوں۔"

"اچھا' اب میں چلوں۔"

"آؤ' میں تمہیں دروازے تک چھوڑ آؤں۔"

"دروازے تک کیوں۔ آپ مجھے گھر تک چھوڑ کر آئیں۔"

"نہیں' آج میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ہاں' کل ضرور آؤں گا۔ مجھے
افسوس ہے کہ تم اکیلی آئی تھی اور اکیلے ہی جانا پڑے گا۔"
افروز ابھی گلی سے باہر بھی نہیں نکلی ہو گی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چو
دیا۔ "ہیلو' مجید بول رہا ہوں۔"
"سبھاش بات کر رہا ہوں۔ وہ لڑکی گئی؟"
"کون لڑکی؟" مجید سٹپٹا گیا۔
"سنا ہے تم ڈھاکہ چھوڑ رہے ہو۔"
"کس نے کہہ دیا آپ سے۔"
"جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو۔"
"کس نے آپ سے غلط کہا ہے۔" مجید بہ مشکل کہہ سکا۔
"جو تمہارا مکان خرید رہا ہے' کیا وہ بھی غلط کہہ رہا ہے۔"
مجید نے سانس اس کے سینے ہی میں کہیں رک کر رہ گئی۔ اس نے پڑوسی کی
دیوار کو بڑے غور سے دیکھا۔ تو کیا عبدالرحمٰن بھی سبھاش کا آدمی ہے۔ "اس نے خو
مجھے پیش کش کی تھی۔"
"وہ اگر یہ پیشکش کرتا کہ سبھاش کو مار آؤ تو تم شاید اس سے بھی گریز نہیں
کرتے۔"
"نہیں سر' یہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ تو میرے محسن ہیں۔"
"میں نے تم سے کہا تھا' میرے علم میں لائے بغیر تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ ؟
صوبہ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔"
"میں آپ سے پوچھنے ہی والا تھا۔"
"بکواس بند کرو۔ میں نے سوچا تھا' میں خود تمہیں بہ حفاظت یہاں سے نکال
دوں گا مگر اب نہیں۔ اب تم ایک مشن پر چٹاگانگ جاؤ گے۔"
"میری بہن معذور ہے مسٹر سبھاش۔"
"اس کی حفاظت ہم کریں گے۔"
"اسے حفاظت سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہے جو صرف میں کر سکتا ہوں

میں، اس سے کہیں اور جانے کے لیے کہہ چکا ہوں۔ میں چٹاگانگ نہیں جا سکتا۔" مجید کے لہجے سے شوریدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

"سوچ لو۔ حفاظت کا نشان تمہارے دروازے پر لگا ہوا ہے، افروز کے مکان پر نہیں۔"

"ہندو کی اولاد۔ میں چٹاگانگ نہیں جاؤں گا۔"

"یہ تو کوئی گالی نہیں ہوئی۔ میں تو ہوں ہی ہندو کی اولاد لیکن اتنا سمجھ لو۔ تمہیں کا اپنی بہن بہت عزیز ہے نا۔"

یہ سبھاش سے اس کا آخری مکالمہ تھا۔ اس نے بات ختم ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور ٹیلی فون کا چونگا دیوار سے دے مارا۔

"کس کا فون تھا، بھیا۔"

"اسی حرام زادے، ہندوں کی اولاد کا۔"

"کس کا؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔"

اس سے پہلے سلطانہ نے اسے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی اسے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ اس کی ماں کہتی تھی جب کسی کو غصہ آ جائے تو اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے۔ تنہائی میں غصہ کم ہو جاتا ہے۔ "میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔" اس نے کہا اور وھیل چیئر گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"نہیں چاہیے پانی مجھے، میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" سلطانہ نے اس کی آواز کمرے سے باہر آ کر سنی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کس پر غصہ اتار رہا ہے۔ غصہ اتر جائے گا پوچھ لوں گی۔ دل بہلانے کے لیے اس نے رسالہ ہاتھ میں لے لیا اور وھیل چیئر سے بستر پر آ گئی۔

مجید کا ذہن تیزی سے حرکت کر رہا تھا لیکن غصہ اتنا تھا کہ خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا نادانی کر بیٹھا ہے۔ سبھاش خاموش بیٹھنے والا نہیں ہے۔ بھرپور وار کرے گا۔ جوں جوں غصہ اتر رہا تھا اسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اپنا ردعمل ظاہر نہ کرتا۔ اس کی

ہاں میں ہاں ملاتا اور پھر خاموشی سے وہ کرتا جو چاہتا۔ کرنا تو پھر بھی وہی پڑتا جواب کرنا ہے۔ اس نے سوچا لیکن تیاری کے لیے کچھ وقت تو مل جاتا۔ اس نے خود کو قائل کیا۔ اسی ادھیڑبن میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ اندھیرے میں اندھیرا بنا بیٹھا تھا۔ سلطانہ کئی مرتبہ اسے دیکھ کر واپس چلی گئی تھی۔ مجید نے اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے لیے کئی پروگرام طے کیے اور کوئی نہ کوئی خامی دیکھ کر اسے رد کرتا رہا۔ فرار کا ہر راستہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ اپنے پڑوسی کو قتل کر دے پھر اس نے سوچا سبھاش ہی کو کیوں نہ ٹھکانے لگا دے۔ یہ بھی خیال آیا کہ سبھاش سے معافی مانگ کر اس کی ہدایت کے مطابق چٹاگانگ چلا جائے لیکن اس کے دل میں نفرت کا الاؤ اس شدت سے دہک رہا تھا کہ اب وہ سبھاش کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے خود پر کئی مرتبہ لعنت بھیجی۔ سبھاش میری خوشیوں کا قاتل ہے۔ اب جبکہ افروز مجھے ملنے والی تھی' وہ پھر راستے میں آگیا۔ اب میں اس کا آلہ کار نہیں بن سکتا۔ اگر اس کے ہاتھوں مارا بھی گیا تو میرے گناہوں کا کفارہ تو ادا ہو جائے گا۔ اسے اچانک افروز کا خیال آ گیا۔ کہیں میرا کفارہ اسے ادا نہ کرنا پڑے۔ میں نے کل اس کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا خبر کل کا سورج طلوع ہوتے ہوئے میں دیکھ بھی سکوں یا نہیں۔ اسے بتا تو آؤں کہ میں جھوٹا نہیں مجبور ہوں۔ میں اسے بتا تو دوں کہ وہ میرا انتظار کرنا چھوڑ دے۔ مجھے کیا کرنا ہے' یہ میں بعد میں سوچوں گا۔ پہلے اس سے مل آؤں۔ یہ وقت مناسب ہے۔ رات کا اندھیرا میری حفاظت کرے گا۔ ٹیلی فون پھر ڈیڈ ہو گیا تھا ورنہ اس کا کام آسان ہو جاتا۔

اس نے کمرے سے باہر جھانکا۔ سلطانہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے کوئی بچی خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی ہو۔ یہ موقع اس کے لیے غنیمت تھا۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو شاید اسے باہر نہ نکلنے دیتی۔ اس نے ایک بڑی چادر میں خود کو لپٹا' ایک نگاہ سوئی ہوئی سلطانہ پر ڈالی اور جھپاک سے صحن پار کر کے دروازے میں آگیا۔ گلی میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا البتہ سڑک پر روشنی تھی۔ اس نے گلی میں جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی اس کی نگرانی پر تو متعین نہیں ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی آنکھ اس کے تعاقب

ہیں نہیں' اس نے اندھیرے میں پاؤں رکھ دیا۔ ہو سکا تو وہ افروز اور اس کے گھر والوں کو چھاؤنی پہنچا دے گا۔ بعد میں سلطانہ کو لے کر خود بھی وہاں پہنچ جائے گا۔ وہ انہی خیالوں کی روشنی میں سڑک تک آ گیا۔ جسے آج کل کہیں پناہ نہیں ہے وہ چھاؤنی میں پناہ لے رہا ہے۔ چھاؤنی میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں پانچ دس افراد پناہ گزیں نہ ہوں۔ سڑک پر سناٹے کا راج تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا' دن بھر کا تھکا ہوا شہر کل کے ہنگاموں کے لیے تازہ دم ہونے کو سو گیا ہے۔ ان دنوں ہنگامے کوئی نئی بات نہیں تھے۔ مجیب نے اشتعال انگیزی کے لیے عجیب و غریب ہدایات جاری کی تھیں۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت تھی۔ مقامی ٹھیکے داروں کو حکم دیا تھا کہ راشن سپلائی نہ کریں۔ یہ بھی حکم تھا کہ جو فوجی نظر آئے اسے گالیوں کا نشانہ بنایا جائے۔ اس وقت وہ ایک بینک کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ چند فوجی وہاں پہرا دے رہے تھے۔ گالیاں دینے والی زبانیں اس وقت خاموش تھیں۔ اس لیے یہ وقت یقیناً ان فوجیوں کے لیے اطمینان بخش ہو گا کہ اچانک انہیں سیاہ چادر میں چھپا ایک سایہ نظر آیا۔

"ہالٹ۔" کسی فوجی نے اسے للکارا اور وہ رک گیا۔ "کون ہو تم۔ ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ "کہاں جا رہے ہو۔"

"میں بہاری ہوں۔ میرا ایک دوست بہت بیمار ہے۔ اس کا فون آیا تھا۔ اس کی مدد کے لیے جانا پڑ رہا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں اس وقت گھر سے نکل کر کون اپنی جان کو خطرے میں ڈالے گا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ راستے میں جگہ جگہ اسے وردی والے ملتے رہے۔ سوال و جواب کی منزل سے گزرتا ہوا وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ شور کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم تیز ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندی۔ کسی کے گھر کو آگ لگائی گئی تھی۔ اس نے آگ کے اجالے میں افروز کا گھر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کا گھر کہیں گم ہو گیا تھا۔ جس گھر میں آگ لگی ہے' یہی تو اس کا گھر ہے۔ اس کے حافظے نے اس کی رہنمائی کی۔ گھر

کے سامنے ہجوم لگا ہوا تھا۔ راستے میں جو شور اس نے سنا تھا اسی مجمع کی چیخ پکار کی آوازیں تھیں۔ کچھ نوجوان پانی کی بالٹیوں سے آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھے' باقی صرف تماشا دیکھ رہے تھے اور چلا رہے تھے۔

"شکر ہے گھر خالی تھا۔ شام ہی کو ضمیر محمد صاحب اپنی فیملی کو لے کر کہیں گئے تھے۔"

"نہیں صاحب وہ گھر ہی میں ہیں۔ میں نے خود ایک گھنٹا پہلے انہیں گلی میں ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ سچ عرض کر رہا ہوں' میں نے ان سے ملاقات بھی کی تھی۔ کہہ رہے تھے افروز اپنی سہیلی کے گھر گئی ہے اب تک واپس نہیں آئی' اس کی طرف سے پریشان ہوں۔"

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کیا مطلب ہم کہہ ہی ٹھیک رہے ہیں۔" وہ دونوں کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے آپس میں الجھ رہے تھے۔

"آپ لوگ بحث کیا کر رہے ہیں۔ جب لوگ اندر ہیں تو آپ لوگ ان کی مدد کیوں نہیں کرتے۔"

"آگ دیکھ رہے ہو؟ کون کود سکتا ہے اس میں ٹیلی فون کیا ہے' دیکھو فائر بریگیڈ والے کب آتے ہیں۔"

مجید' ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ لوگ چیختے رہ گئے اور وہ آگ میں گم ہو گیا۔ گھر کا نقشہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن آگ اتنی پھیل چکی تھی کہ دھوئیں اور تپش نے دیواریں سی کھڑی کر دی تھیں۔ جس کے پار دیکھنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس نے کئی بار قدم اٹھائے اور پاؤں پیچھے رکھ لیے۔ اسے یاد آیا جہاں وہ اس وقت کھڑا ہے اس کے بائیں جانب افروز کا کمرا ہے۔ اب اسے خود پر قابو پانے کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے جذبے کی ایک ٹھوکر سے آگ کی دیوار کو گرا دیا۔ دھوئیں کی چادر چاک ہو گئی۔ اس نے دیوانوں کی طرح افروز کو آوازیں دیں لیکن جواب میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ایک کونے میں افروز کے سینڈل پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پر اس کی شوخ مسکراہٹ والی تصویر ابھی تک صحیح سلامت لٹکی ہوئی تھی۔ مگر افروز کہاں ہے۔

اب پورے کمرے میں آگ پھیل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ آگ' افروز کی تصویر کو پہنچتی اس نے تصویر اتاری اور آنکھیں بند کر کے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آگ میں گر گئی۔

وہ اب ڈرائنگ روم میں تھا۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں وہ افروز کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ یہاں افروز نے اظہار عشق کیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ مگر وہ ہے کہاں۔ اس کے کپڑوں نے آگ پکڑلی تھی مگر اب وہ اس آگ کو بجھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس میں تو اب اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارتا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔ اس نے سامنے لٹکے ہوئے کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ "نرس' آج کیا تاریخ ہے۔"

"18مارچ۔"

"میں یہاں کب آیا تھا۔"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔"

"آٹھ دن!" اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نقاہت اتنی تھی کہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھا۔ نرس نے دوبارہ لٹا دیا۔

"کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو۔ آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش آیا ہے۔ تمہاری دونوں ٹانگیں جھلس گئی ہیں۔ شکر کرو زخم گہرے نہیں ہیں لیکن پھر بھی کچھ وقت تو لگے گا۔"

"نرس' تمہیں معلوم ہے میری ایک معذور بہن ہے۔ وہ چل پھر بھی نہیں سکتی۔ وہ مجھے ڈھونڈنے بھی نہیں نکل سکتی۔ آٹھ دن سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اسے تو بھوک بہت لگتی ہے۔ میرے بغیر کچھ کھاتی بھی نہیں ہے۔ کیا گزر رہی ہو گی اس پر۔ کیا اب بھی تم مجھے نہیں جانے دو گی؟"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن چھٹی دینا میرا کام نہیں۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں مگر خبردار بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ہر وارڈ کے سامنے پولیس موجود ہے کیونکہ آج کل ہسپتالوں پر بھی حملے ہو رہے ہیں۔" اس نے وارننگ دی اور ڈاکٹر کو بلانے

چلی گئی۔ مجید نے چادر ہٹا کر اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ اگر میں اٹھ کر بھاگوں بھی تو بھاگوں گا کیسے۔ شاید ابھی تو میں چل بھی نہ سکوں۔ اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی۔ درد کی ایک لہر اس کے سارے بدن میں پھیل گئی۔ مگر یہ ہوا کیسے آگ کے شعلے اس کے بستر پر پھیل گئے۔ وہ انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اسے افروز یاد آ گئی۔ جسے میں ہمیشہ جلاتا رہا' کیا وہ ہمیشہ کے لیے جل گئی۔ اس نے زور سے آواز دی' افروز! اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ جب بھی ہوش میں آتا' زور زور سے افروز کو پکارتا اور بے ہوش ہو جاتا۔ چار دن اور گزر گئے۔

اس دوران حالات اتنی سرعت سے تبدیل ہوئے تھے کہ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو ان میں سے کئی کہانیوں کے پیچھے وہ خود ہوتا۔ یحییٰ خان اور بھٹو' مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے جا چکے تھے۔ مجیب سے مذاکرات ہوئے تھے مگر ناکام ہو چکے تھے۔ مجیب الرحمٰن نے فوج سے لڑنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ اس کی پرائیویٹ فوج میں سابق فوجی' عوامی لیگ کے رضاکار اور یونیورسٹی کے طالب علم شامل تھے۔ اس فورس کو تربیت دینے کے لیے مجیب کے پاس کرنل (ریٹائرڈ) ایم اے جی عثمانی موجود تھے۔ یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیاں نصاب کی کتابیں پڑھنے کی بجائے سائنس لیبارٹریوں میں دستی بم بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کرنل عثمانی کا منصوبہ یہ تھا کہ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی بندر گاہ پر قبضہ کر کے مشرقی پاکستان میں داخلے کی راہیں مسدود کر دی جائیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کو مرکز بنا کر شہر کو کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ بدترین حالات کے لیے تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ تعطل کے اس موسم میں 23 مارچ کا سورج طلوع ہوا تو عزائم کھل کر سامنے آ گئے۔ اس روز ڈھاکہ میں کچھ اور ہی منظر تھا۔ عوامی لیگ کے کارکنوں نے قومی پرچم جلا ڈالا' قائداعظم کی تصویر پھاڑ ڈالی اور ان کا پتلا نذر آتش کیا۔ آزاد بنگلا دیش کے سبز اور قرمزی پرچم جگہ جگہ لہرا رہے تھے۔ مجیب الرحمٰن کی تصاویر آویزاں تھیں اور ریڈیو سے ٹیگور کا مشہور نغمہ "ساز بنگلہ" قومی ترانے کے طور پر نشر کیا گیا۔

مجید ان سب حالات سے بے خبر ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے ہی افروز اس کے حواس پر چھا جاتی' آگ کے شعلے اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کی چیخیں ہسپتال کو سر پر اٹھا لیتیں۔ اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا

جاتا۔ یہ طے ہوا کہ اسے نفسیاتی علاج کے لیے نفسیاتی وارڈ میں ڈال دیا جائے۔ اس کے بال مونڈھ دیے گئے تھے۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت پپڑی جمی رہتی۔ مسلسل ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی تھی۔ اب اگر سلطانہ بھی اسے دیکھ لیتی تو پہچاننے سے قاصر رہتی۔ ہسپتال کے گھٹے ہوئے ماحول سے دور' سڑکوں پر بنگالی نوجوان شہر کی سڑکوں پر "جے بنگلہ کے نعرے لگاتے' دندناتے پھر رہے تھے۔

مجید الرحمٰن نے نئی تجاویز پیش کر دی تھیں۔ اس نے دو دستوری کمیٹیوں کی بجائے دو دستوری کنونشن بنانے پر اصرار کیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے دو علیحدہ علیحدہ آئین مرتب کیے جائیں اور پھر ان وساتیر کو الحاق پاکستان یا کنفیڈریشن کے لیے بنیاد بنایا جائے۔ اسی روز بھٹو اور یحییٰ کے درمیان ملاقات ہوئی اور انہوں نے طے کیا کہ عوامی لیگ کی خود مختاری رفتہ رفتہ پاکستان کی آئینی شکست و ریخت تک پہنچ گئی ہے۔ لہٰذا قومی سلامتی اور بقا کے لیے ضروری کاروائی کا وقت آ گیا ہے۔ تاثر یہی دیا گیا کہ مذاکرات کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں لیکن کھڑکیاں' دروازے سب بند ہو چکے تھے۔ سیاسی پرندے خطرے کی بو سونگھ کر مغربی پاکستان کی طرف پرواز کر گئے۔

یہ اک اشارہ ہے آفات ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

مذاکرات کا ڈراما جاری تھا جبکہ بڑے پرندے یحییٰ خاں ڈھاکہ سے اڑنے کی تیاری کر چکے تھے لیکن ان کی روانگی کو خفیہ رکھا جا رہا تھا تاکہ مذاکرات کے دروازے کھلے رہنے کا اثر ملتا رہے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ صدر یحیی چائے پینے کے بہانے ایوان صدر سے چھاؤنی میں واقع فلیگ اسٹاف ہاؤس تشریف لے گئے۔ جہاں سے دراصل انہیں ائرپورٹ روانہ ہونا تھا لیکن مکمل راز داری کے ساتھ۔ کار پر قومی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کے آگے پیچھے چار ستاروں والی پلیٹیں لگی تھیں جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اندر یحییٰ خاں بیٹھے ہیں۔ دراصل اس کار میں بریگیڈیر رفیق بیٹھے تھے۔ جن کا بھرا بھرا چہرہ اور سرخ و سپید رنگ جنرل یحییٰ سے ملتا جلتا تھا۔ اس کار کا رخ شہر کی

طرف تھا۔ ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ صدر صاحب ایوان صدر چلے گئے جبکہ صدر صاحب اس وقت چھاؤنی میں موجود تھے۔

شام 7 بجے جب جنرل یحییٰ خاں پی اے ایف گیٹ سے ہوائی اڈے پہنچے تو مجیب کے جاسوسوں سے ان کی روانگی چھپی نہ رہ سکی۔ بنگالی ونگ کمانڈر خوند کر اپنے دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ ٹیلی فون اٹھایا۔ ”سر! یحییٰ خاں ڈھاکہ چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔“

”کیا مطلب!“

”میں اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یحییٰ طیارے میں سوار ہو چکا ہے اور اب اڑنے ہی والا ہے۔“

”تھینک یو بریگیڈیر۔“

مجیب الرحمٰن کے جاسوس جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ فوج کے بنگالی یونٹوں میں بھی ایسے جاسوس موجود تھے جو بظاہر فوجی ڈسپلن کے پابند نظر آتے تھے لیکن خبریں باہر پہنچانے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ صدر کا طیارہ زمین سے بلند ہوا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسا طویل اندھیرا کہ جس کی قسمت میں سحر نہیں تھی۔ صدر کے رخصت ہوتے ہی ان کی ہدایات پر عمل در آمد شروع ہو گیا۔ اب تک جس منصوبے پر کام ہو رہا تھا اس کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ بنگالی عوام ہمارے ساتھ ہیں اور صرف چند سر پھروں سے نبٹنا ہے لیکن حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ ایسے کسی تعاون کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اب ایک ایسے منصوبے کی ضرورت تھی جو مجیب کی غیر قانونی حکومت کو ”آناً فاناً“ ختم کر سکے۔ یہ منصوبہ دراصل صدر کی موجودگی ہی میں تیار ہو گیا تھا صرف مذاکرات کے نتائج کا انتظار تھا۔ یہ دروازے بند ہوتے ہی منصوبہ باہر نکل آیا۔ اس منصوبے کو آپریشن سرچ لائٹ کا نام دیا گیا تھا۔ اس منصوبے میں بنگالی یونٹوں کو غیر مسلح کرنے اور مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرنے کا ذکر خاص طور پر کیا گیا تھا۔

☆○☆

آج وہ پندرہ دن بعد ہسپتال کی قید سے رہا ہوا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اب بھی ٹھیک نہیں تھی لیکن اب اس کے اعصاب میں اتنی قوت آ گئی تھی کہ جب افروز کے گھر روشن ہونے والی آگ کا خیال آتا تھا اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگتے تھے لیکن اب وہ بے ہوش نہیں ہوتا تھا۔ زخم بھی ٹھیک ہو گئے تھے۔ ہسپتال میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اسے مزید آرام کے لیے یہاں پڑا رہنے دیا جاتا اور پھر ایسا لاوارث مریض جس سے آج تک کوئی ملنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے کہنے پر اس کے گھر ٹیلی فون ضرور کیا گیا تھا لیکن اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس تو پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں تھے۔ ہسپتال کے کپڑے ہسپتال ہی چھوڑ کر جانا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی مدد سے اسے ایک جوڑی کپڑے اور چند روپے مل گئے تھے۔ پندرہ دن بعد اس نے ہسپتال ہی میں غسل بھی کیا تھا۔

ہسپتال سے باہر نکل کر اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے اور اپنے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں بعد ڈھاکہ آیا ہو۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن سب کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ وہ یوں بے خوف ہو کر سڑک پر چل رہا تھا جیسے اس شہر کے آداب سے واقف نہ ہو۔ بہاری اپنے گھروں میں سمٹی بیٹھی تھی۔ مگر وہ حالات سے بے خبر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرا۔ سلطانہ کو داڑھی اچھی لگتی تھی۔ اب تو پوری داڑھی ہو گئی ہے۔ وہ یہی سمجھے گی رکھ رہا ہوں۔ کتنی خوش ہو گی مجھے دیکھ کر۔ پندرہ دن اس نے کیسے گزارے ہوں گے۔ وہ تو ایک دن بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ پندرہ دن اس نے کیسے کاٹے ہوں گے۔ گھر میں راشن تو تھا۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہو گی۔ محلے والوں نے بھی کچھ نہ کچھ تو خیال رکھا ہو گا۔ وہ اپنے آپ کو سہارا دے رہا تھا مگر پھر بھی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات اس کے دل میں طوفان پیدا کر رہے تھے۔ وہ اس طوفان کی لہروں سے کھیلتا ہوا اپنے دروازے پر پہنچ گیا۔ ابھی وہ بیل بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دینے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دروازے پر لگے ہوئے تالے سے ٹکرائی۔ کہاں جا سکتی ہے وہ۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کئی اور گھروں پر بھی تالے ہیں۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی عبدالرحمٰن کے دروازے کو دیوانوں کی طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

"کون ہے بھائی' کیا دروازہ توڑ دو گے۔"

اس آواز کو پہچاننا اس کے لیے دشوار نہیں تھا۔ یہ عبدالرحمٰن کی بیوی کی آواز تھی جسے وہ بھابھی کہتا تھا۔ وہ اس سے پردہ بھی نہیں کرتی اس لیے اسے امید تھی کہ اندر بیٹھ کر آرام سے باتیں کرے گا۔ "بھابی' میں ہوں مجید۔"

"کون مجید؟ ہم کسی مجید کو نہیں جانتے۔"

"میں ہوں سلطانہ کا بھائی۔"

"اچھا' سلطانہ کے بھائی مجید۔ تم لوگ تو مغربی پاکستان چلے گئے تھے۔"

"بھابھی' دروازہ تو کھولیے۔ مجھ پر جو کچھ گزر گئی تفصیل سے بتانے کی بات ہے۔"

"ابھی عبدالرحمٰن گھر پر نہیں ہیں۔ جب وہ آجائیں اس وقت آنا۔" اس نے کہا اور آدھا دروازہ جو کھولا تھا وہ بھی بند کر دیا۔ مجید کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہی اس عورت نے کہا ہے۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا تو میں غلط مکان پر آگیا ہوں۔ یا اس نے مجھے پہنچانا نہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مکان کی طرف غور سے دیکھا۔ مکان تو وہی ہے۔ شاید بھابھی مجھے پہچانی نہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر دستک دی۔

"کیا ہے۔ کیا اب ہٹ کر جاؤ گے یہاں سے۔" عبدالرحمٰن کی بیوی نے اسے اندر ہی سے ڈانٹا۔

"مجھے شوق نہیں ہے اندر آنے کا۔ مجھے تو صرف یہ بتا دو' میری بہن سلطانہ کہاں ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"ہمیں کیا خبر کہاں ہے۔ تمہارے ساتھ گئی تھی' تم ہی کہیں چھوڑ کر آئے ہو گے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ خدا کے لیے بتا دو کہاں ہے وہ۔ اگر وہ مر گئی ہے تو

یہی بتادو۔ جہاں اتنے لوگ مر رہے ہیں ایک وہ بھی سہی' مجھے صبر تو آجائے گا۔"

"ہم نے کہا نا ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ کوئی اور دروازہ دیکھو۔" اب اسے خطرے کی بو آنے لگی۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ ان لوگوں نے سلطانہ کو کہیں چھپا دیا ہے۔

"کتو! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں میری سلطانہ واپس کرنی ہو گی۔ کیا بگاڑا تھا اس بے چاری نے تمہارا۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ اگر میری سلطانہ کو کچھ ہوا تو آگ لگا دوں گا تمہارے گھروں کو' جلا دوں گا تمہارے ارمانوں کو' گرا دوں گا تمہاری دیواروں کو۔" وہ اتنی زور زور سے چلا رہا تھا کہ کئی گھروں کے دروازے ایک ساتھ کھلے۔ "کیا ہے بے' کیوں شور مچا رہا ہے؟"

"ستار بابو تم نے مجھے پہچانا نہیں۔" اس نے اپنے ایک محلے دار کو پہنچانتے ہوئے کہا۔

"ارے ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں تم کتوں کو۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب تک کیوں نہیں پہچانے تھے۔"

"پہچان گئے ہو پھر بھی اس طرح بات کر رہے ہو۔ میرا تو بچپن ہی تمہارے گھر کے آنگنوں میں کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔"

"چاچا' یہ لوگ اپنی فوج پر کود رہے ہیں۔ فوج چلی جائے پھر دیکھنا کیسی بھیگی بلی بنتے ہیں۔"

"فوج چلی جائے تو یہ بھیگی بلی بننے کے لیے زندہ ہی کب رہیں گے۔ یہ تو اپنے دن پورے کر چکے۔" اب بوڑھے چپ تھے' نوجوان بول رہے تھے۔

"سلیم تو بھی! تو تو میرا دوست تھا۔ ہم تو فلم دیکھنے ایک ساتھ ہی جاتے تھے۔ یاد ہے ------"

"خبردار جو اپنی گندی زبان پر میرا نام لایا۔ تمہاری فوج ہمارے لوگوں کی قاتل ہے۔"

"میں تو نہیں ہوں۔"

"ہماری دولت تو تم بھی لوٹتے رہے ہو۔ تم نہ ہوتے تو تمہاری جگہ ہمارا ایک

بھائی نوکر ہو جاتا۔ تم لوگوں نے ہمارا حق مارا ہے مگر اب نہیں مار سکو گے۔ خیر
چاہتے ہو تو فوراً" یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مگر یہاں میرا گھر ہے۔"

"تمہارے باپ کا گھر ہے۔ بنگلہ دیش میں جو کچھ ہے ہماری ملکیت ہے۔"

"یہ ملکیت تمہیں مبارک ہو۔ میں تو صرف اپنی بہن کو لینے آیا۔ ہوں میں
بھی یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میری بہن کا پتا بتا دو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں یہ
نہیں تھا مگر تم نے تو دیکھا ہو گا' اس پر کیا بیت گئی کہاں گئی وہ۔'

"ہم نے تو یہی سنا ہے کہ تم بہن بھائی ایک ساتھ ہی غائب ہوئے تھے
عبدالرحمٰن نے ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کے عوض تمہارا مکان خرید لیا تھا۔"

"ارے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں یہ لوگ۔ جو دولت ہمارا حق مار کے جمع
تھی۔ وہ مغربی پاکستان پہنچا کر واپس آگیا ہے۔ بہن کا ڈراما رچا کر مکان پر دوبارہ قبضہ
کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں' خدا کی قسم نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں کہیں نہیں گیا۔ میں
ہسپتال میں تھا۔ آج ہی ہسپتال سے آیا ہوں۔ مجھے میری سلطانہ چاہیے۔ میرے پاس
جو کچھ ہے وہ بھی لے لو' میری سلطانہ واپس کر دو۔ وہ بیچاری تو معذور ہے' اپنے پیروں
پر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسے میری کتنی ضرورت ہے' یہ تم سب جانتے ہو۔ میں
وعدہ کرتا ہوں' ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔ میری سلطانہ مجھے دے دو۔"

"تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے ہم اسے اغوا کر کے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ ہم نے
تو دیا' ہم میں سے کسی نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس ایک دن اچانک معلوم
ہوا کہ تم دونوں یہاں سے پرواز کر گئے ہو۔ عبدالرحمٰن نے تمہارا گھر پہلے ہی خرید لیا
تھا۔ اس نے ہمیں تمہارے ہاتھ کی تحریر بھی دکھائی۔ اس نے اپنا تالا مکان پر ڈال دیا
یہ حق تھا اس کا۔ اس دن تالا نہیں پڑتا تو اب پڑ جاتا۔ تمہیں حق کیا ہے ہماری زمین پر
رہنے کا۔"

"چاچا یہ ایسے نہیں مانے گا۔ ٹھکائی ہو گی۔ جب ہی جائے گا۔" اسی لڑکے نے
کہا جسے وہ اپنا دوست کہہ رہا تھا۔

"خبردار جو کسی نے ہاتھ لگایا! تو۔" مجید بھی تن کر کھڑا ہو گیا۔
"افوہ! اکڑ تو دیکھو۔"
"اکڑ نہیں۔ یہ میرا گھر ہے' میں ابھی تالا توڑتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کون مجھے روکتا ہے۔"
"عبدالرحمٰن بابو کو آنے دو۔ اس سے پہلے تم اس تالے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"
"وہ کون ہوتا ہے؟"
"اس نے یہ مکان خرید لیا ہے۔"
""جھوٹا ہے وہ۔"
"یہ فیصلہ بھی اس کے آنے کے بعد ہو گا۔"
"خدا کے لیے میری سلطانہ کے بارے میں بتا دو پھر یہ مکان بھی میں چھوڑ دوں گا۔" مجید پھر خوشامد پر اتر آیا۔ وہ مجمع کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
"ہم نے کہا نا' جس رات کو تم گھر سے نکلے ہو اس کی صبح کو وہ بھی غائب تھی۔ ہم نے تو مکان پر تالا پڑا ہوا دیکھا۔" ایک ہمدرد بزرگ نے کہا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا پھیل گیا۔ کسی نے کوئی بھاری چیز اس کے سر پر دے ماری تھی۔ اس کے ساتھ ہی لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع ہو گئی۔
"مر جائے گا رے' اتنا مت مارو۔" اس نے کسی کی آواز سنی اور پھر وہ زمین پر گر گیا۔ مجمع اس طرح غائب ہو گیا جیسے چوہے اپنے بلوں میں گھس گئے۔ چند بچے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے انہیں بھی ان کی ماؤں نے گھروں میں بلا لیا۔
اس کے سر سے خون نکل نکل کر اس کے کپڑوں پر جم رہا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں سلطانہ کو پکار رہا تھا مگر سلطانہ آج اس کی آواز پر دروازہ کھولنے کو تیار نہیں تھی۔ سورج کی کرنوں اور مکھیوں کی یورش نے اس کے ہوش ٹھکانے کر دیے۔ وہ اٹھا' گلی کے کونے پر لگے ہوئے نلکے سے خون کے دھبے دھوئے اور سر جھکا کر گلی سے نکل آیا۔
اب دن چڑھ گیا تھا۔ کچھ دکانیں بند پڑی تھیں' کچھ کھل گی تھیں۔ سڑک پر فوجی ٹرک چل پھر رہے تھے۔ ایسی فوجی سرگرمی اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی

تھی۔ وہ کسی خواب کے عالم میں اس طرح چل رہا تھا جیسے اسے نیند میں چلنے کی عادت ہو۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی لیکن اس کا ذہن برابر سفر میں تھا۔ اچانک اس کے قدم رک گئے۔ کسی بھولی ہوئی یاد کی طرح اسے سبھاش کی دھمکی یاد آ گئی۔ پھر کھلی کتاب کی طرح ہر واقعہ اس کے سامنے آگیا۔ سبھاش نے مجھے ضرور تلاش کیا ہو گا۔ میرے نہ ملنے پر سلطانہ ہی اس کا نشانہ بنی ہو گی۔ یہ سب اسی رات ہوا ہو گا جس رات میں افروز کے گھر گیا تھا۔ ابھی تک اس کا سفر بے سمت تھا لیکن یہ خیال آتے ہی روشنی اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ روشنی اسے راستہ دکھا رہی تھی اور وہ سبھاش کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ باناتی کالونی یہاں سے بہت دور تھی اور وہ بہت جلدی میں۔ اسے یاد آیا' اس کی جیب میں پیسے ہیں۔

ایک غریب رکشا والا میلی بنیان اور گندی دھوتی میں اس کے قریب آ کر رک گیا۔

"باناتی کالونی چلو گے؟"

رکشا والے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "اور ادھر تو بڑی مارا کاٹی ہوئی ہے۔ ادھر جا کر کیا کرے گا۔ لوٹنے والوں نے سب لوٹ لیا' اب تجھے کیا ملے گا۔" رکشا والے نے کہا۔

"تم مجھے لے تو چلو۔ شاید میری دولت لٹنے سے بچ گئی ہو۔"

کرائے کے پیسے ہیں؟"

"ہاں ہیں۔"

"تو پھر بیٹھو۔"

باناتی کالونی میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بعض دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں۔ بعض گھر دھوئیں اور آگ سے سیاہ ہو چکے تھے۔ گلیوں میں جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کے جوتے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھے۔ درندگی کے ان نشانات کو دیکھتا ہوا وہ سبھاش کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

"بس بھائی یہاں اتار دو۔" وہ ایک گلی پہلے ہی رکشا سے اتر گیا۔ وہ رکشا والے پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ سبھاش کے گھر آیا ہے۔ گلی پار کرنے کے بعد وہ

سبھاش کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کا گھر صحیح سالم کھڑا تھا۔ درندگی کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ شاید فسادیوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ اس مکان کی سلامتی کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا لیکن یہ کیا؟ آہنی دروازے کے باہر تالا پڑا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ہوشیار آدمی باہر سے تالا لگا کر اندر بیٹھا ہو یا کوئی چوکیدار اندر ہو۔ اس نے کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا اندازہ ریت کی دیوار کی طرح مسمار ہو گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تالا پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب ہے سبھاش اپنا کام کر کے جا چکا مگر سلطانہ؟

ایک سیلاب سا اڈا اور اس کی آنکھیں پر نالا بن گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تالا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ زمین پر بیٹھا تھا۔ نہ آسمان اس کے حال پر رو رہا تھا نہ زمین شق ہو رہی تھی۔ صرف ایک کتا تھا جو اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رو رہا تھا۔ جب انسانوں کی تکلیف انسان محسوس نہیں کرتے تو انسانیت کی تذلیل پر جانور رونے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ جانور نہ بنگالی ہوتے ہیں' نہ بہاری۔ بس جانور ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے' جب کتے روتے ہیں تو کوئی بہت بڑی آفت آتی ہے۔ اس سے بڑی آفت اور کیا ہو گی کہ ایک انسان' اشرف المخلوقات رونے پر مجبور ہو گیا تھا اور انسانوں کی بستی میں کوئی نہیں تھا جو اس کے آنسو پونچھتا۔ کتا اس کے آنسو نہیں پونچھ سکتا تھا' صرف اس کے ساتھ مل کر رو سکتا تھا۔ مجید نے اپنی گلی میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں جو زخم کھائے تھے وہ انہیں بھول چکا تھا۔ بڑی تکلیف چھوٹی تکلیف کو بھلا دیتی ہے۔ سلطانہ کا دکھ اس کے اپنے دکھ سے بڑا تھا۔ اب جو کتے کی شکل ہی میں سہی ایک ہمدرد ملا تو کئی زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔ اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خون نکلنا بند ہو گیا تھا مگر بالوں میں جم گیا تھا۔ پیدل بہت چلا تھا' ٹانگوں کے زخم بھی تکلیف دینے لگے تھے۔ وہ چپ ہوا تو کتا بھی چپ ہو گیا۔ وہ اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ دوستی کا اظہار کر رہا تھا۔

"بھوکا ہے نا!" مجید نے کتے سے پوچھا۔ کتا بدستور دم ہلا رہا تھا۔ اگر بول سکتا تو کتا کیوں ہوتا' انسان ہوتا اور کسی گھر کو لوٹنے کے مشن پر نکلا ہوا ہوتا۔ "میرے

دوست، میں تجھے کیا کھانے کو دوں۔ میں نے خود کچھ نہیں کھایا۔ میرے پاس تو یہ نوٹ ہیں۔ لے یہی کھالے۔" مجید نے کچھ نوٹ نکالے اور اس کے آگے پھینک دیے۔ کتا ان نوٹوں کی طرف لپکا اور نوٹوں کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔

"کم ہیں؟" اس کے پاس جتنے نوٹ تھے سب اس کے آگے پھینک دیے۔ کتا پھر لپکا مگر اس مرتبہ بھی اس نے صرف سونگھنے پر اکتفا کیا۔ یہ یہی نوٹ ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے سبھاش جیسے وطن دشمن کی غلامی قبول کی او یہ اتنے بے حقیقت ہیں کہ ایک کتے کا پیٹ بھی نہیں پال سکتے۔ میں نے جس چیز کے لیے اپنا ایمان بیچ دیا، کتا اسے سونگھ کے چھوڑ دیتا ہے۔ مجھ سے تو یہ کتا اچھا ہے۔ کیا میں ان نوٹوں سے اپنی سلطانہ کو واپس لا سکتا ہوں۔ وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کتے نے پھر اس کا ساتھ دیا۔ برابر والے بنگلے سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور گھبرا کر دوازہ بند کر لیا۔ پھر کسی نے کتے کو پتھر مارا۔ کتے نے اپنی دم ٹانگوں میں دبائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مجید وہیں بیٹھ کر عمر گزار دینا چاہتا تھا مگر ابھی تو اسے سلطانہ کو ڈھونڈنا تھا۔ اس نے تالے سے ہاتھ ہٹایا اور برابر والے بنگلے کی کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا بات ہے؟" دروازہ کھولے بغیر کسی نے پوچھا۔

"دروازہ تو کھولو۔"

"کون ہو تم؟"

"بہاری۔"

"تیری تو ایسی تیسی۔ بھاگ یہاں سے۔"

انسانیت کی تذلیل پر کتا پھر رونے لگا۔ بنگالیوں کی ذہنیت پر بھی، بہاریو کی قسمت پر بھی۔ "مسٹر سبھاش کہاں چلے گئے۔ کچھ معلوم ہے آپ کو؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم۔ وہ آجائیں تو پوچھ لینا۔"

یہ دروازہ بھی بند ہو گیا لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔ اس نے سوچا، شاید افروز اس وقت گھر میں بند ہو جب اس کے گھر آگ لگی تھی اور بعد میں وہ سلطانہ کو اپنے گھر لے گئی ہو۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں نے نیا گھر تلاش کر لیا اب اس کے آنسو دل میں اتر رہے تھے۔ جب آنسو دل میں اترنے لگیں تو اضطراب بڑھتا ہوا کم نہیں

ہوتا۔ اس کا اضطراب اسے افروز کے گھر کی طرف لے جا رہا تھا۔ بے چینی کے کسی لمحے میں ایک چپل اس کے پاؤں سے اتر گئی تھی۔ اب وہ خود بھی اکیلا تھا' چپل بھی ایک ہی تھی۔ سر کے بالوں میں خون جما ہوا' داڑھی بڑھی ہوئی' ہونٹ خشک' آنکھوں میں اضطراب۔ کون تھا جو اسے دیکھتا اور پاگل نہ سمجھتا۔ وہ کبھی دوڑنے لگتا' کبھی رک جاتا' کبھی تیز چلتا' کبھی رینگتا ہوا افروز کی گلی میں پہنچ گیا۔ افروز کا گھر کھنڈر بنا ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ اوپری منزل آدھی گر گئی تھی' آدھی رہ گئی۔ دل دہلا دینے والی ویرانی اس گلی میں بھی چھائی ہوئی تھی۔ نکڑ پر بوڑھے بنگالی کی دکان اسی طرح کھلی ہوئی تھی جس طرح اس نے کرفیو میں دیکھی تھی۔ اس نے سگریٹ خریدا اور وہیں کھڑے کھڑے سگریٹ کو ماچس دکھا دی۔ پہلا کش لیتے ہی اس کی نگاہیں افروز کے مکان کی بالائی منزل کی طرف اٹھ گئیں' کہیں افروز تو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس نے سگریٹ کو مٹھی میں چھپا لیا مگر وہاں تو کھڑکی ہی نہیں تھی۔ جلی ہوئی چوکھٹ کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا۔

"یوں کیا دیکھ رہے ہو۔ تم اس محلے کے تو دکھائی نہیں دیتے۔" بوڑھے نے کہا۔ مجید کو یاد آیا اس نے کرفیو والے دن بھی یہی سوال کیا تھا۔

"نہیں میں اس محلے کا نہیں ہوں۔ اپنے دوست سے ملنے آیا تھا مگر اس کا تو گھر ہی جل گیا۔"

"اس سامنے والے مکان کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں' یہی تو تھا میرے دوست کا مکان۔"

"اب وہ لوگ کہاں۔ دونوں میاں بیوی جل کے کوئلہ ہو گئے۔ سنا ہے لڑکی اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ کہیں گئی ہوئی تھی۔ اگر کسی کے ہاتھ نہیں لگ گئی تو بچ گئی ہو گی ورنہ مردوں سے بد تر زندگی گزار رہی ہو گی۔"

"افروز گھر پر نہیں تھی! پھر تو ضرور بچ گئی ہو گی۔ کیا وہ بعد میں یہاں نہیں آئی۔"

"آج تک تو دیکھا نہیں۔ سنا ہے چٹاگانگ میں ان کے رشتے دار ہیں وہاں چلی گئی ہو یا مغربی پاکستان چلی گئی ہو۔ بہاریوں کا ٹھکانا تو اب وہی رہ گیا ہے۔ یہاں تو بہت چوس چکے۔ کہیں تم بھی تو بہاری نہیں۔" بوڑھے نے کہا اور پھر خود ہی قہقہ مار کر

ہنس پڑا جیسے کہہ رہا ہو' پاگل کا کیا مذہب۔

"سگریٹ اور پیو گے؟"

"پیسے نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میری طرف سے پی لو۔ بس دعا کرو آزادی مل جائے۔ پھر دیکھنا' اس کھوکھے کی جگہ پکی دکان کھل جائے گی۔"

"تم بھی دعا کرو میری سلطانہ مل جائے۔"

"بیوی ہے تمہاری؟"

"نہیں' بہن۔"

"یہ ضرور بہاریوں کی حرکت ہو گی۔"

"نہیں یہ بنگالیوں کی حرکت ہے۔ اس لیے کہ میں خود بہاری ہوں۔"

"تم بہاری ہو!"

"ہاں"

"تو پاگل نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"نہیں۔"

"چل بھاگ یہاں سے۔ نہیں تو بلاتا ہوں اپنے بیٹوں کو۔"

"مجید اس کی دکان کے سامنے سے ہٹ گیا۔ محلے بھر سے جو معلومات اسے ملیں ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فائر بریگیڈ کو دو لاشیں ملی تھیں۔ افروز اس وقت گھر نہیں تھی اگر اس وقت گھر پر نہیں تھی تو بعد میں کیوں نہیں آئی۔ اگر اسے اپنے عزیزوں کے پاس چٹاگانگ جانا بھی تھا تو یہاں آنے کے بعد جاتی۔ اسے راستے میں کیسے خبر ہو گئی کہ اس کا گھر جل گیا ہے۔ خبر ہو بھی جاتی تو بھی وہ یہاں آتی تو۔ دوسرے پاؤں کی اکیلی چپل اب اسے تنگ کرنے لگی تھی۔ اس نے یہ چپل بھی اتار دی۔

"چائے پئے گا؟" وہ ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا کہ ہوٹل والے نے اس سے پوچھا۔ یہ بنگالی کا ہوٹل تھا۔ مگر اب وہ بہاری نہیں تھا پاگل تھا۔

"پلا دو مگر پیسے نہیں ہیں۔"

"ارے تجھ سے پیسے کون مانگتا ہے۔ لے بسکٹ بھی کھا بھوکا لگتا ہے۔"

وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ یہ سڑک ائرپورٹ کی طرف جاتی تھی۔ وہ گھومتا گھامتا گیٹ کے قریب پہنچ گیا اور دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ عوامی لیگ کے رضاکاروں نے یہاں ایک چیک پوسٹ قائم کی ہوئی تھی تاکہ بنگلہ دیش کی دولت کوئی باہر نہ لے جاسکے۔ وہ ہر آنے جانے والے کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہ دور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ایک پٹھان رکشا میں سوار وہاں سے گزرا۔ رضاکاروں نے اسے روک لیا اور تلاشی کے لیے مجبور کیا۔ پٹھان نے مزاحمت کی۔ ایک رضاکار نے چھرا نکالا اور مسافر کے پیٹ میں رکھ دیا۔ لاش گھسیٹی اور سڑک کے کنارے ایک نالی میں پھینک دی۔ مجید نے تالیاں بجائیں اور رضارکار قہقہے لگانے لگے۔

مجید نے چیک پوسٹ پار کی تو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اب وہ بھاری نہیں پاگل تھا۔ اسے اس کے پاگل پن نے بچا لیا۔ ورنہ ہوش مند اسے قتل کر چکے ہوتے۔ اب سڑک پر لگی بتیاں جل گئی تھیں۔ اس نے دن بھر میں آدھے شہر کا سفر طے کر لیا تھا۔ تھکن اور نیند کے غلبے نے اسے ایک پارک میں جا کر سلا دیا۔



25 مارچ کی صبح 11 بجے میجر جنرل خادم راجا اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ان کی میز پر سجے ہوئے ٹیلیفونوں میں سے ایک اچانک بجنے لگا۔ "ہیلو" راجا نے کہا۔

"خادم' آج رات۔" ٹکا خاں کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔

یہ جنرل یحییٰ کا پیغام تھا جسے جنرل ٹکا خاں نے میجر جنرل خادم کو منتقل کر دیا۔ خادم سمجھ گئے کہ آج رات آپریشن کرنا ہے۔ یہ وہی رات تھی جب مجید ایک پارک میں گہری نیند سو رہا تھا۔ پارک کی ایک ایک روش چاندنی میں نہائی ہوئی تھی' موسم بہار کی خنک ہوائیں سوئے ہوئے پھولوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔

بنگالی نوجوانوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی سپاہ کا کمانڈر انچیف کرنل ایم اے جی عثمانی بنگالی یونٹوں سے رابطہ کیے ہوئے

تھا۔ گزرنے والے وقت کی کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ فیصلے کی گھڑی نزدیک آگئی تھی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے ہیڈکوارٹر میں سویا ہوا وائرلیس سیٹ جاگ اٹھا۔ یہ ڈھاکہ کے مقامی کمانڈر کی آواز تھی۔

"سر! مجھے کاروائی مقررہ وقت سے قبل شروع کرنے کی اجازت دی جائے۔ اوور۔"

"مقررہ وقت تو ایک بجے شب ہے۔"

"مخالفین کو فوجی کاروائی کا علم ہو چکا ہے۔ وہ مزاحمت کی تیاری کر رہے ہیں۔ اب وقت ضائع کرنے سے حریف کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"جب تک ممکن ہو صبر سے کام لیا جائے اوور۔ جنرل نے فیصلہ سنایا۔ وائرلیس سیٹ پھر سو گیا۔

چھاؤنی سے روانہ ہونے والے پہلے دستے کو فارم گیٹ پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ رضاکاروں نے درخت کاٹ کر سڑک پر گرا دیے تھے اور خالی جگہوں پر کاریں اور روڑی کوٹنے والا انجن کھڑا کر کے راستہ بلاک کر دیا تھا۔ سینکڑوں بنگالی ان رکاوٹوں کے اس طرف جمع تھے اور جے بنگلہ کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ شور اتنا وحشت انگیز تھا کہ مجید ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ جے بنگلہ کی آوازیں بہت قریب سے آ رہی تھیں۔ پھر گولیوں کی آوازیں پھر تڑاخ تڑاخ نے نعروں کے شور کو دبا دیا۔ پھر نعرے لگے، گولیوں کی آوازیں پھر آئیں۔ نعرے پھر بلند ہوئے۔ پھر نعرے اور گولیوں کی آوازیں گتھم گتھا ہو گئیں۔ چیخوں کا شور بلند ہوا، نعرے پھر لگے، گولیاں پھر چلیں۔ ہتھیارو نے نعروں پر برتری حاصل کر لی۔

مجید کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا ہوا پارک کے اس حصے میں آ گیا جہاں سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اب فوجیوں کے ٹرک دیکھ سکتا تھا۔ صورت حال اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ فوج، باغیوں کو کچلنے کے لیے حرکت میں آ چکی ہے۔ ابھی وہ سڑک پر دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجیب کی آواز گونجی۔ وہ ریڈیو کے ذریعے اپنی قوم سے مخاطب تھا۔ رضاکاروں نے ریڈیو کو لاؤڈ اسپیکر کے سامنے رکھ دیا تھا۔ رات کے سناٹے اور گولیوں

کے شور میں مجیب الرحمٰن کی آواز گونج رہی تھی۔ "شاید یہ میرا آخری پیغام ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج سے بنگلہ دیش آزاد ہے۔ میں عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہوں اور جو وسائل بھی رکھتے ہوں غاصب فوج کا اس وقت تک مقابلہ کریں جب تک کہ بنگلہ دیش کی دھرتی سے پاکستان کا آخری سپاہی نکل نہیں جاتا۔ جب تک آپ مکمل کامیابی حاصل نہ کرلیں' اپنی جنگ جاری رکھیں۔"

مجید اب سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے راکٹ لانچر کی آواز سنی جو فوج نے کسی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔ اب پارک سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ پارک ہی میں دبک گیا البتہ فوج آگے بڑھ گئی۔ اس کمانڈو پلاٹون کا رخ مجیب الرحمٰن کے مکان کی طرف تھا۔ گیٹ پر متعین رضاکاروں نے فائر کھول دیا۔ پیشہ ور سپاہیوں کا وہ کب تک مقابلہ کرتے' چند لمحوں میں ہمت ہار بیٹھے۔ کمانڈوز نے دیوار پھاندی اور اندر اتر گئے۔ انہوں نے میگافون کے ذریعے مجیب کو باہر آنے کو کہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ مجیب کے بیڈروم کے پاس پہنچ گئے۔ دروازے کے باہر تالا پڑا تھا جسے ایک گولی نے نیچے گرا دیا۔ باہر تالا تھا مگر مجیب اندر موجود تھا۔ سپاہیوں نے فوراً اسے اور گھر کے باقی افراد کو حراست میں لے لیا۔

"بڑا پرندہ پنجرے میں ہے' دوسرے اپنے گھونسلوں میں نہیں ------ اوور۔"

"شاباش!"

"کیا بڑے پرندے کو آپ کی حضور میں پیش کیا جائے۔"

"میں اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔" جنرل ٹکا خاں نے کہا اور وائرلیس سیٹ خاموش ہو گیا۔

مجیب الرحمٰن کو کھلی جیپ میں بٹھا کر شب باشی کے لیے چھاؤنی بھیج دیا اور ان کے گھریلو ملازموں کو شناخت کے بعد رہا کر دیا گیا۔ پرندہ پنجرے میں تھا لیکن چڑیا گھر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ڈھاکہ شہر خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

مجید ایک ایسے پرندے کی طرح جو صیاد کی نظروں سے دور تھا اور محفوظ تھا' آسمان کو جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

کبھی شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے' کبھی دھوئیں کے بادلوں میں چھپ جاتے۔

چنگاریاں آسمان کی طرف لپک رہی تھیں لیکن آسمان دور تھا' راستے ہی میں تحلیل ہو کر کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح زمین کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ چاند سے یہ تماشا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ کہیں سے ہلکے ہلکے بادل آئے اور چاند نے اپنا منہ چھپا لیا۔ پھنکارتے ہوئے شعلے یونیورسٹی کیمپس سے بلند ہو رہے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی عوامی لیگ کا اسلحہ خانہ تھی۔ اسے مسخر کرنا کمانڈوز کی بڑی کامیابی ہوتی لہٰذا پوری توجہ اس طرف صرف کی جا رہی تھی۔ مختلف ہتھیاروں سے ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ سخت مزاحمت کی جا رہی تھی۔

"مجھے اقبال ہال اور جگن ناتھ میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔" ایک فوجی کپتان نے وائرلیس پر کہا۔

"کیا مزاحمت مزاحمت لگا رکھی ہے۔ کتنی دیر میں ٹارگٹ پر قبضہ کر لو گے۔" ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔

"چار گھنٹے۔"

"بکواس ------ تمہارے پاس کون سے ہتھیا رہیں؟"

"راکٹ لانچر' ریکائل لیس رائفل' مارٹر۔"

"تو یہ کس کام کے ہیں؟ دو گھنٹے کے اندر اندر ٹارگٹ پر قبضے کی اطلاع دو۔"

"صبح کے چار بجے تھے کہ یونیورسٹی کو مسخر کر لیا گیا۔ اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال پر راکٹوں کے نشان تھے۔ جھلسے ہوئے کمرے' جلے ہوئے کواڑ' ادھ جلی رائفلیں' جھلسے ہوئے کاغذ فوجی کارروائی کی یاد دلانے کے لیے باقی رہ گئے تھے۔ جو دستے شہر کی خبر گیری کے لیے گئے تھے انہوں نے بھی علی الصباح اپنی کاروائی مکمل کر کے جنرل ٹکا خاں کو خوش خبری سنا دی۔ "یہ گولیوں کی آوازیں کیسی ہیں۔" ٹکا خان نے پوچھا۔

"گلی کوچوں میں دہشت پھیلانے کے لیے ہمارے سپاہی ہوا میں فائرنگ کر رہے ہیں ورنہ اب مقابلے پر کوئی نہیں۔ راجڑ باغ میں پولیس کو اور فیل خانے میں ای پی آر کو غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔"

"شاباش آفیسر!"



سورج نے اپنی کرنوں پر اتارا تو مجید بھی پارک سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی آنکھوں میں وحشت کے سائے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اس نے جو کچھ سنا اور تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا وہ اسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن اب اسے اپنی جان کی پروا ہی کب تھی۔ جس طرح وہ تباہ ہوا تھا' شہر پر کیا تباہی آئی ہو گی۔ شہر تو قبرستان بن گیا ہو گا۔ ان مردوں میں سبھاش بھی ہو گا۔ اگر خوشی ہے تو یہ ہے' شاید میری سلطانہ بھی کسی بھٹکتی ہوئی روح کی طرح مجھے مل جائے۔ شاید اس پر ظلم کرنے والوں کے ہاتھ کٹ گئے ہوں اور وہ آزاد ہو گئی ہو۔

وہ بے تحاشا شہر کی طرف بھاگا تھا۔ وہ ہر تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ شہر بھر میں شاید کوئی نہیں تھا۔ اکا دکا لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ پرانے شہر کی بعض گلیوں میں اب بھی رکاوٹیں موجود تھیں مگر ان پر پہرا دینے کے والے غائب ہو چکے تھے۔ لوگ اس شہر میں ہوں گے ضرور لیکن رات بھر کی فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ شہر کا چکر لگانے کے بعد وہ دھان منڈی گیا جہاں مجیب کا گھر تھا۔ مکان کے بیرونی گیٹ پر جہاں کبھی پیتل کا بنا ہوا نقشہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کے اردگرد چھ ستارے بنا کر عوامی لیگ کے چھ نکات کی نمائندگی کی گئی تھی' اب گیٹ پر صرف وہ سوراخ نظر آ رہے تھے جہاں یہ آرائشی نقش نصب کیے گئے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی قد آدم تصویر اوندھے منہ پڑی فرش چاٹ رہی تھی۔

تصویروں کا کیا ہے۔ ہم صرف تصویریں مٹا سکتے ہیں۔ نظریات کی تصویریں دل پر نقش ہوتی ہیں جو کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ آنے والے دنوں میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ سورج روز ہی غروب ہوتا ہے مگر آج وقت سے پہلے غروب ہو گیا تھا۔ مجید اندھیرے اور سناٹے کے بیچ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے' وہ کہاں جائے۔ دن بھر کی بھوک نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ بھوک تو پاگلوں کو بھی لگتی ہے۔ اسے وہ ہوٹل یاد آیا جہاں سے اس نے چائے اور بسکٹ کھائے تھے مگر آج تو وہ بھی بند ہو گا۔ کئی

دوستوں کی شکلیں اس کی آنکھوں میں گھوم گئیں مگر اس وقت میں کہاں جاؤں۔ اب تو پاؤں بھی ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اتنی طاقت کہاں کہ وہ فاصلہ طے کروں جو میرے اور دوستوں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ کیا خبر ان پر کیا افتاد پڑی ہو۔ وہ وہیں مجیب کے گھر کی دیوار کے نیچے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ جس نے لوٹا ہے وہی مجھے پناہ بھی دے گا۔ کچھ بھوک کی نقاہت کچھ تھکن کی حرارت۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

ڈھاکہ ایک رات کی مارکٹائی کے بعد سن ہو گیا تھا البتہ چٹاگانگ اور راج شاہی میں پاکستانی' فوجیوں کو زبردست مزاحمت کا سامنا تھا۔ چٹاگانگ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد صرف چھ سو تھی جبکہ بنگالی نفری پانچ ہزار کے قریب تھی۔ یہ سب بریگیڈیر مجمودار کے تربیت یافتہ تھے۔ نیم فوجی تنظیم ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈکوارٹر اور ایک ونگ بھی یہیں مقیم تھا۔ بنگالی پولیس اور سابق فوجی اور عوامی لیگ کے رضاکار اس کے علاوہ تھے۔ بریگیڈیئر مجمودار کی وفاداری مشکوک تھی اس لیے یہی تصور کیا جا رہا تھا کہ پانچ ہزار بنگالی' چھ سو غیربنگالیوں کو فوراً" ہڑپ کر جائیں گے۔ کومیلا سے کمک پہنچ سکتی تھی لیکن لکڑی کا پل اڑ جانے کی وجہ سے یہ امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ بریگیڈیر اقبال شفیع فوجی دستوں کو لے کر چٹاگانگ کی طرف بڑھنے لگے جہاں ان کی اشد ضرورت تھی مگر شہر سے بیس کلو میٹر دور کومیرا کے مقام پر باغیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ فوجی دستے کے ہراول گروہ میں سے گیارہ افراد شہید ہو گئے۔ اس اچانک افتاد سے ایسی بھگدڑ مچی کہ اس دستے کا کومیلا اور ڈھاکہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

جس وقت مجید سردی سے سکڑا مجیب کی دیوار کے سائے میں بیٹھا تھا' چھاؤنی جاگ رہی تھی۔ جی۔ او۔ سی بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس دستے کا کیا بنا؟ کیا ہو سارے کے سارے شہید ہو گئے۔ اگر کچھ بچے ہیں تو وہ کہاں ہیں؟ کیا پتا کس وقت وہاں چند سو پاکستانی سپاہی' باغیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جائیں؟

مجید نے کچھ جاگتے سوتے رات گزاری دی۔ ابھی آسمان سے ستارے رخصت نہیں ہوئے تھے کہ اس نے مجیب کی دیوار کا سایہ چھوڑ دیا۔ وہ اٹھ تو گیا تھا لیکن بھوک کی شدت سے چکر آ رہے تھے۔ وہ دو قدم چلتا پھر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح چلتے

ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ ایک جگہ چند کتے باسی ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے چبا رہے تھے۔ اس کاجی چاہا کہ کتوں کو بھگا کر خود یہ ٹکڑے چبانے بیٹھ جائے لیکن اس کے پیٹ پر اس کی غیرت غالب آ گئی۔ یہ کتے بھی بھوکے ہوں گے۔ مجھے تو کوئی بھیک بھی دے دے گا' یہ بے چارے تو بھیک بھی نہیں مانگ سکتے۔ اس نے کتوں کی طرف سے منہ پھیرا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ رات بھر خاموشی رہی تھی اس لیے لوگوں کے خوف میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ لوگ اپنے دروازوں سے باہر کے منظر کو جھانک رہے تھے۔ اس پر کسی کی نظر پڑی بھی ہو گی تو یہ سمجھا ہو گا کہ کوئی پاگل ہے۔ گھوم رہا ہے' گھومنے دو۔ پاگل تو پاگل ہوتا ہے۔ یہ نہ بنگالی ہوتا ہے نہ بہاری۔

وہ ہر دروازے کے سامنے پہنچ کر سوچتا تھا' اگلے دروازے کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا لیکن ہر دروازے پر اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ یکبارگی اس کے پیٹ میں آگ سی لگی۔ قریب تھا کہ وہ جہاں کھڑا ہے وہیں گر جائے۔ اس نے گھبرا کر ایک دروازے پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد کسی نے جھانک کر دیکھا اور جب وہ مطمئن ہو گیا کہ وہ بھکاری ہے یا پاگل اس نے دروازہ کھول دیا۔ "بھائی میں بھوکا ہوں۔ جلدی سے کچھ کھانے کو دے دو۔"

"تم بنگالی بندو ہو یا بہاری؟"

پوچھنے والا اوھیڑ عمر کا بنگالی تھا جس نے اس وقت بھی ایک چھرا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ غالباً" اسے اب بھی شک تھا کہ کیا خبر پاگل کے روپ میں کون ہو۔ "میں بھوکا ہوں۔ نہ بنگالی نہ بہاری۔"

"اچھا بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ لاتا ہوں۔" وہ پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ تمہاری قسم مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اس کے کانوں میں سلطانہ کی آواز آئی۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پتا نہیں سلطانہ نے کچھ کھایا ہو یا نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔ میں کیسے کھالوں' وہ بھی تو بھوکی ہو گی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکا ایک تھالی میں اس کے لیے کچھ لے کر آیا۔ لڑکے پر نظر پڑتے ہی وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ یہ لڑکا اس کا شاگرد رہ چکا تھا۔

"لو بابا ناشتا کر لو۔"

"لے جاؤ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

لڑکا اس کی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ تھالی اٹھائے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "ابھی تو آپ بھوکے تھے' اب کیا ہو گیا۔"

"مجھے یاد آ گیا' میں بھوکا نہیں ہوں۔"

"ڈھاکہ میں کون ہے جو بھوکا نہیں ہے۔ چھاؤنی میں مرغیاں اور بکرے کٹ رہے ہیں۔ اس صوبے کے مالک' بنگالی عوام اور بہاری بھی بھوکے مر رہے ہیں مگر انہیں کیا۔ عوام مریں یا زندہ رہیں ان کی بلا سے مگر آپ تو کھائیں۔"

مجید نے اس سے تھالی لے لی۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکا اسے پہچان نہ لے۔ بنگالی سمجھ کر کھانا لایا بہاری سمجھ کر خون کا پیاسا نہ ہو جائے۔ وہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگ گیا۔ وہ لڑکا ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ "میں پانی لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور اندر بھاگ گیا۔

اس مرتبہ لڑکے کی بجائے اس کا باپ باہر آیا۔ مجید اس وقت تک تھالی صاف کر چکا تھا۔ "آیئے اندر آجایئے۔"

"کھا چکا۔ اب میں جاؤں گا۔"

"آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ آئے اندر آ جایئے۔"

"پانی چاہیے۔"

"پانی بھی اندر چل کر پی لیجئے گا۔ آیئے نا۔" اس نے مجید کا بازو پکڑ لیا۔

مجید سر جھکا کر اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکا اسے پہچان گیا ہے۔ "میرے کپڑے میلے ہیں' میں نیچے بیٹھوں گا۔" اسنے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر کہا۔

"یہ صوفے آپ سے بڑھ کر تھوڑی ہیں۔ آپ میرے بچے کے استاد رہ چکے ہیں۔ میرے لیے باعث احترام ہیں۔"

"آپ کے بیٹے نے یہ بھی بتا دیا ہو گا' میں بہاری ہوں۔"

"وہ تو مجھے بھی معلوم تھا۔ آپ بہاری نہ ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔"

"پھر بھی آپ نے مجھے کھانے کو دیا۔"

"میرے دل میں بے ایمانی تو آئی تھی مگر پھر میں نے سوچا مار تو آپ کو کوئی بھی کھاتا ہے' کھانا تو میں کھلا دوں۔ خیر' مگر اب تو بات ہی دوسری ہے۔" اب لڑکا بھی کمرے میں آ گیا تھا۔ مجید کو ایسی شرمندگی کبھی نہیں ہوئی تھی جیسی اس لڑکے کے سامنے ہو رہی تھی۔

"سر! آپ کی یہ حالت؟"

مجید نے افروز کے قصے کو چھوڑ کر پوری کہانی انہیں سنا دی۔ دونوں باپ بیٹے بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ "اب آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ مغربی پاکستان چلے جائیں۔ میرے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ میں آپ کو یہاں سے نکال سکتا ہوں۔"

"لیکن میری سلطانہ یہاں ہے میں کیسے جا سکتا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں' اس کی تلاش میں کروں گا۔ آپ مغربی پاکستان پہنچ کر مجھے خط لکھئے گا۔ جو صورت حال ہو گی میں آپ پر واضح کر دوں گا۔"

"نہیں۔ سلطانہ کو میرے علاوہ کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اس کو میں یہیں رہ کر ڈھونڈوں گا۔"

"آپ یہاں آزادی سے چل پھر نہیں سکتے اسے کیا ڈھونڈیں گے۔ میری بات مانئے۔ ابھی آپ یہاں سے نکل جائیں۔ حالات ٹھیک ہونے پر واپس جایئے گا۔ پھر ہم دونوں مل کر اپنی بیٹی کو ڈھونڈیں گے۔" وہ بہت دیر تک سمجھاتے رہے لیکن اپنی ضد میں وہ واقعی پاگل ثابت ہو رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹے سر سے پاؤں تک جھول گئے لیکن وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"آپ کا مسئلہ تو یہ بھی ہے کہ آپ اسے کہاں رہ کر ڈھونڈیں گے۔ نہ آپ کی کوئی منزل ہے نہ اس کا ٹھکانا آپ کو معلوم ہے۔"

"کہیں بھی رہ لوں گا۔"

"یہ بات اتنی آسان نہیں۔ آپ کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ ہوٹل بھی کھلے ہوتے ہیں کبھی بند ہو جاتے ہیں۔ حالات نے ابھی کوئی واضح رخ اختیار نہیں کیا ہے۔ ڈھاکہ خاموش ہوا ہے۔ مضافات میں اب بھی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ چٹاگانگ'

راج شاہی، کشتیا اور پینہ وغیرہ میں حال بہت برا ہے۔ ہندوستان کی نیت بھی صاف
نہیں لگتی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کل کیا ہو گا۔"

"کچھ بھی ہو میں اسے ڈھونڈ کر رہوں گا۔"

"ڈیڈی، انہیں اپنے گھر نہ رکھ لیں۔" لڑکے نے کہا۔

"یہی تو میں انہیں سمجھا رہا ہوں۔ حالات اتنے نازک ہیں کہ میں انہیں اپنے گ
بھی نہیں رکھ سکتا۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں نے انہیں پناہ دی ہے تو ان ـ
ساتھ ساتھ میری بھی مصیبت آجائے گی۔ جب میں اتنا محتاط ہوں تو انہیں اور کہا
ٹھکانا مل سکتا ہے۔"

"آپ کسی زحمت میں نہ پڑیں، میں اپنا انتظام خود کر لوں گا۔" مجید نے کہا ا
چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا ایک مشورہ ہے، اگر مان لو۔" مجید پھر بیٹھ گیا۔

"آج کل جتنے بہاری ہیں پناہ کے لیے چھاؤنی کا رخ کر رہے ہیں۔ ہو سکتا
سلطانہ بھی وہیں ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم وہاں چلے جاؤ۔ محفوظ بھی رہو گے، سلا
کو تلاش بھی کر سکو گے۔"

اندھیرے میں کہیں روشنی سی چمکی۔ ایک راستہ نظر آیا جو اسے اتنی مہا
دے سکتا تھا کہ آرام سے سلطانہ کو تلاش کر سکے۔ "بہت شکریہ، میں اب چھاؤنی جا
گا۔"

"اپنی حالت تو دیکھیے۔ یہ گھر ہے، آپ کا اپنا گھر ہے۔ غسل کیجئے، مم
کپڑے حاضر ہیں۔ شیو بنائیے جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اس کا موقع دیجئے
آپ جا سکتے ہیں۔"

اس کی حالت اتنی بری تھی کہ اسے اپنے آپ سے خود بھی گھن آنے
تھی۔ یہ مشورہ بھی اسے برا نہیں لگا۔ وہ نہا کر نکلا تو کوئی اور ہی لگ رہا تھا۔ میل
کپڑے اس کے بدن سے الگ ہو گئے تھے۔ اب وہ ننگے پاؤں بھی نہیں تھا۔ اس
پیروں میں چپل تھے۔ "یہ کچھ پیسے ہیں، رکھ لیجئے۔ کسی وقت مزید پیسوں کی ضر
پڑے تو یہ گھر آپ کے لیے آدھی رات کو بھی کھلا رہے گا۔"

مجید کے ذہن میں عجیب سی جنگ ہو رہی تھی۔ اسے اب تک بہاری کے نام پر نفرتیں ملی تھیں۔ یہ کیسا بنگالی ہے جو اپنے دشمن کو زندہ رہنے کے لیے سامان دے رہا ہے۔ اس میں اس کی عظمت کا دخل ہے یا میرے پروفیسر ہونے کا۔ شاید دونوں ہی باتوں کا۔ بنگالیوں کی نفرت حکمرانوں سے ہے۔ فوج' حکمرانوں کی قوت ہے اس لیے ان کی دشمن ہے۔ یہ دشمن طاقتور ہے اس لیے بنگالیوں کا غصہ بہاریوں پر اتر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے محبت محروم کوئی بچہ توجہ دلانے کے لیے شرارتیں کرتا ہے' کھلونے توڑتا ہے اور پھر قیمتی چیزیں توڑ کر اپنا غصہ اتارتا ہے حالانکہ ان چیزوں سے اسے دشمنی نہیں ہوتی۔ بنگالیوں کو بہاریوں سے دشمنی نہیں ہے۔ بس وہ اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔

وہ اپنے اس مہربان کے گھر سے نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ دکانیں بند تھیں لیکن لوگ رات بھر کی فوجی کاروائی کا جائزہ لینے کے لیے گھروں سے نکلے ہوئے تھے۔ گلیاں بھری ہوئی تھیں البتہ سڑکیں اب بھی سنسان تھیں۔ اس نے ہر چہرے پر نفرت لکھی ہوئی دیکھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کاروائی نے نفرت کے رنگ کچھ اور گہرے کر دیے ہیں۔ جگہ جگہ مجیب کی گرفتاری موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ گلیوں میں چلنا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہ اس وقت میرپور روڈ کے قریب تھا۔ یہاں سے چھاؤنی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اور یہ سفر اسے پیدل طے کرنا تھا۔ وہ دھان منڈی' فارم گیٹ اور ائرپورٹ سے ہوتا ہوا چھاؤنی پہنچ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے پناہ کون دے۔ جن لوگوں کے ساتھ عورتیں اور بچے تھے ان پر تو ہر ایک رحم کھا سکتا تھا' اسے کون پناہ دیتا مگر یہ مشکل بھی اس وقت حل ہو گئی۔ جب اس کا ایک شناسا اس مشکل وقت میں اسے مل گیا۔ یہ دوست اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ اسی وقت وہاں پہنچا تھا۔ اس کا گھر کل رات ہی لوٹ لیا گیا تھا اور اب وہ بے آسرا تھے۔ ان کے ساتھ مجید بھی ایک مکان کے برآمدے میں سمٹ سکڑ کر پڑ گیا۔ یہاں جو لوگ تھے ان کی حالت دیکھ کر وہ اپنے زخم بھول گیا۔ ان لوگوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کسی کا گھر لٹ گیا تھا' کسی کے جگر گوشے مارے گئے تھے' کسی کے رشتے دار بچھڑ گئے تھے' کوئی اپنے میاں کی تلاش میں تھی' کوئی اپنی بیوی کو ڈھونڈ

رہا تھا۔ کئی لوگ تو اس نے ایسے دیکھے جو اس ناگہانی افتاد سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔ گھنٹوں بیٹھے خلاؤں میں تکتے رہتے اور چیخنے چلانے لگتے۔ کسی کو چپ لگ گئی تھی، کوئی مستقل بولے جاتا تھا، جتنے لوگ تھے اتنی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کہانی وہ خود بھی تھا لیکن خاموش اور پراسرار بلکہ کبھی کبھی تو اسے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ بولنا بھول جائے گا۔ بیشتر لوگ تو اسے گونگا سمجھنے لگے تھے۔ چٹاگانگ اور کومیلا سے جو خبریں آ رہی تھیں وہ اتنی وحشت ناک تھیں کہ وہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ کچھ ہی دن میں یہ ٹھکانہ بھی اس سے چھن جائے گا۔

وہ دن بھر چھاؤنی کا چکر لگاتا، ایک ایک گھر میں جھانکتا کہ شاید کہیں سلطانہ نظر آ جائے۔ پھر اس نے چھاؤنی کے ہسپتال جانا شروع کر دیا۔ دن بھر مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال میں ڈاکٹروں کا ہاتھ بٹاتا، شام کو اپنے ٹھکانے پر آ جاتا تھا یا اسپتال ہی میں پڑ کر سو جاتا۔ اس کی حالت اب پھر پہلے جیسے ہو گئی تھی۔ شیو بڑھ گیا تھا کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ ایک روز وہ حسب معمول ہسپتال میں تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کمبل سے باہر جھانک رہے تھے۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہی مردہ، بے جان سے پاؤں۔ وہ آگے بڑھا اور کمبل اتار کے دور پھینک دیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجید کی آواز پر آنکھ کھولی اور پھر جیسے غشی طاری ہو گئی۔

"اے! مریض کو کیوں پریشان کرتے ہو۔" کسی دوسرے مریض نے اسے ڈانٹا۔

"یہ میری بہن ہے سلطانہ۔ گم ہو گئی تھی۔ خفا ہو گئی تھی مجھ سے۔ اب ملی ہے تو آنکھیں ہی نہیں کھولتی۔" اس نے کہا اور بے اختیار اسے آوازیں دینے لگا۔

"سلطانہ، آنکھیں کھولو۔ میں آ گیا ہوں سلطانہ۔" سلطانہ نے اس کی پکار پر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں مسلسل مجید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، کسی تاثر سے خالی۔ جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"بولو سلطانہ، بولو۔ مجھ سے باتیں کرو۔"

سلطانہ کے لبوں پر تبسم کی چاندنی پھیل گئی۔ جیسے اس نے مجید کو پہچان لیا ہو۔

"تم کہاں تھیں سلطانہ؟ کس نے یہ حال کیا ہے تمہارا؟ مجھے بتاؤ، مجھے معلوم تو ہو۔"

"بھیا' تم کہاں چلے گئے تھے۔ تم نہیں تھے تو وہ مجھے اٹھا کر لے گئے۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"کون تھے وہ؟"

"یہ مجھے کیا معلوم۔ میں انہیں خدا کے واسطے دیتی رہی۔ مگر وہ تو جیسے مسلمان تھے ہی نہیں۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے ایک گھر میں لے گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں کسی کی بہن ہوں' معذور ہوں -----" وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اسے کھانسی آئی اور اس کے ساتھ ہی خون سے اس کا بستر رنگین ہو گیا۔

"کیا ہو رہا ہے تمہیں۔ یہ خون کیسا ہے۔ ٹھہرو' میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے مجید کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا "بھیا' اب میں تمہاری بہن کہلانے کے لائق نہیں رہی۔ وہ مجھے قیدی بنا کر رکھے ہوئے تھے مگر کل رات ------ کل رات انہوں نے مجھے بے عزت کر دیا اور بے ہوشی کی حالت میں گھر سے دور لے جاکر پھینک دیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو میرے پاس وہ عزت نہیں تھی جس پر ہر لڑکی فخر کرتی ہے۔"

اس کی سانس پھر اکھڑنے لگی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا جیسے وہ سخت تکلیف سے گزر رہی ہو۔ پھر اس کے چہرے پر وہی شریر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جو کبھی ہر وقت اس کے چہرے پر کھیلا کرتی تھی۔ "تمہاری قسم مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ میرے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کوڑے کے ڈھیر پر پڑی ہوئی تھی۔ بس میرے پاس میری چوڑیاں تھیں۔ میں نے وہی پیس کر کھالیں۔ پھر ایک فوجی گاڑی مجھے یہاں لی آئی' تمہارے پاس۔" اس نے کہا اور مجید کے گلے میں بانہیں ڈالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن اس کے ہاتھ راستے ہی سے لوٹ گئے۔

"سلطانہ' یہ تو نے کیا کر لیا۔" لیکن سلطانہ اب اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ وہ اسے مل گئی تھی لیکن ایسے موڑ پر جہاں وہ ملنے کا جشن نہیں بچھڑنے کا ماتم کر سکتا تھا۔



سلطانہ کی موت کے بعد اس کی وہ قسم ٹوٹ گئی تھی جو اس نے مغربی پاکستان جانے کے لیے خود پر عائد کی تھی۔ افروز کی تلاش بے سود تھی۔ وہ اپنے رشتے داروں کے پاس چٹاگانگ چلی گئی ہو گی اور پھر شاید مغربی پاکستان چلی گئی ہو یا اب چلی جائے۔ یہ اس کا خیال تھا جو صحیح بھی ہو سکتا تھا غلط بھی۔ مجھے مغربی پاکستان چلا جانا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی اسے اپنا وہ شاگرد یاد آ گیا جس کے باپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے مغربی پاکستان بھجوا سکتا ہے۔ اس نے سلطانہ کی قبر کو بوسہ دیا اور میر پور روڈ کی طرف چل دیا۔

اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر تو دیا لیکن اب مشکل یہ ہو گئی تھی کہ سرحدی علاقوں میں اتنی شورش بڑھ گئی تھی کہ چپے چپے پر فوجی موجود تھے۔ وہ راستے جن پر چل کر سرحدیں پار کی جا سکتی تھیں' باغیوں کے قبضے میں تھیں۔ مکتی باہنی کے شدت پسند خشکی سے تری تک ہر جگہ پھیل گئے تھے۔ خوں ریز جھڑپیں روز مرہ کا معمول تھیں۔ مکتی باہنی اور عام شہری میں زبان یا لباس کے اعتبار سے کوئی فرق ہی نہیں تھا لٰہذا باغیوں کی تلاش میں پھرنے والے فوجی کسی پر بھی گولی چلا سکتے تھے۔ وہ سرحدیں جو پہلے باآسانی عبور کر لی جاتی تھیں' مشکلوں کا پہاڑ بن گئی تھیں البتہ جیسور پہنچنے کے بعد مغربی بنگال کی مشرقی سرحد پر اترا جا سکتا تھا۔ یہاں اس وقت تک شورش بھی کم تھی۔ مسئلہ وہاں تک پہنچنے کا تھا۔ اس کے مہربان بنگالی دوست نے اس مشکل کے باوجود اس کی مدد کی۔ ان دنوں ایسے بہت سے لوگ تھے جو بھاری رقمیں لے کر پھنسے ہوئے لوگوں کو سرحد پار کراتے تھے۔ اس سفر میں دشواری صرف سرحد تک پہنچنے کی تھی ورنہ ہندوستان نے اپنی سرحدیں کھول دی تھیں۔ پاکستانی فوج سے محاذ آرائی میں پسپا ہوتے ہوئے باغی انہی سرحدوں سے ہندوستان میں داخل ہوتے تھے۔ عوامی لیگ کے تمام بڑے رہنما بھی سرحد پار کر کے کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے وہ مکتی باہنی کو کنٹرول بھی کر رہے تھے' اور بین الاقوامی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی سیاسی کوششوں میں مصروف بھی تھے۔

یہ سفر بڑی سڑکوں کے ذریعے ممکن نہیں تھا کیونکہ فوجی اکثر پکی سڑکیں استعمال کرتے تھے جہاں باغیوں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوتی تھیں' اکثر ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی تھیں جنہیں صرف فوجی ہی دور کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ عام تھا کہ پکی سڑک کاٹ کر اس پر گھاس پھوس ڈال دیتے۔ فوجی جیپ پھنس جاتی اور کسی پست پہاڑی یا قریبی جھاڑی کی اوٹ سے ان پر فائرنگ شروع ہو جاتی۔ یہ فوجی ان خطروں کے باوجود ان سڑکوں پر سفر کرنے پر مجبور تھے۔ اس لیے کہ وہ ان متروک راستوں سے ناواقف تھے جو باغی اور مقامی لوگوں کے تصرف میں تھے۔ برساتی نالے جگہ جگہ سے کھلے میدان کو تقسیم کرتے تھے۔ اجنبی آدمی یہی سوچتا تھا کہ اب آگے راستہ نہیں جبکہ مقامی لوگوں کو معلوم تھا کہ کون سا موڑ کس راستے پر لے جاتا ہے۔

اس دو دن بعد ڈھاکہ سے روانہ ہونا تھا۔ ڈھاکہ اس وقت سیاست اور جنگی مشقوں کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا جس سے نکلنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر ہاتھ پاؤں مارے جا رہے تھے۔ باغی عناصر کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا تاکہ وہ باغی جو سرحد پار کر کے ہندوستان چلے گئے ہیں مکمل طور پر بھارت کی گرفت میں نہ چلے جائیں لیکن اب سیاست کا وقت گزر چکا تھا۔ عام لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس معافی کا اطلاق مجیب الرحمٰن پر بھی ہو گا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ مجیب الرحمٰن پر اس معافی کا اطلاق نہیں ہو گا تو ان کے غصے میں اور اضافہ ہو گیا۔ یہ گمراہ بنگالی مکتی باہنی کی صورت میں بہت بعد میں واپس آئے لیکن بھارتی فوج اور ہتھیاروں کے ساتھ۔ جنگی نقطہ نگاہ سے یہ تبدیلی آئی کہ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی کو ٹکا خاں کی بھاری ذمے داریوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اس نئی تبدیلی کے بعد باغیوں کو کچلنے کے لیے وسیع پیمانے پر کاروائیاں کی جانے لگیں۔ ان کاروائیوں کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور کئی علاقوں پر پاکستانی افواج کا کنٹرول ہو گیا۔ مجید نے وہ رات اپنے شاگرد کے گھر گزاری دی جہاں سے اسے روانہ ہونا تھا۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے ایک جیپ وہاں پہنچ گئی جسے ایک بنگالی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس جیپ میں پہلے ہی سے چار افراد سوار تھے جن میں سے ایک پنجابی ایک پٹھان اور دو بنگالی تھے۔ پانچواں مجید تھا جو ان میں شامل ہوا۔ راستے میں ایک اور شخص اس چھوٹی

سی سی جیپ پر چڑھ گیا جو مسافر نہیں تھا بلکہ جیپ کی حفاظت کے لیے ہتھیار لے کر ساتھ چلتا تھا۔ شہر سے نکلنے کے بعد جو منظر اس نے دیکھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تباہی کس بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبے میدان جنگ کا منظر پیش کر رہے تھے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی کہ وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے۔ یہ قصبہ گنجان درختوں میں گھرا ہوا تھا ایک طرف بڑا نالا تھا جو پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک پیٹرول پمپ اور ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ قصبہ بالکل اجاڑ پڑا تھا۔ غالباً" فوجیوں کے خوف سے پوری بستی کہیں منتقل ہو گئی تھی۔ جیپ کی گھڑگھڑاہٹ کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ جیپ کے اندر بھی سب کے سب سانس روکے بیٹھے تھے۔ قصبے سے گزر کر چند کلومیٹر آگے بڑھے تو سڑک کے بائیں جانب دو خندقیں نظر آئیں جو بالکل تازہ دکھائی دیتی تھیں جیسے ابھی ابھی کوئی انہیں چھوڑ کر گیا ہو۔ "اب سفر جاری رکھنا خطرناک ہے۔ کچھ ہی دیر میں یہاں پاکستانی فوج پہنچنے والی ہے۔ باغیوں کو اطلاع ہو گئی ہے اسی لیے وہ ان خندقوں کو خالی کر گئے ہیں۔ باغیوں کی اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔" ڈرائیور نے جیپ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔

"سب لوگ نیچے اتر جائیں۔" ڈرائیور نے کہا اور خود بھی جیپ سے نیچے اتر گیا۔ مسافر پہلے ہی اتر چکے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھیے اب کیا حکم ملتا ہے۔ ڈرائیور اور ہتھیار بند شخص جس کا نام مالک تھا آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ دونوں نے طے کیا کہ رات آگے بڑھے بغیر یہیں گزاری جائے۔ انہوں نے جیپ کو گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپایا اور خود تمام مسافروں کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

"جیپ ان درختوں میں نہیں چل سکتی جبکہ ہمیں سورج چھپنے سے پہلے پہلے رات گزارنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنی ہے۔"

کھیتوں کے درمیان گارے کی بنی ہوئی کھلی جھونپڑی کسی سرائے کی طرح ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور اور مالک جھونپڑی میں داخل ہو گئے جبکہ باقی لوگ باہر ہی کھڑے تھے۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد مجید بھی اندر چلا گیا۔ اس میں دو

کمرے تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ بڑے کمرے میں مٹی کا خوبصورت لیپ کیا گیا تھا اور سامنے کی دیوار پر دو بچوں کی فریم شدہ تصویر لٹک رہی تھی۔ کمرے کے درمیان ایک چارپائی اور ایک کھجور کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی کے اوپر ابلے ہوئے چاولوں کا ایک پیالہ تھا جس میں ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ مجید کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ بچے کہاں چلے گئے' اس جھگی پر کیا افتاد ٹوٹی ہے کہ اس کے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ اس طرف لپکا۔ کمرے میں "ڈرائیور اور مالک موجود تھے اور ان کے سامنے ایک بوڑھا آدمی ہڈیوں کے ڈھانچے اور چند چیتھڑوں میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے مت مارو۔"

وہ بڈھا' مالک کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر یہ سمجھ رہا تھا کہ باغی آ گئے۔

"ہم تمہیں مارنے نہیں آئے۔ ہم تو خود راستہ بھٹک گئے ہیں۔"

"تو تم باغی نہیں ہو۔"

"نہیں۔ ہم تو سرحد پار کرنا چاہتے ہیں۔"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی اور اس طرح زمین پر بیٹھ گیا جیسے کھڑے ہونے میں اسے دقت ہو رہی ہو۔

"تھوڑی دیر پہلے یہاں باغی آئے تھے۔ وہ کہتے تھے اگر تم نے ہمارے متعلق کسی کو کچھ بتایا تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔ میں سمجھا تھا وہ پھر آ گئے۔"

"کہاں گئے ہیں وہ باغی؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مجھے تو یہ بھی نہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ آئے تھے۔"

ڈرائیور اس بوڑھے کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر جلدی سے واپس باہر کی طرف پلٹا۔

"جلدی کرو' یہاں رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ باغیوں کی تلاش میں فوجی یہاں ضرور آئیں گے۔"

ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ توپوں کی گھن گرج سنائی دی فوجی قافلہ بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

ڈرائیور ان سب کو لے کر گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اگر وہ آئے بھی تو گھر کی تلاشی لیں گے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" اس نے
آرام سے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

اب سورج غروب ہو گیا تھا۔ دور کہیں آگ کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔
"انہوں نے قصبے کو آگ لگا دی۔" ڈرائیور نے سب کی توجہ اس طرف دلائی
جہاں یہ شعلے نظر آ رہے تھے۔ یہ یقیناً" وہی قصبہ تھا جہاں سے وہ ابھی گزر کر آ رہے
تھے۔

آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں' اب تو ہم آگے جا سکتے ہیں۔"
نہیں' ابھی نہیں۔ وہ یقیناً" اس قصبے کو آگ لگا کر آگے بڑھ رہے ہوں گے۔
ان کا رخ اسی طرف ہو گا۔" ڈرائیور نے کسی جنگی ماہر کی طرح کہا۔

مسافرو میں ایک مرتبہ پھر سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی۔ سب ایک دوسرے کے منہ
دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے۔ ہولناک خاموشی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔
چند سانسیں تھیں جو چل رہی تھیں۔

خاموشی کو چیرتی ہوئی کچھ آوازیں ہوا پر سوار ہو گئیں۔ ڈرائیور کا اندازہ درست
تھا۔ ڈرائیور کا اندازہ درست تھا۔ فوجی قافلہ چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد
یہاں تک پہنچنے والا تھا۔ پھر اندھیرے کی دیوار میں شگاف پڑنے لگے۔ یہ فوجی ٹرکوں کی
تیز روشنی تھی۔ فوجی دستے کی دو کمپنیاں ٹرکوں پر سوار تھیں۔ یہ ٹرک کچھ دیر خندقوں
کے پاس ٹھہرے اور پھر رینگنے لگے۔ پیدل فوج کے پیچھے پیچھے توپ خانہ تھا جس کی دو
بڑی توپیں وقفوں کے بعد دو گولے سامنے کی طرف فائر کرتی تھیں تاکہ باغی' توپوں کی
گھن گرج سن کر پسپا ہوتے جائیں۔ جب تک یہ فوجیں گزرتی رہیں۔

سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ فوجوں کے گزرنے کے بعد بھی خاموشی تھی جیسے
سب کے سب بولنا بھول گئے۔

وہ رات انہیں اسی جنگل میں گزارنی پڑی۔ وہ چاہتے تھے فوج جتنی دور نکل
جائے کیونکہ آگے راستہ تھا جو سڑک کے ذریعے ہی طے کیا جا سکتا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا
کہ کم از کم پچاس کلومیٹر فاصلے کے بعد ہی متروک راستہ اختیار کیا جا سکے گا۔

سورج نکلنے سے پہلے سفر پھر شروع ہو گیا۔ کبھی ان کی جیپ پکی سڑک پر دوڑتی

رہی، کبھی متروک اور کچے راستوں پر دھول اڑاتی چلتی رہی۔ ان کی منزل کشتیا کے قصبے کی زمین تھی جہاں سے انہیں پیدل سرحد پار کرنا تھی۔

کشتیا، جیسور سے شمال مغرب میں نوے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ان کا قافلہ رکتا ٹھہرتا کئی دن کی مسافت کے بعد کشتیا پہنچ گیا۔

ابھی وہ قصبے میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس دل دوز منظر نے ان کا استقبال کیا۔ گندگی کے ایک ڈھیر پر پانچ بچے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ ان کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے گئے تھے۔ ان کی ماؤں کی لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر اوندھی پڑی تھیں۔ یہ بچے اور عورتیں بنگالی نہیں تھیں۔ اس کا مطلب ہے باغیوں نے یہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا تھا۔

کشتیا میں پاکستانی فوج مقیم نہیں تھی۔ موجودہ حالات میں احتیاطی تدابیر کے طور پر تقریباً" ڈیڑھ سو سپاہی یہاں بھیجے گئے تھے اور یہ سپاہی بھی صرف چھوٹے ہتھیار لے کر یہاں پہنچے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی اس سپاہ کو فرسٹ ایسٹ بنگال کے حملے کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ان باغیوں نے سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ان کے بیوی بچوں کو بھی قتل کر دیا۔

کچھ فاصلے پر انہوں نے ایک فوجی جیپ دیکھی جو اس حملے افسانہ سنا رہی تھی۔ اس جیپ میں وائرلیس سیٹ نصب تھا۔ جیپ کے ٹائروں سے ہوا نکل چکی تھی۔ جیپ کے اندر مغربی پاکستان کا ایک سپاہی مردہ پڑا تھا۔ اس کے خون کے چھینٹے اس کے وائرلیس سیٹ پر بھی پڑے ہوئے تھے۔

ڈرائیور کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے دھیمے سروں میں ایک بنگالی دھن چھیڑی اور جیپ کو دوڑاتا ہوا آگے لے گیا۔

قصبے سے کچھ کلو میٹر دور بانسوں اور چٹائیوں کا بنا ہوا سائبان تھا جس میں ایک بوڑھا اور نوجوان بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ڈرئیور نے جیپ ان کے قریب لے جا کر روک دی۔

آ گئے تم۔" بوڑھے نے کہا۔

اس کا مطلب تھا وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

"راستے میں اتنی لاشیں دیکھی ہیں کہ چکر آنے لگے۔ گرم گرم چائے پلاؤ۔"

"ابھی لایا۔"

نوجوان اٹھ کر کوٹھری میں چلا گیا۔ بوڑھا اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔

"کشتیا کا سین دیکھ کر مزہ آگیا۔ کیا مار ماری ہے۔ جیپ میں خون ہی خون تھا۔

"بھارتی سیکورٹی فورس کا بھی اس میں بہت ہاتھ ہے۔ اسلحہ خانے کی تو اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ میں تو یہیں بیٹھا تھا۔ رات بھر گولیاں برسی ہیں۔ فرسٹ ایسٹ بنگال اور بھارتی سیکورٹی فورس نے مل کر مارا۔" بوڑھے نے تفصیل بتائی۔

"اچھا!"

"اور نہیں تو کیا۔ ذرا اندر جاتے تو خود ہی دیکھ لیتے۔ اچھا یہ ہیں جنہیں لے جا رہے ہو۔" بوڑھے نے اس طرح کہا جیسے ابھی تک اس نے ہمیں دیکھا ہی نہیں تھا۔

"کتنا مال ہے ان کے پاس۔" بوڑھے نے دانت نکالے۔"

"یہ تو اب تمہارا کام ہے۔" تمہی پوچھو ان سے۔"

مسافروں میں ایک مرتبہ پھر بے چینی پھیل گئی۔ سب سے زیادہ پٹھان پریشان تھا۔ اس کا تو رنگ ہی پیلا پڑ گیا۔

"اچھا تو پھر ہم ہی پوچھ لیتے ہیں۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھ کھڑا ہو گیا "ہاں بھئی لڑکو! کیا کچھ ہے تمہارے پاس۔ بنگلہ دیش کی دولت بنگلہ دیش ہی میں رہے تو اچھا ہے۔"

اس کی عقاب جیسی آنکھیں ہر چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایکسرے مشین کی طرح سب کی جیبیں جھانک رہی تھیں۔

"ہاں بھئی تم نکالو کیا ہے۔" سب سے پہلے پٹھان ہی کو نشانہ بنایا۔

"یہ بات اصول کے خلاف ہے۔ ہم معاوضہ دے چکے ہیں۔" پٹھان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اسے دیا ہو گا۔ اس نے یہاں تک پہنچا دیا۔ سرحد پار تو میرا بیٹا ہے وہ پہنچائے گا تمہیں۔"

"کتنا چاہیے۔" پٹھان کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"کتنے پہ سودا کرتا ہو گا یہ۔" اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا "یہاں تو جو

ہے سب نکال دو۔"

پٹھان نے بادل ناخواستہ نوٹوں کی کئی گڈیاں نکال کر اس کے آگے ڈھیر کر دیں۔ یہ رقم دو لاکھ سے کسی طرح کم نہ ہو گی۔ بوڑھا کسی خبیث روح کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

"مال دار پارٹی لایا ہے تو اب کے۔" اس نے ڈرائیور سے کہا جو اس وقت مزے سے چائے پی رہا تھا۔

باری باری سب کے پیسے زمین پر بچھی ہوئی چادر پر منتقل ہو گئے۔ اب مجید کی باری تھی۔

"نہیں چاچا۔ اس سے مت لینا۔ اس کی سفارش سبھاش نے کی ہے۔"

بوڑھے کا ہاتھ اس طرح رک گیا جیسے آگے بڑھا تو سبھاش اس کا ہاتھ کاٹ دے گا۔

"بے وقوف' پہلے بتانا تھا۔ اتنی دیر سے میں نے انہیں لائن میں لگایا ہوا ہے۔"

بوڑھے نے مجید سے معذرت طلب کی اور نوٹوں والی چادر سمیٹنے بیٹھ گیا۔

"میری سفارش سبھاش نے نہیں حمید صاحب نے کی ہے۔" اس نے اپنے شاگرد کے والد کا نام لیا۔

"وہی تو ہیں سبھاش۔"

"سبھاش تو باناتی کالونی میں رہتا ہے۔"

"کوئی ایک سبھاش ہے ڈھاکہ میں تم باناتی کالونی والے سے مل لیے ہو گے۔"

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ اصل سبھاش کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ ایک ہی نام سے کئی لوگ کام کر رہے ہیں۔ تاکہ اصل سبھاش تک کوئی نہ پہنچ سکے لیکن میں جانتا ہوں اصل سبھاش یہی حمید صاحب ہیں۔ انہوں نے ہی تمہاری سفارش کی ہے۔"

اب ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سمجھ رہا تھا اس کا احترام کیا جا رہا ہے۔ وہ احترام جو اپنے شاگرد کے استاد کا کیا جاتا ہے۔ اسے احترام پر فخر ہونے لگا تھا۔ اب اس پر کھلا کہ یہ ان خدمات کا صلہ تھا جو اس نے وطن دشمنی کے لیے ادا کی

تھیں۔ اسے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ پھر وہ سوچنے لگا' سبھاش
اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ یہ مہربانیاں کیوں؟ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ شاید
اسے معاف کر دیا گیا ہو' شاید اس کی ضرورت نہ رہی ہو یا شاید یہ بھی اس کی کوئی
چال ہو کہ اب مجھے کلکتہ بھیجا جا رہا ہے۔ سبھاش کا ذکر ایک مرتبہ پھر آ گیا تو اسے
سلطانہ یاد آ گئی۔ سلطانہ کا انتقام اب وہ کس سبھاش سے لے گا۔ اصل مجرم کون ہے؟

"کیا سوچنے لگے۔ لو چائے پیو۔" ڈرائیور نے کہا۔

"سوچ یہ رہا ہوں کہ سبھاش سے میں الجھ پڑا تھا۔ وہ تو مجھے سزا دینا چاہتا تھا پھر
اس نے میری سفارش کیوں کی۔"

"سفارش اس نے نہیں کی۔ باناتی کالونی والا سبھاش تو اس کا معمولی سا نوکر
ہے۔ تمہاری سفارش تو بڑے سبھاش نے کی ہے۔"

"اسے بھی تو معلوم ہو گا میں بغاوت کر چکا ہوں۔"

"معلوم کیوں نہیں ہو گا۔"

"وہ بھی سزا دے سکتا تھا۔"

"ان کی مصلحت وہ جانیں۔ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں آپ کو نہ صرف بحفاظت
کلکتہ پہنچا دوں بلکہ وہاں سے مغربی پاکستان پہنچانے کا بندوبست بھی کروں۔"

مجید کو بھی اب ان سوالوں سے زیادہ مغربی پاکستان پہنچنے کی فکر تھی۔ سلطانہ کے
بعد اب ایک ہی امید رہ گئی تھی کہ شاید افرور مغربی پاکستان پہنچ گئی ہو اور کسی موڑ
اس سے ملاقات ہو جائے۔

جھگی نما یہ سائبان دراصل ان افراد کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اس لیے کہ جیپ انہوں نے
وہیں چھوڑ دی۔ باقی سفر پیدل طے کرنا تھا۔

مجید کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر کوئی ان راستوں سے واقف نہ ہو تو جان سے
تو جا سکتا ہے یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔

یہاں بھی انہیں ایک گھر ملا جس کا ایک دروازہ پاکستان میں کھلتا تھا دوسرا بھارت
میں۔ بارڈر سیکورٹی فورس کو شاید پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا یا پھر ان دنوں سرحدیں بالکل
آزاد چھوڑ دی گئی تھیں۔ یہ قافلہ بغیر روک ٹوک سرحد پار کر گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد ایک جیپ تیار کھڑی تھی جس پر انہیں سوار کر دیا گیا۔ اس مرتبہ مجید کو ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بٹھایا گیا۔

پچھلی جیپ کا ڈرائیور' مالک اور بوڑھے کا بیٹا جو انہیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے واپس ہو گئے۔ مجید کچھ دیر ان کی ہمت کو داد دیتا رہا کہ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد بھی وہ تھکے نہیں تھے۔ اب اتنی ہی مسافت طے کرنے کے بعد وہ اپنی جیپ تک پہنچیں گے لیکن جتنی رقم انہیں مل چکی تھی اس میں یہ محنت بری نہیں تھی۔

یہ جیپ انہیں لے کر کلکتہ پہنچ گئی۔ تمام مسافر تو راستے ہی میں اتر گئے البتہ مجید کو لیکر یہ جیپ ایک شاندار ہوٹل کے سامنے پہنچ گئی۔

"آپ یہاں قیام کریں گے' تھکن اتاریں گے اور کل آپ کے پاسپورٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔"

وہ حیران تھا کہ آخر چال کیا ہے۔ میری خاطر مدارت کیوں ہو رہی ہے۔ اتنے بڑے ہوٹل میں مجھے ٹھہرایا ہے مگر کیوں؟

اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ وہ رات اس نے ہوٹل میں گزاری صبح ہوتے ہی اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"چلئے۔" دروازے پر موجود شخص نے کہا۔

"کہاں؟"

"آپ کے پاسپورٹ کا انتظام کرنا ہے۔"

ہوٹل کے نیچے وہی جیپ کھڑی تھی جس میں رات وہ یہاں آیا تھا البتہ ڈرائیور تبدیل ہو گیا تھا۔

جیپ اسے لے کر انگریزی طرز کی شاندار عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔

"آیئے۔"

وہ شخص اسے لے کر عمارت کے اندر پہنچ گیا۔ وہ حیران تھا کہ اس رہائشی عمارت میں پاسپورٹ کا کیا کام' پاسپورٹ تو پاسپورٹ کے دفتر میں بنتے ہیں اور یہ دفتر نہیں ہے۔ اس کی حیرانی تو اس وقت ختم ہوئی جب اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہاں اس نے عوامی لیگ کے جنرل سیکریٹری تاج الدین کو بیٹھے دیکھا۔

"اچھا تو آپ ہیں مسٹر مجید۔ سبھاش کا پیغام ہمیں مل گیا ہے۔"

"آپ مجھے ایک بات بتائیں گے؟"

"پوچھو۔"

"وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟"

"جو انہوں نے مجھے بتایا ہے اس کے مطابق یہ مہربانی اس لیے ہے کہ آپ ان کے بیٹے کے پروفیسر تھے۔"

"بس یہی وجہ ہے؟"

"میاں تم آم کھاؤ' پیڑ کیوں گنتے ہو۔ تمہاری جان بچ گئی ان کے بیٹے کی وجہ سے۔ وہ تو تمہاری گستاخی کی سزا دینا چاہتے تھے مگر ان کا بیٹا آڑے آ گیا۔ سزا دیے بغیر زندہ حالت میں وہ تمہیں ڈھاکہ میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اگر کسی طرح تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ مسٹر سبھاش ہیں' اور تمہاری زبان چل جاتی تو خود ان کی جان کو خطرہ تھا۔ تمہیں ڈھاکہ سے نکال دینا خود ان کے مفاد میں تھا۔"

تاج الدین نے گھنٹی بجائی اور ایک ملازم اندر آ گیا۔

"فوٹو گرافر کو بلاؤ۔"

"جی۔"

ایک شخص کیمرہ لے کر اندر آ گیا اور مجید کی تصویریں کھنچ گئیں۔

"آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ یہ پاسپورٹ فارم ہے' اسے بھر دیجئے۔"

مجید نے وہیں بیٹھ کر یہ فارم بھر دیے۔

"آپ کا پاسپورٹ اور ٹکٹ کل شام تک آپ کے ہوٹل پہنچ جائے گے۔"

تاج الدین نے کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

وہی شخص جو اسے یہاں لے کر آیا تھا' اندر آیا اور اسے لے کر عمارت سے باہر نکل آیا۔

☆○☆

پاک فوج کی جنگی صلاحیتوں کو بے اثر بنانے کے لیے مکتی باہنی کو منظم کیا جا رہا تھا اور سیاسی رنگ دینے کے لیے بھارتی حکومت عوامی لیگ کی مفرور قیادت کو استعمال کر رہی تھی۔ تاج الدین، قمرالزماں، منصور علی، مشتاق خوند کر سب یہاں موجود تھے اور انہوں نے جلاوطن حکومت قائم کر لی تھی۔ اس حکومت کا مشن تھا کہ مکتی باہنی کی مسلح جدوجہد اور بھارت کی سرپرستی سے بنگلہ دیش کو آزاد کرایا جائے۔

دراصل بھارت اس فورس کو آگے رکھ کر پاکستان کو کھلی جنگ کے لیے مجبور کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مکتی باہنی پاک فوج سے جھڑپوں کا آغاز کرے۔ گوریلا کارروائیوں کے ذریعے پاکستانی افواج کو مختلف علاقوں میں الجھائے رکھے اور جب بھارت کی باقاعدہ فوج فیلڈ میں اترے تو یہ وقت اس کے لیے فیلڈ فورس کا کام دے سکے۔

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک بھارتی جرنیل ان کی تربیت پر مامور تھا اور عوامی لیگ کے مفرور رہنما انہیں پناہ گزیں ثابت کر کے عالمی سطح پر ان کے مسائل کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ تاکہ عالمی ہمدردیاں بھارت اور بنگلہ دیش کے حق میں ہوں اور اگر جنگ ہو تو حقوق کے حصول کی جنگ بن جائے۔

تاج الدین، سازش کے اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ ان کے لیے پاسپورٹ، ویزا اور ٹکٹ کیا مسئلہ تھے۔ دوسرے دن کی شام ابھی ہوٹل کی دیواروں تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ یہ تمام چیزیں اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

یہ پاسپورٹ پاکستان پہنچتے ہی جلا دیجئے گا۔ پھر اس کے بعد آپ جانیں آپ کا کام۔" پاسپورٹ لے کر آنے والے نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ کل سے اس کمرے میں تنہا تھا لیکن اچانک اسے احساس ہوا جیسے وہ ابھی اکیلا ہوا ہے۔ ہجرت کا گہرا زخم ابھی ابھی لگا ہے۔ اب وہ ہندوستان کا شہری ہے۔ وہ گلیاں وہ چوبارے اس سے بچھڑ گئے ہیں جہاں اس کا بچپن کھیلا کرتا تھا۔ یا تو وہ وہاں سے نکلنے کو بے چین تھا یا اب جی چاہتا واپس ڈھاکہ چلا جائے۔ اس طرح بھاگ کر آنا مردانگی تو نہیں۔ وفاداری کے یہ تقاضے تو نہیں ہوتے۔ دھوپ سے بچ کر سائبان میں آ گئے۔ کیا یہی ہے وطن کی محبت۔ کیسا وطن! جب وطن پر دشمن کا راج ہو جائے تو دوست بچھڑ ہی جاتے ہیں۔ اچانک سلطانہ کمرے میں آ گئی۔ بھیا! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ وہ

تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ تو کیوں بچھڑ گئی۔ اس وقت تو بھی ہوتی تو میں یوں اکیلا تو نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اسے یاد آیا۔ سلطانہ' تو مغربی پاکستان جانے کو تیار نہیں تھی۔ تو اپنی دھن کی پکی نکلی مگر تو تو اپنا گھر بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ گھر بھی چھن گیا دنیا بھی۔ تو کہا کرتی تھی اس گھر میں تجھ سے ماں ملنے آتی ہے مگر یہ کیسا انصاف ہے کہ تو مجھے چھوڑ کر اس سے ملنے چلی گئی۔ مگر اچھا ہی ہوا بغیر پیروں کے تو زندگی کے پیچھے کب تک بھاگتی۔ میری طرح کب تک ذلیل ہوتی۔ وطن کی تاریخ میں تو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اسے افروز کا خیال آیا۔ اس معصوم لڑکی نے میرے لیے کتنے دکھ اٹھائے۔ مجھ سے ملنے آئی تھی کہ بچھڑ گئی۔ مجھ سے بھی اپنے والدین سے بھی لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تو زندہ ہے تو میں تجھ سے ملوں گا ضرور۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ماں باپ آج ہی مرے ہوں۔ سفر پر جاتے ہوئے عزیزوں سے ملا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے پیاروں کو یاد کر رہا تھا۔ بچھڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ اس ہجرت نے اس سے کیا کیا چھین لیا تھا مگر جو مل رہا تھا وہ ان سب زخموں کا مرہم تھا۔ پاکستان اس کا وطن تھا اور اب وہ پاکستان جا رہا تھا۔

وہ رات باتوں میں گزر گئی' آنکھوں میں کٹ گئی۔ چہرے' آنکھیں' لب' سائے' تصور سب اس سے محو گفتگو تھے۔

راتوں میں جو چھڑ گئی ہیں باتیں
باتوں میں گزر گئی ہیں راتیں

دوسرے دن ہوٹل سے باہر نکلا۔ سفر کے لیے ایک بریف کیس ہی خرید لوں۔ کچھ کپڑے خرید لوں۔ کسی کو شک تو نہ ہو میں کہاں سے بھاگ کر آیا ہوں۔

کلکتہ میں زندگی پوری آب و تاب سے رواں دواں تھی۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ نہ فوجی تھے نہ باغی۔ اس نے بہت دن بعد بے فکر چہرے' مسکراتی آنکھیں دیکھیں۔ زندہ رہنے کے لیے زندگی کی رمق کتنی ضروری ہے۔ کبھی ڈھاکہ بھی ایسا ہی تھا۔ محبتوں کا گہوارہ' امن کا نشیمن۔ پھر نفرتوں کی آندھی چلی' تعصب کا سیلاب آیا۔ نہ گہوارہ رہا نہ نشیمن۔ جب محبتوں کے رشتے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں تو ظلمت کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسے وہ شعر یاد آگیا جو کبھی وہ پڑھایا کرتا تھا۔

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت میں نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

وہ لوگوں سے بے پروا، اپنے زخم اپنے ہاتھوں سے چھیلتا ہوا بازار بازار گھومتا رہا۔ ایک بریف کیس اور چند جوڑے کپڑے خریدے اور ہوٹل واپس آگیا۔

فلائٹ سے دو گھنٹے قبل اس نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔

وہ کراچی ائرپورٹ پر اترا تو اسے اپنے نام کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا، سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ یادیں تو اس جونک کی طرح ہوتی ہیں جو خون پیتی ہے، وجود سے جدا نہیں ہوتی۔

رن وے پر ایک لڑکی وھیل چیئر پر لاؤنج کی طرف جا رہی تھی۔ دوسری عورت جو غالباً" اس کی ماں تھی، وھیل چیئر کو چلا رہی تھی۔ اسے سلطانہ یاد آ گئی۔ اگر وہ اس کے ساتھ ہوتی تو ــــــــ

"ماں جی، اس بچی کو میں لاؤنج تک لے جاؤں۔" اس نے عورت کے قریب پہنچ کر کہا۔

"کیوں، کیا مقصد ہے؟" عورت نے بگڑ کر کہا۔

"ماں جی، میری ایک بہن تھی۔ اسی کی طرح معذور۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آ گئی۔"

"اور سوری! آیئے آپ اسے لاؤنج تک سہارا دے لیں۔"

"کیا ہوا تھا آپ کی بہن کو۔" عورت نے پوچھا۔

"جو ڈھاکہ میں کتنی ہی بدنصیب لڑکیوں کے ساتھ ہوا ہے۔"

"آپ ڈھاکہ سے آئے ہیں۔"

"ڈھاکہ سے آج کل آ کوئی نہیں رہا۔ لوگ فرار ہو رہے ہیں۔ میں بھی فرار ہو کر کلکتہ آیا اور اب یہاں پہنچ گیا ہوں۔"

"ہاں، ڈھاکہ میں بڑی قتل و غارت گری ہوئی ہے اور یہاں سارے بنگالی مزے سے رہ رہے ہیں۔" عورت نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ کسٹم سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو وہ لڑکی اور اس کی ماں مجید کا انتظار کر رہی

تھیں۔

"میں اپنی بہن کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" مجید نے یہ سوچ کر پوچھ لیا کہ اب تو اپنی اپنی منزل پر روانہ ہو ہی جائیں گے۔ یادوں میں ایک یاد کا اضافہ اور ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

"اس کا نام سلطانہ ہے۔"

مجید پتھر کا ہو گیا۔ قسمت ایسا بھی مذاق کر سکتی ہے۔ چہرے کے علاوہ سب کچھ وہی۔ اتنی عمر، ویسی ہی پولیو سے مرجھائی ہوئی ٹانگیں، وہی نام۔

عجیب اتفاق ہے۔ اس کا نام بھی سلطانہ تھا۔"

عورت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی بہت بڑا دھوکے باز اس کے سامنے کھڑا ہو۔

"اچھا، مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے مجید کہتے ہیں۔ شاید کبھی یاد آجاؤں۔" مجید نے کہا اور سلطانہ کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ وہ عورت بھاگتی ہوئی آئی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔

"آپ مجھے اپنا پاسپورٹ دکھائیں گے؟"

اب مجید اسے انہی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن آنکھوں سے کچھ دیر پہلے عورت اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں دیکھنا چاہتی ہیں آپ میرا پاسپورٹ۔"

"میں یہ چیک کرنا چاہتی ہوں کہ جو نام آپ نے بتایا ہے کیا وہی نام ہے آپ کا۔"

مجید نے پاسپورٹ اس کے سامنے کر دیا۔ عورت نے غور سے اس کا نام پڑھا اور چشمہ اتار کر بھیگی ہوئی آنکھوں کو صاف کرنے لگی۔

"میرے بیٹے کا نام بھی مجید تھا۔ تمہاری عمر ہی کا تھا۔ پروفیسر ہو گیا تھا کالج میں میری بیوگی کا سہارا تھا۔ اچانک ہارٹ فیل ہوا اور ------" عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ماں جی' میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔ سلطانہ میری بہن ہی تو ہے۔ میں آپ سے ملتا رہوں گا۔ آپ دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں۔"

"مجید' تم یہاں کس کے پاس آئے ہو؟ کہاں ٹھہرو گے؟ میں تم سے کبھی کبھی ملنے آیا کروں گی۔"

"ماں جی' میں تو یہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ یہاں کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے میرا۔ دیکھیے قسمت مجھے کہاں لے جاتی ہے۔"

"بیٹا' جب اتنے اتفاق ہو رہے ہیں تو ایک اتفاق اور سہی۔ تم میرے ساتھ رہو۔ میں سمجھوں گی' اتفاق سے میرا مجید مجھے مل گیا۔"

میری بہن سلطانہ مجھے اتنی آسانی سے مل جائے گی' یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا ماں جی کہ میں ہنسنے لگوں یا خوشی سے رونے لگوں۔"

"نہ تم ہنسو نہ رونے لگو' میرے گلے سے لگ جاؤ۔ بہت دن ہو گئے مجید کو گلے لگائے۔"

سلطانہ اپنی وھیل چیئر پر بیٹھی یہ انوکھا ملاپ دیکھ رہی تھی۔ جب اس سے نہ رہا گیا تو وھیل چیئر گھسیٹتی ہوئی وہ خود بھی وہاں پہنچ گئی۔

"امی! کون ہیں یہ۔"

"یہ میں تمہیں گھر چل کر بتاؤں گی۔ بیٹا مجید' کوئی ٹیکسی دیکھنا۔ کہنا دستگیر کی طرف چلنا ہے۔"

ائرپورٹ پر ٹیکسی کا کیا مسئلہ۔ کچھ ہی دیر میں ان کی ٹیکسی دستگیر کی طرف جا رہی تھی۔

قسمت کسی پر اتنی مہربان ہو سکتی ہے؟ اس وسیع و عریض شہر میں وہ کس کے دروازے پر جاتا۔ کس سے پناہ مانگتا۔ اس نے چوڑی اور طویل سڑکوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ رہنے کا ٹھکانہ بھی مل گیا اور سلطانہ بھی۔ کیا خبر یوں ہی کسی روز افروز بھی مل جائے۔

"بس بھائی' یہیں اس مکان کے سامنے روک دو۔"

عورت نے ٹیکسی والے سے کہا اور ٹیکسی رک گئی۔

مجید نے ٹیکسی کی چھت سے وھیل چیئر اتاری اور سلطانہ کو سہارا دے کر چیئر پر بٹھا دیا۔ سلطانہ کی ماں نے مکان کا تالا کھولا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوٹ کیس ڈگی سے نکل کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ مجید نے سوٹ کیس اٹھایا اور گھر میں آ گیا۔

"بس بیٹے یہیں رکھ دو' میں کمروں کے تالے کھولتی ہوں۔"

یہ تین کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرا چھت پر بنا ہوا تھا۔

"پورے ایک ماہ بعد واپس لوٹی ہوں اس لیے گھر بہت میلا ہو رہا ہے۔ تم صحن میں بیٹھو' میں ذرا کمرے صاف کر لوں۔"

سلطانہ اب تک کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے جیسے اسے اپنی ماں پر غصہ آ رہا ہو کہ نہ جانے اس راہ چلتے کو اٹھا کر میری ماں گھر کیوں لے آئی۔ وہ دونوں صحن میں بیٹھے تھے مگر اتنے اجنبی جیسے الگ الگ گھروں میں بیٹھے تھے۔ اس تنہائی سے اکتا کر وہ بھی سلطانہ کی ماں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

سلطانہ کی یہ اجنبیت صرف ایک ہی دن باقی رہ سکی۔ شام سے وہ اپنی کہانی سنانے بیٹھا' صبح تک وہ اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ فجر کی اذان ہوئی تو سلطانہ اسے دل سے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ اگلے دو چار دنوں میں مجید انکشاف ہوا کہ وہ اتنی خاموش طبع نیں جتنی نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اسی طرح مجید کو چھیڑتی' شرارتیں کرتی جیسے اس کی اپنی بہن سلطانہ اسے پریشان کیا کرتی تھی۔ بہنوں کے پاس چھیڑنے کا ایک ہی حربہ ہوتا ہے۔ "بھیا ہمارے لیے بھابی کیوں نہیں لے آتے۔" سلطانہ نے ایک مہینے بعد ہی تقاضے شروع کر دیے تھے۔

"پہلے اسے کسی قابل تو بننے دے۔ اس کی کہیں نوکری لگ جائے میں خود بہو بیاہ کر لاؤں گی۔ اس کی ماں کہتی لیکن مجید اداس ہو جاتا۔ ایک یہی بات ایسی تھی جو اس کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لیتی تھی۔ وہ طے کر چکا تھا کہ شادی صرف افروز سے کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہاسے ضرور ملے گی۔ بہن تو کسی بھی سلطانہ کو بنایا جا سکتا تھا لیکن محبت تو ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی۔

اس دوران مغربی پاکستان میں بھی کشیدگی کا زہر پھلنے پھولنے لگا تھا۔ ڈھاکہ سے جو تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں ان کے رد عمل میں یہاں بھی احتجاجی جلوسوں کا

سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر احتجاج کی تان تو یہیں ٹوٹتی ہے کہ اپنے سوا جو کچھ ہے اسے مٹا دو۔ یہاں بھی بنگالیوں کی املاک پر حملے ہونے لگے لیکن یہاں ایک تو مقابلہ برابر کا نہیں تھا' ڈرے سہمے بنگالی جوابی کاروائیاں نہیں کر رہے تھے لہٰذا اشتعال بڑھنے نہیں پایا۔ دوسرے وہ جذبہ یہاں کہاں تھا جو مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے دلوں میں تھا۔ وہ آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اور ان کی پیٹھ تھپکنے کے لیے بھارت موجود تھا۔

مجید ابھی تک اپنے لیے کوئی راستہ تجویز نہیں کر پایا تھا۔ وہ اس بے سرو سامانی میں اور غیرارادی طور پر گھر سے نکلا ہوا تھا کہ اپنی تعلیمی اسناد بھی ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ خط لکھا کر منگوا سکتا تھا لیکن ڈاک کا نظام بھی تو تلپٹ ہو چکا ہو گا۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکا۔ ان اسناد کے بغیر کون اسے نوکری دیتا۔ سلطانہ کی ماں کئی مرتبہ کہہ چکی تھیں کہ ان کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے' وہ چاہے تو اس سے کاروبار شروع کر سکتا ہے لیکن اس کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا۔ کچھ ٹیوشنیں مل گئی تھیں جس سے وہ بہ مشکل اپنا خرچ پورا کر رہا تھا۔ کبھی کبھی سلطانہ کے لیے تحفہ خرید کے لے آتا مگر ظاہر ہے اپنی اس حالت سے وہ مطمئن نہیں تھا۔

اب ڈھاکہ سے ایسی خبریں بھی آ رہی تھیں کہ مکتی باہنی کے بھیس میں بھارتی فوجی سرحدوں کے اندر داخل ہو چکے ہیں اور مختلف سیکٹروں میں پاکستانی افواج سے ان کی جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔ جیسور اور کومیلا ان کے خاص ہدف ہیں۔ دراصل دشمن' کھلی جنگ سے پہلے زیادہ سے زیادہ سرحدی علاقے پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ پاکستانی افواج مکتی باہنی سے نبرد آزما رہی اور مکتی باہنی کی پشت پناہی پر آنے والی افواج سرحدوں پر خندقیں کھودتی رہیں۔ گویا پاکستان پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔

وہاں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جاری تھیں کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر پاک فضائیہ کے حملوں سے جنگ کی ابتدا ہو گئی۔ ریڈیو پاکستان اعلان کر رہا تھا کہ پہل بھارت نے کی ہے اور پاکستانی جیٹ طیارے جوابی کاروائی کے طور پر سات ہوائی اڈے تباہ کر آئے ہیں۔

مجید بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جنگ نے اس کا کہاں تک تعاقب کیا ہے۔ اب یہاں سے کہاں جانا ہو گا۔ اپنا ریڈیو کچھ کہہ رہا تھا'

بھارت کچھ اور اعلان کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سچ کیا ہے غلط کیا ہے۔ اس کے پیارے ڈھاکہ پر کیا بیت رہی ہے۔ ایک دھماکا ہوا۔ درو دیوار لرز گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا دشمن کے طیاروں نے آگرہ تاج کالونی پر بم گرائے تھے۔ پھر یہ دھماکے معمول بن گئے۔ دشمن اتنا بے خوف ہو گیا تھا کہ کراچی کی فضاؤں میں دن دہاڑے تیرتا تھا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ ادھر ڈھاکہ ائرپورٹ پر بھارتی طیاروں نے ہلہ بل دیا۔ پاکستانی توپیں آگ اگلتی رہیں لیکن بھارت کے جدید طیاروں کا مقابلہ سیبر طیارے کب تک کرتے۔ تیسری رات کے حملے نے رن وے کو ناقابل استعمال بنا دیا۔ پاک فضائیہ بے کار ہو کر رہ گئی۔ مغربی محاذ پر جنگ چھڑ جانے سے مشرقی پاکستان بالکل کٹ کر رہ گیا۔

مجید تو یہاں بیٹھا تھا' اسے کیا معلوم چودہ دن کی مختصر جنگ میں کس پر کیا گزر گئی۔ ہمیں کس سازش نے تباہ کیا یا خود ہماری بے پروائی نے۔ وہ تو اس دن چونکا جس دن بھارتی ٹیلی ویژن ایک عجیب و غریب فلم دکھا رہا تھا۔ رمنا ریس گراؤنڈ میں ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ لاکھوں بنگالیوں کے ہجوم کو پولیس زبردستی روکے ہوئے تھی۔ جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ ایک ایک ساتھ گراونڈ میں داخل ہوئے۔ یہ منظر اتنا عبرت ناک تھا کہ اتنے بڑے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوط مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے اور ریوالور نکال کر اروڑہ کو پیش کر دیا۔ اس کے بعد جنرل اروڑہ نے پاکستانی سپاہیوں کی ایک گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا۔ اب وہی گارڈ تھے وہی آنر کے مستحق! آخری گولی اور آخری آدمی تک جنگ کرنے کے دعوے دار جنرل نیازی نوے ہزار فوج کے ساتھ جنگی قیدی بن کر جنرل ارڑوہ کے زیر کمان آ چکے تھے۔



مجید اس صدمے سے گزرا تو پھر اسے اپنے کاروبار کی فکر لاحق ہوئی۔ اس فکر میں اضافہ اس لیے بھی ہوا کہ اس کی ملاقات خورشید ظفر سے ہو گئی جو بہت چھوٹے

پیمانے پر سپلائی کا کام کرتا تھا۔ کبھی دفتروں میں اسٹیشنری سپلائی کرتا تھا' کبھی اسکولوں میں کھیل کا سامان۔ خورشید ظفر پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مجید کو تجربہ نہیں تھا اس لیے ہمت نہیں ہوتی تھی۔ خورشید ظفر سے ملاقات کے بعد اس کی ہمت ہوئی۔ ایک لاکھ روپے اس نے سلطانہ کی ماں سے لیے' ایک دفتر کرائے پر لیااور کالجوں کی لیبارٹریوں میں سائنسی سامان سپلائی کرنے کا بزنس شروع کر دیا۔ یہ آئیڈیا مجید ہی کا تھا۔

ابتدا میں ایک دو کالج ان کے پاس تھے۔ آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھنے لگی۔ اس کے ٹینڈر دھڑا دھڑ پاس ہونے لگے۔

خوش حالی آئی تو اسے افروز سے کیاہوا وعدہ یاد آیا۔ اس نے کبھی کہا تھا' وہ اپنا کاروبار کرے گا اور کسی قابل ہو گیاتو وہ اسی سے شادی کر لے گا۔ اب وہ کسی قابل ہو گیا تھا لیکن اب افروز نہیں تھی۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دیے' ریڈیو' ٹیلی ویژن سے اعلان کرایا لیکن ہر کوشش کا جواب یہی آیا کہ دنیا مختصر سہی لیکن بچھڑنے والے اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مغربی پاکستان تک پہنچ ہی نہیں سکی۔

آہستہ آہستہ اسے صبر آ گیا لیکن شادی نہ کرنے کے وعدے پر وہ اب بھی قائم تھا۔ وہ خود کو افروز کی امانت سمجھتا تھا۔ کیا خبر وہ کہیں مل ہی جائے۔ کہیں مل گئی تو کیاجواب دوں گا۔

دس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ اب امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا تھا۔ خورشید ظفر کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ بہت بڑی فرم کا اکیلا مالک تھا۔ جتنی نعمتیں ہو سکتی ہیں سب اسے میسر تھیں۔ وہی ڈھاکہ جہاں وہ ننگے پاؤں گھوما تھا' جہاں کے ایک دروازے سے مانگ کر روٹی کھائی تھی' اب وہاں جاتا تھا تو گاڑیوں میں گھومتا تھا۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کامہمان بنتا تھا لیکن اس سے بڑا قلاش بھی کوئی نہیں تھا۔ جس کے لیے دولت کما رہا تھا وہی نہیں تھی۔ وہ جنگل کے اس مور کی طرح تھا جس کا رقص دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور جب رقص دیکھنے والا ملا تو وہ رقص کرنا بھول گیا۔

وہ پارٹنر شپ میں گارمنٹ فیکٹری قائم کر رہا تھا۔ اس کا پارٹنر نوجوان آدمی

تھااور امریکا سے تعلیم مکمل کر کے اسی سال واپس آیا تھا۔ اس کانام ادریس بیگ تھا۔ دو چار ملاقاتیں ہوئی تھیں جو خالص کاروباری تھیں لیکن ادریس میں کچھ ایسی خوبی تھی کہ یہ چند ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ ڈیفنس کی ایک شاندار کوٹھی میں اپنے والدین اور بیوی کے ساتھ مقیم تھا۔

"آپ کو شاید معلوم نہ ہو میں تصویریں بناتا ہوں۔ آیئے میں آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھاؤں۔" کچھ دیر کاروباری کا باتیں کرنے کے بعد ادریس نے کہااور اسے اپنے سٹوڈیو میں لے گیا۔ اسٹوڈیو کیا تھا' وہ کمرہ تھاجسے شیش محل کہنا چاہیے۔ ہر آئینے میں ایک افروز کھڑی تھی۔ ہر طرف افروز کی تصویریں بکھری ہوئی تھیں اسے اپنے وہم پر ہنسی آنے لگی لیکن یہ اس کا وہم نہیں تھا۔

"ایک ہی لڑکی کی اتنی تصویریں! کیا یہ کوئی آئیڈیل ہے آپ کا۔" مجید نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی مجرم موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے پہلے پوچھ رہا ہو' کہاں دستخط کروں۔

"ارے نہیں صاحب' یہ بیگم ہیں میری۔ یہ دیکھیے' یہ ان کی وہ تصویر ہے جب وہ کالج میں پڑھتی تھیں۔"

اس چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو ابھی تک مجید کے تصور میں زندہ تھی۔

چند تصویریں یہاں ایسی بھی تھیں جن میں کوئی پروفیسر لیکچر دینے میں مصروف تھا۔

"اور یہ وہ خیالی پروفیسر صاحب ہیں جو ہماری بیگم کا آئیڈیل ہیں۔ صاحب' یہ لڑکیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ کالج میں ہم نے بھی پڑھا لیکن عشق کسی پروفیسر سے نہیں کیا مگر لڑکیاں ------ کسی نہ کسی پروفیسر کو آئیڈیل ضرور بناتی ہیں اور ہماری بیگم تو عاشق ہیں اس معلمی کے پیشے کی اور جناب لطیفہ یہ ہے کہ شادی ہوئی تو بزنس مین کے ساتھ۔ کسی پروفیسر سے شادی ہو جاتی تو بھوکوں مرتیں مگر خوش بہت رہتیں۔ آپ ہی کا ہم نام کوئی پروفیسر تھا ڈھاکہ میں' اس کی بہت تعریف کرتی ہیں بلکہ مجھے تو اب یہ

شک ہونے لگا ہے کہ کہیں انہیں اس پروفیسر سے سچ مچ کا عشق تو نہیں ہے۔ خیر چھوڑیے ------ یہ دیکھیے میری شاہ کار تصویر۔"

وہ تصویریں دکھاتا رہا مگر اب مجید کی بینائی چھن چکی تھی۔ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اب تو وہ افروز کی تصویریں بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بس یہی بہت تھا کہ وہ زندہ تھی اور بہت دن بعد اسے دیکھ لیا تھا۔ تصویروں ہی میں سہی۔

جب وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھے تو جیسے دنیا ہی بدل چکی تھی۔ مجید کا دم گھٹ رہا تھا مگر ابھی اسے کچھ اور پوچھنا تھا۔

"کب ہوئی آپ کی شادی؟" مجید نے پوچھا۔

"ابھی پچھلے سال۔"

"امریکا میں؟"

"جی ہاں۔"

"یہ خاتون بھی وہیں تھیں؟"

"جی' یہ محترمہ بھی وہیں تھیں۔ محترمہ کیا' میری خالہ زاد ہیں۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے یہ ڈھاکہ میں پڑھتی تھیں۔"

"پڑھتی تھیں مگر سقوط ڈھاکہ کے وقت ان کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہوا۔ بنگالیوں نے ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ یہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلیں۔ ہمارے ماموں ان دنوں چٹاگانگ میں تھے' ان کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ انہیں لے کر امریکا میری امی کے پاس آگئے۔ ان کی وہی رٹ تھی کہ میرا آئیڈیل پروفیسر ہے مگر شادی مجھ سے کرنی پڑ گئی۔ ارے باتوں میں چائے کا خیال تو رہا ہی نہیں۔"

اس نے انٹر کام اٹھایا اور افروز سے مخاطب ہوا۔

"ہاں بیگم' وہ جو میں نے ذکر کیا تھا نا مجید صاحب کا۔ وہ کب سے آئے بیٹھے ہیں' چائے بھجوا دیں اور چاہیں تو آپ بھی آ جائیں۔"

"نہیں چائے رہنے دیں' پھر کبھی پی لوں گا۔"

"بس آئے جاتی ہے۔"

"نہیں' میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت اجازت دیں۔"

"ارے، آپ کو تو پسینے آ رہے ہیں۔ ٹھہریئے میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"نہیں آپ، زحمت نہ کریں، میں ڈاکٹر کو دکھاتا ہوا جاؤں گا۔ کوئی خاص بات نہیں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔"

"کام کی زیادتی سے۔" ادریس نے کہا اور انٹر کام پھر اٹھا لیا۔

"افروز چائے رہنے دو، مجید صاحب جا رہے ہیں۔"

مجید اس کی کوٹھی سے نکلا تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے گیٹ سے باہر کھڑی ہوئی اپنی کار کا دروازہ کھولا اور غیرارادی طور پر اوپر کی جانب دیکھا۔ اوپر کی منزل میں ایک سایہ سا لہرایا اور غائب ہو گیا۔

"افروز۔" مجید نے دل ہی دل میں اس سائے کو پکارا۔

سقوط ڈھاکہ آج مکمل ہو گیا تھا۔ آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر سلطانہ کے لیے اسے زندہ رہنا تھا۔



گدی نشین

وہ غلاظت کے ڈھیر پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے اسی غلاظت نے کروٹ بدل کر اسے باہر نکال دیا ہو۔ پنڈلیوں تک اس کے پاؤں اب بھی سیال گندگی میں دھنسے ہوئے تھے۔ اس کا اوپری بدن بالکل ننگا تھا البتہ میل کی تہوں نے جسم کی کھال کو' لباس کی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ سر کے بال اڑ چکے تھے' داڑھی کو جہاں تک چہرہ نظر آیا تھا' پھیلتی چلی گئی تھی۔ داڑھی کے بالوں میں بھی ابھی سپیدی نے رنگ نہیں جمایا تھا' جس سے اس کی عمر کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کی عمر کسی طرح بھی چالیس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کی آنکھوں میں وہی وحشت تھی جو دیوانوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں دنیا بھر کی غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی انگلیوں کو تازہ ترین غلاظت سے بھر لیتا تھا اور قریب سے گزرنے والوں کی طرف دیکھ کر زور سے چلاتا تھا "لے کھالے' لے چاٹ لے۔"

وہ اس طرح اپنی انگلیاں ہوا میں لہراتا تھا کہ کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر جو اس طرف سے گزر رہا ہوتا تھا' ناک پر رومال رکھے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔

شہر سے مضافات کی طرف جانے والی سڑک ایک جگہ پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ ایک سڑک چند میل دور ایک نواحی بستی تک جاتی تھیں جبکہ دوسری سڑک کچھ دور جا کر گندگی کے اس ڈھیر پر ختم ہو جاتی تھی جہاں وہ ننگ دھڑنگ فقیر نہ جانے کب سے' کس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

یوں تو یہ جگہ' گزرگاہ نہیں تھی لیکن قریب ہی بھینسوں کے کئی باڑے تھے اس لئے اکا دکا ٹرک یا ایک آدھ پیدل چلنے والا اس طرف سے ہو کر گزر ہی جاتا تھا اور لے کھالے' لے چاٹ لے کی گونج میں تقریباً بھاگتے ہوئے اپنا راستہ طے کرتا تھا۔

یہ جگہ شہر کی مرکزی کوڑا گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مردہ جانوروں کے ڈھانچے، جانوروں اور انسانوں کا فضلہ اور جو کچھ بھی ہو سکتا تھا، بلدیہ کی گاڑیاں اس نامعلوم فقیر کی خدمت میں لا کر پٹک دیتی تھیں۔ آلائش کی بدبو دور دور تک محسوس کی جاتی تھی لیکن وہ گمنام فقیر سردی، گرمی برسات سیال گندگی میں پنڈلیوں تک دھنسا ہوا "لے کھالے، لے چاٹ لے" کی گردان رٹتا رہتا تھا۔

جہانگیر کو اس شہر میں آئے ہوئے چوتھا دن تھا کہ اس کی نظر اس فقیر پر پڑی۔ وہ راستہ بھول کر اس طرف آ نکلا تھا۔ بدبو کے بھبکے نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے شدید گرمی کے باوجود جلدی جلدی گاڑی کے شیشے چڑھا لئے۔ اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد یہاں سے گزر جائے کہ اس کی نظر اس فقیر پر پڑی۔ یہ کوئی اتنی انوکھی بات نہیں تھی۔ پاگلوں کو بہت سی چیزوں کا ہوش نہیں ہوتا، بدبو کیسی۔ بہت سے لوگ وہاں سے گزرتے تھے مگر کسی نے کبھی کچھ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سوچنے کے لئے رک کر غور کرنا ضروری تھا مگر وہاں کھڑے ہونے کی ہمت کس میں تھی!

جہانگیر بھی تیزی سے گاڑی بھگا کر وہاں سے روانہ ہو ہی چکا تھا۔ لیکن اس کے فطری تجسّس نے اسے زیادہ آگے نہیں بڑھنے دیا۔ یہ کون آدمی ہے جو گندگی کے اس ڈھیر پر اتنے آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے سوچا اور غیرارادی طور پر اس کے پاؤں بریک پر چلے گئے۔ اس نے گاڑی گھمائی اور بدبو کے ڈھیر سے کچھ دور ٹھہر کر گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ شیشے ابھی تک چڑھے ہوئے تھے۔ فقیر نے اسے دیکھ کر پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ وہ بڑ بڑا بھی رہا تھا لیکن شیشے بند تھے اس لئے اس کی آواز گاڑی کے اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔ جہانگیر نے شیشوں کو ذرا سا اتارا۔ بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ اس نے شیشے پھر بند کر لئے۔ مگر وہ تو یہ سننا چاہتا تھا کہ فقیر کہہ کیا رہا ہے۔ اس نے کچھ دیر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فقیر کے چلتے ہوئے ہونٹوں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب ایک ہی ترکیب اس کے ذہن میں آسکی۔ اس نے اپنے رومال کو پرفیوم میں تر کر کے ناک سے لگایا اور گاڑی کے شیشے اتار دیئے فقیر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"لے کھالے، لے چاٹ لے۔"

انگلیوں پر لتھڑی ہوئی گندگی کھانے یا چاٹنے کے تصور ہی سے اسے ابکائی آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیشے پھر چڑھا لئے۔ اب وہ باہر دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے اس اسرار پر غور کرنا شروع کر دیا۔

روحانیات اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس نے اس موضوع پر لکھی گئی تقریباً تمام کتابوں کو بڑی عرق ریزی سے پڑھا تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ انسان کے پاس ایک ایسی مخفی قوت موجود ہے کہ اگر وہ اسے کام میں لے آئے تو ایسے ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے کہ ظاہر میں نگاہیں حیرت زدہ رہ جائیں۔ وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا لیکن روحانی قوت پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے کتب خانے میں کالے جادو' مسمریزم' ٹیلی پیتھی' حاضرات ارواح اور صوفیاء کے روحانی احوال پر مبنی ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ دن رات ان کتابوں کا مطالعہ اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ تجربے کے طور پر اس نے کئی عمل بھی کئے تھے' چلے بھی کھینچے تھے لیکن اس پر کوئی راز' کوئی اسرار ابھی تک ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کے اسی شوق نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا تھا اور اب وہ پچھلے چار دن سے چند کتابوں' اپنی پسندیدہ کار اور چند جوڑے کپڑوں کے ساتھ اس شہر میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔

اس کے والد اے۔ صمد درانی نہایت دنیا دار' دولت مند اور ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ جہانگیر کو اپنی طرح مشاق تاجر یا بڑا سرکاری افسر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی تعلیم و تربیت بھی انہی خطوط پر کر رہے تھے لیکن جہانگیر مسلسل ان کی تمام کوششوں پر پانی پھیرنے پر تلا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اس کے عجیب و غریب شوق تھے۔ مردوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں تک اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ شہر کے شعبدہ بازوں سے اس کی دوستی تھی جن سے وہ کئی محیرالعقول کرتب سیکھ چکا تھا۔ اس کے یہ کرتب خاندان کی لڑکیوں کے لئے نہایت جاذب توجہ تھے۔ انہی میں اس کی چچازاد عمرانہ بھی تھی جو اسے اس صدی کا سب سے بڑا جادوگر سمجھتی تھی لیکن درانی صاحب اس کی ان حرکتوں سے بہت نالاں تھے۔ وہ ابھی پندرہ سال کا تھا کہ اس کے باپ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ "وہ اپنے گھر میں کسی جادوگر' بازی گر کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔"

جہانگیر خود بھی اپنی اس حالت سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کرتب ہاتھ کی صفائی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خود کو روحانی قوت کا سرچشمہ بنا لینا چاہتا تھا۔ ایسی قوت' جس کے ذریعے وہ پلک جھپکتے جہاں جانا چاہے پہنچ سکے۔ لوگوں کے درمیان سے اسی طرح غائب ہو جائے جیسے تھا ہی نہیں' آئندہ کی باتیں اس پر روشن ہو جائیں' وقت اس کی گرفت میں ہو' پرندے اس سے باتیں کریں۔ ہوا' بادل غرض ہر چیز پر اس کا تصرف ہو جائے۔ ایسے بہت سے قصے اس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔ اسے یقین بھی تھا کہ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی نادیدہ منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے۔ کئی راتیں قبرستانوں میں گزار دیں' مزاروں کے چکر لگائے' کسی کامل رہنما کی تلاش میں دربدر پھرا۔ رہنما ملے بھی' روشنی نظر بھی آئی لیکن وسعت دامن سے بہت کم۔ تاریکی میں جگنو کی طرح' جبکہ وہ تو ایسی روشنی کا طالب تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں' جسم تحلیل ہو جائے' صرف روح ہی روح باقی رہ جائے۔

اس کا حوصلہ تھا کہ وہ پاگل نہیں ہو گیا ورنہ اس نے ایسے کئی قصے پڑھے تھے کہ اس راہ کے مسافر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے یا جان سے گزر گئے۔ ویسے اس کے باپ کا خیال تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔

عمرانہ میڈیکل میں پہنچ گئی تھی۔ اتنا پڑھ لکھ لینے کے باوجود وہ ابھی تک جہانگیر کو پسند کرتی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کو اس کی بے پناہ ذہانت کا نتیجہ سمجھتی تھی۔ البتہ دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ضرور تھی۔ ان میں اکثر اس قسم کی بحثیں ہوتی تھیں۔

عمرانہ کہتی "تم روح کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہو جبکہ جسم بذات خود ایک بڑی حقیقت ہے۔"

مگر کم تر درجے کی حقیقت' اور دانش مندی یہ ہے کہ انسان ہر حالت میں اعلیٰ درجے کی تلاش کرتا رہے" جہانگیر کہتا۔

"بے شک! تلاش کرتا رہے لیکن جسم کی نفی کرنا بھی دانش مندی نہیں۔"

"میں نفی کب کر رہا ہوں۔"

اگر نفی نہیں کرتے تو شادی کر لو" وہ اسے چھیڑتی۔
یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ شادی کا تعلق جسم سے نہیں روح سے ہے۔"
"چلو یہی سہی' جس سے روح کہے اس سے شادی کر لو۔"
"ابھی مجھے کچھ سوالوں کے جوابات درکار ہیں' وہ مل جائیں پھر شادی بھی کر لوں
گا۔"

"ان سوالوں کے جواب تمہیں کبھی نہیں مل سکیں گے۔"
"جواب نہ ملنا بھی ایک جواب ہے" وہ فلسفیانہ انداز میں کہتا۔ اس کے بعد
بث کوئی اور رخ اختیار کر لیتی اور اکثر بدمزگی پر ختم ہوتی۔
یہ بدمزگی اس وقت تو اپنی انتہا کو پہنچ گئی' جب اس کی ماں بھی اس سازش میں
شریک ہو گئی۔
بس بن چکے جوگی سادھو۔ عمرانہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اور تمہارے ابو چاہتے
ہیں کہ ہم تمہاری شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔ پھر تم جانو' تمہارا
کام۔"
"لیکن ...."
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔"
جہانگیر نے خطرے کی بو کو قریب محسوس کیا۔ وہ برسوں کی محنت اس طرح برباد
ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ عمرانہ اس کے گرد کھنچے ہوئے حصار میں
داخل ہو کر اس کی عبادت کو بھنڈ کرتی' اس نے چند کتابیں اپنی کار میں لا دیں اور بغیر
ارادہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔
گھومتا پھرتا اس شہر میں آنکلا۔ یہاں پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس کا ایک دوست
ارشد بھی تو اسی شہر میں مقیم ہے۔ کسی نہ کسی طرح اس نے ارشد کا کھوج لگا لیا اور
پچھلے چار دن سے وہ اسی کے پاس مقیم تھا۔
ابھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آئندہ اسے کیا کرنا ہے۔ کون سے ویرانے کی
خاک چھاننی ہے کہ قسمت اسے اس ویرانے کی طرف لے آئی۔
راستہ بھٹک کر یہاں تک پہنچنا اسے اشارہ غیبی معلوم ہونے لگا۔ اس کا مرشد

اس کے سامنے تھا۔ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ماحول کی سختی برداشت کرنے کی قوت کا حصول بھی روحانی کیفیت ہے لیکن ماحول کو ذہنی تصور کے مطابق ڈھال لینا اس کیفیت کی بلند ترین شکل ہے۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ مرد فقیر ابھی کس منزل میں ہے۔ ماحول کی غلاظت کو برداشت کر رہا ہے یا اسے تبدیل کر چکا ہے۔ غلاظت اب بھی غلاظت ہے یا اس کے وجود مبارک سے خوشبو بن چکی ہے۔

اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک فیصلہ کیا اور نہایت پختہ ارادے کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

بدبو کا ایک بڑا ریلا اس کے وجود سے ٹکرایا لیکن وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ کم از کم "برداشت" کی منزل تک تو وہ بھی پہنچ چکا ہے۔

فقیر نے اسے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ کر فلک شگاف نعرہ فضا میں بلند کیا۔ اس کی بھیانک آواز نے ان گدھوں کو بھی چونکا دیا جو مردہ جانوروں کا گوشت نوچنے کے لئے زمین پر اتر آئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے فضا میں بلند ہوئے اور پھر زمین پر اتر آئے۔ فضا پھر ساکت ہو گئی۔

فقیر نے اسے گھور کر اپنی انگلیاں ہوا میں بلند کیں اور اپنا مخصوص نعرہ بلند کیا "لے کھا لے' لے چاٹ لے۔"

جہانگیر جو بدبو برداشت کرنے کا مظاہرہ کر چکا تھا' فقیر کی اس حرکت پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ انگلیوں سے ٹپکتی ہوئی غلاظت پر نگاہ پڑتے ہی اس کا دل متلانے لگا۔ اس نے آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ پھر اس نے سوچا یہ ضروری تو نہیں کہ میں اس کی انگلیاں چاٹ ہی لوں۔ میں تو صرف اسے آزمانا چاہتا ہوں اور اسے کیا' اپنے علم کو آزمانا چاہتا ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ اس نے جی کڑا کر کے فقیر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

اس پر اچانک یہ عقدہ کھلا کہ بدبو غائب ہو چکی ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ شاید وہ اس بدبو کا عادی ہو چکا ہے اس لئے احساس مردہ ہو گیا ہے لیکن جب ناقابل

بیان خوشبو نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تو اسے یقین ہونے لگا کہ معاملہ کچھ اور ہے' اس نے ایسی خوشبو اس سے پہلے نہیں سونگھی تھی۔ لگتا تھا' جنت کا دروازہ اس کے استقبال کے لئے کھل گیا ہے۔ خوشبو کی نمی وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا جیسے اسے کسی نے گلاب سے نہلا دیا ہو۔

غلاظت کا ڈھیر' مردہ جانوروں کے ڈھانچے' گدھوں کی یلغار سب کچھ اسی طرح تھا مگر خوشبو کہتی تھی کہ ساری دنیا کے گلاب اس کے قدموں میں بچھ گئے ہیں۔

خوشگوار حیرت اور خوف اور ملے جلے تاثرات کی دھند سے باہر جھانک کر اس نے فقیر کی طرف دیکھا۔ فقیر اس طرح خوشی سے جھوم رہا تھا جیسے بین کے سامنے سانپ ناچتا ہے۔

جہانگیر نے عالم حیرت سے قدم باہر نکالا اور فقیر کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اب خوشبو کی صورت تبدیل ہو گئی تھی۔ پھولوں کی جگہ مرغن کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو تھی۔ جیسے وہ کسی وسیع و عریض دسترخوان کے سامنے کھڑا ہو۔ اس کی بھوک چمکنے لگی۔ فقیر کی انگلیوں سے غلاظت کی جگہ گھی ٹپک رہا تھا۔

"آجا' آجا! تو ہی میری نجات ہے۔ میری پشت کا خنجر ہے۔ میرے گلے میں پڑا کانٹوں کا ہار ہے۔" فقیر نے چند بے معنی کلمات سے اس کا استقبال کیا۔

"پیرو مرشد' میں روشنی کی تلاش میں یہاں تک پہنچا ہوں۔"

"یہاں روشنی کہاں! یہاں تو کھانا ہی کھانا ہے۔ مرداروں کی بستی ہے یہ' تو بھی نوچ لے کوئی جسم' فقیر نے پھر عجیب سی باتیں شروع کیں۔

"مجھے کھانوں سے کیا غرض' میری روشنی تو آپ ہیں۔"

"مار دے مجھے' نکال لے میری روشنی۔"

"پیرو مرشد' میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

جہانگیر کی آنکھیں برابر فقیر کی انگلیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی اس حرکت پر فقیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور انگلیوں کو اس طرح بغلوں میں چھپا یا جیسے کوئی خزانے کی حفاظت کرتا ہے۔

"آپ نے یہ کہہ کر مجھے بلایا تھا--- لے کھالے' لے چاٹ لے۔"

"مگر تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ضروری تو نہیں کہ انگلیاں چاٹ ہی لوں۔ میرا تماشا دیکھنا مقصود تھا' دیکھ لے۔"

اب جہانگیر اس کے کشف کا قائل بھی ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جس روشنی کی تلاش میں تھا اس کے ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ فقیر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ "میں اپنی مراد لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"چاہتا کیا ہے؟"

"انگلیاں چاٹنا چاہتا ہوں۔"

"ڈاکو' مجھے لوٹنا چاہتا ہے۔"

"خیرات لینا چاہتا ہوں۔"

"تو لے لے۔ یہ سب سب پڑا ہے' مار لے منہ۔"

جہانگیر سمجھ رہا تھا کہ یہ فقیر اسے چند نوالوں پر ٹرخانا چاہتا ہے اور وہ اس سستے سودے پر تیار نہیں تھا۔ میں آپ کے ہاتھ سے کھاؤں گا۔

"کیوں کھائے گا میرے ہاتھ سے۔ کون ہے تو میرا پاپی شعبدے کے بازناں کا دل دکھاتا ہے' مجھ سے ناتا جوڑتا ہے۔"

"ابھی تو آپ نے کہا تھا' آپ کی نجات مجھ سے ہے۔ اب آپ پوچھتے ہیں' میں کون ہوں آپ کا۔"

جہانگیر اس کا پیچھا کہاں چھوڑنے والا تھا۔ ان سوال و جواب میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ فقیر نے ٹوٹنا شروع کر دیا۔

"اب تو اپنی بربادی خود چاہتا ہے تو مجھے کیا۔ پر تو کھائے گا کیسے؟ روٹی تو لے کر آ۔"

"نہیں! روٹی کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں' لانی ہو گی روٹی تجھے۔" فقیر نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"باباجی' میں ابھی روٹی لے کر آیا۔ گاڑی ہے میرے پاس۔"

"فقیر پھر غصے میں آ گیا۔ "اس شیطان پر سوار ہو کر آیا تو جلادوں گا تجھے بھی اسے بھی۔ پیدل آئے گا تو' سمجھا۔ جا بھاگ جا۔" فقیر نے اس طرح اپنی جگہ سے

جنبش کی جیسے مارنے کے لئے اٹھنا چاہ رہا ہو۔

جہانگیر بے بسی سے اٹھا' گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ فقیر میرا امتحان لینا چاہتا ہے اور کچھ نہیں' مگر میں بھی ہر امتحان میں پورا اتروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ ہی کرنا پڑا۔ شکر ہے روٹی لانے کو کہا' کوئی بڑا بوجھ مجھ پر نہیں ڈال دیا۔' اس نے دل ہی دل میں فقیر کا شکریہ ادا کیا'۔ روٹی کا کیا ہے کسی بھی ہوٹل سے مل جائے گی۔ رہا پہنچنے کا مسئلہ' بس کے ذریعے مین سڑک تک تو پہنچ ہی جاؤں گا۔ پھر پیدل سہی۔'

شہر میں پہنچتے ہی اس نے گاڑی کو ارشد کے گھر کھڑا کیا اور روٹیاں خریدنے کے لئے بازار جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا۔ دو چار روٹیاں تو گھر میں بھی ہوں گی' بازار جا کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

ارشد ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ جہانگیر نے اس کی بیوی سے پوچھا "بھابی' دو چار روٹیاں ہوں گی؟"

"ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ ارشد کا انتظار کریں گے' اس کے ساتھ کھائیں گے۔" وہ بے چاری یہ سمجھی تھی کہ جہانگیر کھانا مانگ رہا ہے۔

"نہیں' کھانا نہیں ہے۔ بس آپ چار روٹیاں جلدی سے ایک کاغذ میں لپیٹ دیں۔"

"کاغذ میں! اور سالن؟"

"نہیں ' سالن نہیں۔"

وہ بے چاری اس عجیب و غریب فرمائش پر حیران رہ گئی۔ کیا اعتراض ہو سکتا تھا' اس نے روٹیاں کاغذ میں لپیٹ دیں"

جہانگیر' روٹیاں لے کر اس طرح باہر کی طرف بھاگا جیسے چیل' گوشت جھپٹ کر فضا میں تیر جاتی ہے۔

وہ بس سے اتر کر اس سڑک کی طرف چل دیا جہاں اس کی منزل تھی۔ سورج میں پیلاہٹ آگئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دن چھپنے والا تھا۔ اس نے تیز قدم اٹھانے

شروع کر دیے۔ مختلف باڑوں سے بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چڑیاں اپنے بسیروں کی طرف روانہ ہو رہی تھیں۔ پرے کے پرے اس کے سر پر سے ہو کر گزر رہے تھے۔ فضا میں عجیب قسم کی پراسراریت تھی۔ اس نے روٹیوں کے بنڈل کو چشم اشتیاق سے دیکھا اور تقریباً" بھاگنے کے انداز میں چلنے لگا۔ اس پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ نہ جانے یہ نورانی کھانا کھاتے ہی اس کی کیفیت کیا ہو؟ اس پراسرار کے نہ جانے کون کون سے دروازے کھل جائیں؟ ان خیالات کے آتے ہی اس کا بدن پسینے سے شرابور ہونے لگا۔

اس کے ناک نے گواہی دی کہ منزل قریب ہے۔ دور غلاظت کے ڈھیر پر ایک سیاہ ہیولا اسے نظر آنے لگا۔ جہانگیر تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"لے آیا زنانی کے ہاتھ کی روٹیاں!" فقیر نے اسے دیکھتے ہی اپنی پاٹ دار آواز میں اسے للکارا۔

"ہاں بابا جی' لے آیا۔"

"پھینک دے ادھر" اس نے کوڑے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی!" جہانگیر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"پھینک ادھر۔" فقیر نے حکم دیا۔

جہانگیر نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور روٹی کے بنڈل کو' کوڑے کی طرف اچھال دیا۔

"جا' مرد کے ہاتھ کی پکی ہوئی' دنیا کے بازار سے روٹی لے کر آ!"

"بابا جی' روٹی روٹی سب برابر۔"

"نادان' آدمی آدمی برابر ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟ جا پریشان مت کر' جو کہتا ہوں کر' نہیں تو رستہ لے' کل غروب آفتاب سے پہلے روٹی لے آ۔"

جہانگیر نے دن بھر سے کچھ نہیں کھایا تھا' ایک کھیل اڑ کر منہ تک نہیں پہنچی تھی۔ کھانوں کی خوشبو مستقل اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ عجیب بے بسی تھی

نوالہ توڑنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ بھی اسے معلوم تھا کہ "گل مراد ہے منزل پہ خار راہ میں ہے۔" اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نفس لوامہ کو قتل کر کے ہی نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے۔ گویا بڑی خوبصورتی سے یہ ننگ دھڑنگ' فقیر اس کی تربیت کر رہا تھا۔ اس نے شکر آمیز نظروں سے فقیر کو دیکھا اور خاموشی سے اٹھ گیا۔

فقیر کے بے ہنگم قہقہے بڑی دور تک اس کا تعاقب کرتے رہے۔ جہانگیر اندھیرے کے دامن کو مقراض رفتار سے تراشتا ہوا سڑک تک پہنچ گیا اور بس میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

"کس چکر میں پھر رہے ہو یار' کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" ارشد نے اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"اور یہ روٹیاں لے کر کہاں گئے تھے؟" ارشد نے پھر پوچھا۔

"ایک فقیر تھا' اسے دینی تھیں۔" جہانگیر نے کہا۔

"یار' یہ فقیر تمہیں ایک دن برباد کر دیں گے۔"

"تم کیا جانو بربادی کیا ہوتی ہے' آبادی کسے کہتے ہیں۔" جہانگیر نے مختصر سا جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"اچھا' اب کھانا تو کھالو یا فقیر کے ساتھ ہی کھاؤ گے۔" ارشد نے چیخ کر کہا۔

اتنا بے مزہ کھانا اس نے زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے ہر نوالہ پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق سے نیچے اتارا۔ جیسے تیسے اس نے پیٹ بھرا اور دوسرے دن کے انتظار میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی' لیٹتے ہی سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر ہوتے ہی وہ بازار نکل گیا لیکن عجیب بات ہوئی' اسے کوئی ہوٹل ہی نظر نہیں آیا۔ قدم قدم پر ہوٹل تھے۔ کئی اس کے دیکھے ہوئے تھے' اچھی طرح یاد تھے لیکن آج کوئی بند تھا' کسی میں نائی کی دکان کھل گئی تھی' کسی میں سبزی والا بیٹھ گیا تھا۔

تنگ آکر اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ "بھائی' یہاں کہیں ہوٹل ہے' روٹی چاہئے تھی۔"

"ہوٹل کے سامنے تو آپ کھڑے ہی ہیں۔" راہ گیر نے جواب دیا۔

"یہ' یہ تو نائی کی دکان ہے۔" اس نے دکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راہ گیر نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جب دو تین مرتبہ یہی ہوا تو وہ فکر مند ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ وہ اندھا بھی نہیں ہوا تھا' سب کچھ نظر آ رہا تھا' صرف اس ہوٹل کی حد تک اندھا ہو گیا تھا جہاں روٹی مل سکتی تھی۔ گویا روٹی اس کے مقدر میں نہیں۔ اب اس کی سمجھ میں فقیر کی یہ منطق آنے لگی تھی کہ روٹی بازار کی ہونی چاہئے۔ یہ اسی فقیر کی کوئی کرامت ہے کہ اسے ہوٹل نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اسے فقیر کی کنجوسی پر غصہ آنے لگا۔ تمام مال پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے' نہیں چاہتا کہ کسی اور کا بھی بھلا ہو جائے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ پھر دل ہی دل میں توبہ کی۔ وہ فقیر کی روحانی قوت کا قائل ہو چکا تھا۔ اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ فقیر اس کے دل کا حال جان کر خفا نہ ہو جائے۔

"اچھا بابا جی' آزمانا چاہتے ہو' آزما لو۔ میں ہار ماننے والا نہیں۔" اس نے اس طرح اپنے ارادے کا اظہار کیا جیسے وہ فقیر اس کے سامنے کھڑا ہو۔

وہ تھک ہار کر گھر واپس آ گیا۔ دوسرے دن پھر وہ ہوٹل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ حسب سابق پھر اسے مایوسی ہوئی۔ اس کی جیب میں بہت پیسے تھے لیکن وہ دو روٹیاں نہیں خرید سکتا تھا۔

اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن بے سود۔ آنسوؤں کے کنجی سے وہ کسی ہوٹل کا دروازہ نہ کھول سکا۔

صبح ہوتے ہی وہ گھر سے اس طرح نکل جاتا تھا جیسے نوکری کی تلاش میں جا رہا ہو اور شام ہوتے ہی اس طرح لوٹ آتا جیسے تھکا ہوا جواری۔

کسی چولھے کا دھواں اس کے کسی کام نہ آ سکا۔ شاید کسی کھیت میں وہ گندم پیدا نہیں ہوئی تھی جس سے اس کے مقدر کی روٹی بن سکتی۔

ذہنی پریشانی اور احساس محرومی نے اس کا سکون چھین لیا۔ اس کا شیو بڑھ گیا' کپڑے میلے ہونے شروع ہو گئے۔ وہ ہنسنا بھول گیا۔ وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ غفلت کے پردے اٹھ گئے۔ ایک روز اسے ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ وہ بہت دیر تک بے یقینی سے دیکھتا رہا اور بھاگتا ہوا ہوٹل کے اندر گھس گیا۔

"دو روٹیاں دینا۔" اس نے تقریباً" چیختے ہوئے کہا۔

روٹیاں لینے کے بعد اس نے ہوٹل والے کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔

"اے بھائی' کون سے زمانے کا نوٹ ہے یہ۔" ہوٹل والے نے نوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

کون سے زمانے کا کیا مطلب! ٹھیک تو ہے۔" اس نے اپنے دیے ہوئے نوٹ کو دوبارہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے؟ پتا نہیں کون سے ملک کا ہے۔"

"اچھا دوسرا لے لو۔" اس نے دوسرا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں بے وقوف بنانے پر تلے ہو۔ ادھر لاؤ روٹی۔" ہوٹل والے نے روٹی چھین لی۔

شور سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اس کے نوٹ کا جائزہ لیا گیا اور ہر شخص نے یہی مشورہ دیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے ورنہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

جہانگیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا یہ سب لوگ پاگل ہیں مگر جب ہر ہوٹل پر یہی کہانی دہرائی گئی تو اسے اپنی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا لیکن جب انہی پیسوں سے اس نے سگریٹ خریدے تو دکاندار نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اسے فقیر پر غصہ آ گیا۔ وہ یا تو مجھے پاگل کر دینا چاہتا ہے یا تماشا بنا دینا چاہتا ہے لیکن میں اسے یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا' میں اسے یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ اسے میری مراد پوری کرنی پڑے گی۔ پوری کرنی پڑے گی اسے میری مراد۔ وہ سڑک پر کھڑا ہو کر زور زور سے چلانے لگا۔

"بے چارہ پاگل ہے۔" کئی طرف سے آوازیں آئیں۔ اس نے ان آوازوں کو غور سے سنا اور نواحی بستی کی جانب جانے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔

مین سڑک پر اترنے کے بعد اس نے پوری قوت کے ساتھ اس سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا جو فقیر کے ٹھکانے کی طرف جاتی تھی۔ جوتے اس کی تیز رفتاری میں حائل ہو رہے تھے۔ اس نے جوتے اتار کر ایک طرف اچھال دیے اور پھر بھاگنا شروع

کر دیا۔

اسے کوئی بھی اس حالت میں دوڑتے ہوئے دیکھتا تو پاگل ہی سمجھتا۔ میلی قمیص جس کے اوپر کے دو بٹن نہ جانے کیسے ٹوٹ چکے تھے، پاؤں میں جوتا نہیں، شیو بڑھا ہوا، بے ترتیب بال، ہونٹ خشک، چہرے پر ہوائیاں اور پاگل کیسے ہوتے ہیں!

وہ فقیر تک پہنچا تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

فقیر نے اسے دیکھتے ہی قہقہہ بلند کیا۔ اس کے قہقہے میں بلا کا طنز چھپا ہوا تھا۔ جہانگیر کو ایسا لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اسے اور غصہ آ گیا۔

"کنجوس بڈھے، تو مجھے کب تلک آزماتا رہے گا۔ ذرا سی دولت کیا مل گئی ہے، ترسا رہا ہے مجھے۔"

"بس یہی وفاداری ہے۔ تھک گئے۔ چلانے لگے۔"

"میں مذاق بن کر رہ گیا ہوں۔ ڈال دو میری جھولی میں جو کچھ ڈالنا ہے ورنہ لے لو میری جان۔" اس نے گریبان چاک کر لیا۔ رہے سہے بٹن بھی ٹوٹ گئے۔

فقیر نہایت اطمینان سے اس کی تقریر سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"صبر کر صبر! غفلت کے پردے ہٹ گئے ہیں۔ کھوٹے سکوں کو کھرا کر لے۔ پھر رضا بھی خرید لے گا، رغبت بھی خرید لے گا۔" فقیر نے نہایت اطمینان سے کہا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

جہانگیر نے شعر پڑھا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔

"دل کا خون ہو جانے دے۔ غصے کے سومنات کو توڑ دے۔ جلد بازی سے توبہ کر۔ جسے خریدنے جا رہا ہے وہ بہت دیر آشنا ہے۔ انتظار کی آگ میں جلتا رہ۔ وقت کا انتظار کر۔"

جہانگیر کو یہ سب نصیحتیں ڈھکوسلا معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ اسے تو بس ایک ہی دھن تھی کہ اس کا پیرومرشد اسے کسی جہان نادیدہ کی سیر کرا دے۔ اسے شک تھا کہ فقیر اسے پروانہ سفر

دینا نہیں چاہتا۔ اس نے پھر ضد کی۔

"بس پیرو مرشد' اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اس آزمائش سے مجھے آزاد کر دے۔"

"تو اسی راستے پر جا رہا ہے جس کا مجھے اندیشہ تھا۔"

"میرے بھی کچھ اندیشے ہیں' تم بھی اسی راستے پر جا رہے ہو۔"

"جا روٹی لے آ۔ پھر جو تیرا مقدر۔"

جہانگیر اشارہ سمجھ چکا تھا۔ مقدر والی بات تو اس نے سنی بھی نہیں' بس روٹی کے لئے ایک مرتبہ پھر دوڑ پڑا۔

اسے بس میں بیٹھنے کا خیال بھی نہیں رہا۔ وہ بے تحاشا شہر کی طرف دوڑے جا رہا تھا۔ تھک جاتا' دم لینے کو رک جاتا پھر دوڑنے لگتا۔

وہ شہر تک پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا اور کھڑے کھڑے کئی گلاس پانی پیٹ میں اتار لیا۔ پانی پی کر وہ مڑا ہی تھا کہ کسی نے ایک روٹی پر ذرا سا سالن رکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ "یہ لو بابا' کھالو۔"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ بہت بھوکا ہے۔ اس نے چند لقموں میں روٹی ختم کر لی۔

"اور کھاؤ گے؟" اس شخص نے پوچھا۔

جہانگیر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ایک روٹی اور اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے وہ روٹی بھی کھالی اور ہوٹل سے نکل آیا۔

روٹی کھانے کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ بہت تھک گیا ہے لیکن وہ سوئے گا کہاں۔ یہ یاد نہیں آ رہا تھا' شاید اس کا ذہن اس سے پہلے سو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر سڑک پر کھڑا رہا پھر فٹ پاتھ پر ڈھیر ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی وہ اس ہوٹل کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے یہاں سے کیا خریدنا ہے مگر کچھ یاد ہی نہیں آتا تھا۔

ہوٹل والے نے اسے چپ چاپ کھڑا دیکھ کر ایک گلاس میں چائے لا کر دے دی۔ اس نے چائے پی اور وہاں سے چل دیا۔

نہ جانے کتنے دن' کتنی راتیں گزر گئیں۔ اب اس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ بڑھا ہوا شیو گھنی داڑھی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ کون ہے' یہاں کیوں گھوم رہا ہے' اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کا دوست ارشد اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہو گا۔

پھر اچانک ایک دن اس کی یادداشت بحال ہو گئی۔ ارے بہت دیر ہو گئی' میں تو روٹی لینے آیا تھا۔

"دو روٹی دینا۔" اس نے ہوٹل والے سے کہا۔

روٹیاں لینے کے بعد اس نے پانچ کا نوٹ ہوٹل والے کو دیا۔

"نہیں بابا جی' ہم فقیروں سے پیسے نہیں لیتے۔"

"میں فقیر نہیں ہوں۔"

اس نے اتنی زور سے کہا کہ ہوٹل والا ڈر گیا اور جلدی سے روٹی کے پیسے کاٹ کر باقی پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"آہا' آہا۔ میرے نوٹ کھرے ہو گئے' میرے نوٹ کھرے ہو گئے۔" وہ خوشی سے چلاتا ہوا ہوٹل سے باہر بھاگ گیا۔

نواحی بستی کی طرف جانے والی بس سے اتر کر وہ اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ اپنی منزل کے قریب پہنچ کر اس کے قدم جیسے پتھر کے ہو گئے۔ فضا میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ فقیر زمین پر لیٹا ہوا تھا۔

"بابا دیکھو' میں روٹیاں لے آیا۔ میرے سکے کھرے ہو گئے۔" اس نے فقیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ فقیر کو مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کی تمام محنت اکارت چلی گئی۔

"دھوکے باز فقیر۔ اتنی دور چلا گیا کہ میں تجھے پکڑ بھی نہ سکوں۔" اس نے فقیر کی لاش کے قریب سے اٹھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"جہانگیر، مجھے دفن نہیں کرو گے۔"

جہانگیر نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا۔ قریب کوئی بھی نہیں تھا پھر یہ آواز کیسی۔ اس نے اس آواز کو غیبی اشارہ سمجھا اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ قریب ہی اسے ایک گڑھا دکھائی دیا جیسے کسی نے قبر کا انتظام پہلے ہی کر دیا ہو۔

اس نے لاش کو سامنے رکھ کر نماز جنازہ پڑھی، لاش کو قبر میں رکھا اور مٹی ڈال دی۔

"بابا، تم تو چلے گئے، اب یہ روٹی مجھے کون کھلائے گا؟" اس نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا۔

"اب بھی تجھے روٹی کی فکر ہے۔ تیری آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ گئے، تیرے کھوٹے سکے کھرے ہو گئے، تیری یادداشت لوٹ آئی۔ یہی تو وہ روشنی ہے جس کی تلاش تیری روح کو تھی۔ اسی کا نام تو روحانی قوت ہے۔ یہی تو نفس مطمئنہ ہے۔ یہی تو وہ طاقت ہے کہ جسے مل جائے پھر وہ کسی سہارے کا محتاج نہیں رہتا۔ ماحول کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ذرا اس غلاظت کے ڈھیر کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھ۔"

جہانگیر نے سراسیمہ ہو کر غلاظت کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے سر سے پاؤں تک گلاب کے پھولوں میں چھپ گیا ہے۔ بھوک پیاس سب رخصت ہو گئی۔ اسے نفس مطمئنہ حاصل ہو گیا۔

وہ اطمینان سے اس ڈھیر پر بیٹھ گیا اور کسی عاشق صادق کا انتظار کرنے لگا جو آئے اور اس نعمت عظمٰی سے اپنا حصہ طلب کر سکے۔

صحرا کا سناٹا ایک مرتبہ پھر اس آواز سے گونجنے لگا "لے کھالے، لے چاٹ لے۔"



فتح مند

گاؤں بھر میں دلاور حسین ہی وہ مرد تھا جو زمیندار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا۔ وہ نہ اس کی دولت سے مرعوب تھا نہ اس کے لٹھ برداروں سے خائف جبکہ کیا بوڑھے' کیا جوان' سب خارش زدہ کتوں کی طرح زمیندار کی حویلی کے سامنے دم ہلاتے اور جھڑکیاں کھاتے تھے۔ ان کی عورتیں اپنے مردوں کی غیرت طاق پر رکھ کر' حویلی کا دیا جلانے جاتی تھیں۔ کوئی کپڑے دھونے پر مقرر تھی' کسی کے حصے میں اپلے تھاپنے کا کام تھا' کوئی زمیندار کی چاروں بیویوں کی زیب و آرائش کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ خود دلاور کی ماں بکریوں کا دودھ دوہنے کے لئے صبح سویرے حویلی کی دہلیز پار کیا کرتی تھی اور خوش تھی کہ زمیندار نے رحم کھا کر اس کی ڈیوٹی ایسے آسان کام پر لگائی ہے' واپسی میں ایک گلاس دودھ الگ ملتا تھا۔ صرف دلاور کی بہن گلابو ایسی تھی جس نے اپنی جوانی کو آئینے میں دیکھنے کے بعد حویلی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

زمیندار' گلابو کی ماں سے دبے لفظوں میں کئی مرتبہ گلابو کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ گلابو کی ماں ہر مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کے تقاضوں کو شکست دے چکی تھی لیکن اب وہ ڈر گئی تھی اس کی بوڑھی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں جو ہونے والا تھا اسے معلوم تھا کہ یہ تقاضا کسی دن بھی زبردستی میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زمیندار اسے توہین سمجھتا ہے کہ کوئی عورت رانی بن کر گھر بیٹھی رہے اور اس کے حضور سجدہ ریز نہ ہو وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اپنی توہین کا بدلہ کس طرح لیتا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ دلاور کو سمجھایا بھی مگر دلاور کے پاس تو جیسے دل تھا' دماغ تھا ہی نہیں اس نے ایک ہی جواب رٹ لیا تھا۔

"میں اور میری جوان بہن اس کی غلامی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ تیری بات اور ہے میں تجھے نہیں روکوں گا' تو ماں ہے میری بھی زمیندار کی بھی۔"

دیوار سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل! بوڑھی ماں نے اب اس سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ صبر کر لیا تھا مگر آنے والے طوفان کی تباہی سے خوفزدہ تھی آج تک اس گاؤں میں دلاور کے علاوہ کسی کی ہمت نے ایسے پاؤں نہیں پھیلائے تھے۔ یہ جسارت کیا گل کھلائے گی۔ بوڑھی ہڈیاں اسی فکر میں گھل رہی تھیں۔ اندیشوں کے دریا میں بھنور پڑنے کا وقت آخر آہی گیا۔

آج جب وہ حویلی جانے کے لئے گھر سے نکلی تو اس کے دل کے دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی جیسے کچھ ہونے والا ہے' جیسے کچھ ہونے والا وقت آ گیا ہے۔ اس نے دل کے دروازے کو اور زور سے بند کر لیا۔ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی وہ حویلی کی جانب بڑھنے لگی۔

"گلابو کی ماں' تجھے مالک نے یاد کیا ہے" حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے اطلاع مل گئی۔

"ٹھہر جا میں کام تو نمٹا لوں" اطلاع دینے والے سے اس نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے مالک کی بات سن لے اس کا یہی حکم ہے" نوکر نے زور دے کر کہا۔

اندیشوں کا چور دل کی دیوار پھاند کر باہر آ گیا آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

"چل' پھر پہلے مالک ہی کی خدمت کروں' گلابو کی ماں نے گہری سانس لی اور اس مخصوص کمرے کی طرف چل دی جہاں اس وقت زمیندار ہو سکتا تھا۔

بڑے سے کمرے میں دور تک قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر چاروں طرف اس حویلی کے مرحوم مالکوں کی تصویریں اپنے کئے کا پھل دیکھنے کے لئے موجود تھیں۔ ایک طرف مردہ شیر کا کھلا ہوا منہ ایک بڑے سے پتھر کے اسٹول پر رکھا ہوا تھا۔ دوسری جانب ایک بڑا تخت بچھا ہوا تھا' تخت پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ تخت پر زمیندار گاؤ تکیئے کا سہارا لئے ہوئے نیم دراز تھا۔ اس کے دو کارندے اس کی ٹکی مالش میں مصروف تھے۔

گلابوں کی ماں نے گاؤں کے دستور کے مطابق جوتیاں دروازے ہی میں اتار دیں۔ دروازے میں کھڑے کھڑے دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔

آؤ ! گلابو کی ماں' اندر آ جاؤ" اجازت مل چکی تھی اس نے آنکھیں کھول دیں' ہاتھ جوڑے جوڑے کمرے کے طول کو عبور کیا' زمیندار کے پیروں کو ہاتھ لگائے اور ایک طرف کھڑے ہو کر حکم کا انتظار کرنے لگی۔

"میں نے پہلے بھی کئی دفعہ پوچھا' اب پھر پوچھتا ہوں .... تیری بیٹی میری خدمت کے لئے تیرے ساتھ کیوں نہیں آتی' کیا اعتراض ہے اسے؟"

"اعتراض تو کچھ نہیں سرکار۔ بس وہ جوان ہو گئی ہے نا اس لئے" اس نے جان بوجھ کر دلاور کا ذکر نہیں کیا۔

"تو کیا انوکھی جوان ہوئی ہے وہ۔ اس گاؤں میں اور لڑکیاں بھی تو جوان ہوئیں۔ سب کی جوانی یہیں گزری ہے۔ صاف صاف بتا بات کیا ہے؟

"کچھ نہیں مالک بس یہی بات ہے"

"تو ملا دیں اس کی جوانی مٹی میں' پھر تو آئے گی"

"نہیں مالک یہ غضب نہ کرنا' میں اس کے بدلے کا کام بھی کر دیا کروں گی' آپ کو تو کام سے غرض ہے نا" بڑھیا ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں بڑھیا ! مجھے کام سے نہیں اپنی رعایا کی وفاداری سے غرض ہے۔ تیرے گھر سے مجھے نمک حرامی کی بو آتی ہے۔ سنا ہے تیرا جنا ہوا حرامی کا پلا دلاور اسے نہیں آنے دیتا" زمیندار نے طنز کی چھری بڑھیا کے پیٹ میں اتارتے ہوئے کہا۔

"مالک وہ مورکھ نادان ہے' ابھی بچہ ہی تو ہے' میں اسے سمجھا لوں گی۔ آپ تو ہمارے ان داتا ہیں آپ مجھے ایک موقع اور دیں' میں سمجھا لوں گی اسے۔ آ جائے گی گلابو' وہ تو داسی ہے آپ کی۔"

"ٹھیک ہے' کل اگر گلابو نہ آئی تو پرسوں اپنے بیٹے کو یہاں بھیج دینا۔ میں اب تک تیری وجہ سے اسے چھوڑتا رہا ہوں لیکن اب نہیں۔ میں خود اس کی مزاج پرسی کروں گا' مگر یاد رہے گلابو یا دلاور کل یا پرسوں' سمجھی؟"

"سمجھ گئی سرکار' سب کچھ سمجھ گئی" گلابو کی ماں نے اس کے قدم چھوئے اور اس کی طرف پیٹھ کئے بغیر الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی۔

"اس نے جیسے تیسے کام نمٹایا اور گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کا بدن کمزور پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے دلاور کو پیدا کیا تھا آگ لگے تیری جوانی کو۔ ارے تو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا" پرکھوں کی روایت ہی کو توڑ دیا۔ نہ خود زمیندار کی خدمت کرے گا' نہ بہن کو بھیجے گا' بڑا آیا سورما کہیں کا۔ اب دے جواب زمیندار کو' اب کر ان داتا سے بحث۔ ارے وہ کیوں بحث کرنے لگا۔ بچہ ہے ضد میں آگیا ہے' ذرا کہوں گی تو مان جائے گا آخر کس کا بیٹا ہے اس باپ کا بیٹا جس نے زمیندار کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دی تھی۔ مان جائے گا' مان جائے گا بس میرے کہنے کی دیر ہے" اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی وہ گھر تک پہنچ گئی۔

"یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دلاور اسے گھر پر ہی مل گیا ورنہ وہ گھر میں ٹکتا ہی کہاں تھا۔ اس کے پیروں میں تو جیسے پہیے لگے ہوئے تھے۔ جانے کہاں کہاں مارا پھرتا تھا۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم یا لڑنے مرنے پر آمادہ۔ ایک آزاد روح تھی جو مزید آزادی ڈھونڈتی پھرتی تھی۔

"اچھا ہوا تو گھر پر ہی مل گیا۔ آج آخری دفعہ بات ہو ہی جائے" اس کی ماں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر ہے ماں' بات کیا ہے"

"جا' اب زمیندار سے بات کر' بلایا ہے تجھے"۔

"میں کیوں جاؤں' نوکر ہوں اس کا؟"

"تو پھر گلابو میرے ساتھ جائے گی کل زمیندار جی کے حویلی پر۔"

"لیکن کیوں؟"

"مالک کا یہی حکم ہے' تو یا گلابو۔"

"اچھی زبردستی ہے' نہ میں جاؤں گا نہ گلابو"

"نہیں بیٹا ضد نہ کر' وہ بڑا ظالم ہے' تجھ سے کوئی زبردستی نہ کرے"۔

"کس کی ماں نے اتنا دودھ پلایا ہے جو مجھ سے زبردستی کرے گا۔ یاد رہے' ایک مرتبہ اور اس کے پالے ہوئے کتے مجھے بلانے آئے تھے۔ لاٹھیاں لے کر آئے تھے' خالی ہاتھ واپس گئے تھے۔ میرے بازوؤں کی مچھلیوں میں طاقت ہے۔ بھینسے کی گردن پکڑ سکتا ہوں تو قدم جم جاتے ہیں اس کے۔ تو فکر نہ کر' کچھ نہیں ہوگا۔"

"میرے لال میری بات مان لے' ایک دفعہ تو چلا جا حویلی۔"

"نہیں ماں' اپنے باپ کے قاتل کی دہلیز میں کیسے پار کروں گا' تو مجھے مجبور مت کر۔"

"ٹھیک ہے تو کل گلابو میرے ساتھ جائے گی۔ دیکھتی ہوں تو کیسے مجھے روکتا ہے" ماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ماں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔ دلاور تذبذب میں پڑ گیا "ٹھیک ہے ماں' کل کیا میں آج ہی جاؤں گا' آر یا پار۔"

اس نے چارپائی پر پڑا ہوا تعویذ گلے میں ڈالا۔ اس تعویذ کے بغیر وہ گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ اس کا عقیدہ تھا' جب تک یہ تعویذ اس کے گلے میں ہے' اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ بڑا سالٹھ ہاتھ میں لیا' ~~کھوکھے~~ فلکی پیروں میں ڈالے' گلابو پر ایک نظر ڈالی اور دروازے کی طرف چل دیا۔

"دیکھ پتر' تسلی سے بات کرنا' زیادہ گرمی کھانے کی ضرورت نہیں" ماں نے مامتا بھری نصیحت کی۔

دلاور نے ماں کی نصیحت کو سنا اور گھر سے نکل گیا۔

"حویلی پر پہنچ کر اس نے اپنی لاٹھی کو زور سے زمین پر مارا "زمیندار سے کہنا دلاور حسین آیا ہے" اس نے ایک نوکر سے کہا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے زمیندار تمہارے باپ کا نوکر ہے" نوکر نے کہا۔

"ابے میرا باپ ایسا گھٹیا نوکر نہیں رکھتا تھا۔ اس نے بلایا ہے تو ہم آئے ہیں' بول دے جاکر"

نوکر سہم کر اندر کی طرف دوڑ گیا۔ حویلی کے نوکروں میں کھلبلی مچ گئی "دلاور حسین اور حویلی پر! شاید کس بل نکل گئے بھیا کے۔

چلا تھا ہمارے مالک سے ٹکر لینے" ایک خوشامدی نے آوازہ کسا۔

"جاؤ بلا رہے ہیں' اور وہاں ذرا ادب سے جانا" نوکر نے واپس آ کر کہا۔

"ابے میرے ساتھ چل' مجھے کیا پتا وہ کتا کدھر لیٹا ہوا ہے' میں اس حویلی میں کبھی آیا ہوں؟

دلاور حسین اس نوکر کے ساتھ اس کمرے تک پہنچ گیا۔

"جوتیاں یہیں اتار دو" نوکر نے مشورہ دیا۔

"اب تو بھاگتا ہے یہاں سے یا ...." دلاور نے لاٹھی اٹھائی۔

ملازم بیچارہ رفوچکر ہو گیا۔

دلاور جوتیوں سمیت کمرے میں داخل ہو گیا۔ نہ اس نے تصویروں کی طرف منہ کر کے ہاتھ جوڑے' نہ زمیندار کے قدم چھوئے' بول زمیندار کیا بات ہے؟"

"بات تو ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے مگر کیا تمہاری ماں نے یہاں داخل ہونے کے آداب نہیں سکھائے؟ کیا تم اس گاؤں میں نہیں رہتے؟ کیا تم ہماری رعایا نہیں ہو؟"

"بس بس زمیندار تو نے تو سوالوں کی ریل گاڑی چھوڑ دی' میں ٹھہرا جاہل' اجڈ' گنوار' ایک ایک کر کے جواب دینے دے۔ میری ماں نے بہت کوشش کی مگر غلامی کے طور طریقے مجھے یاد نہیں ہوتے' گاؤں میں رہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ میرے پرکھوں کا گاؤں ہے۔ وہی رہی رعایا والی بات تو جتنی رعایا تجھے مل گئی ہے یہی بہت ہے' دلاور حسین تیرا زرخرید نہیں۔"

"دیکھو دلاور حسین' ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ مگر بہادری اور بدتمیزی میں بہت فرق ہے۔ تم بہادر ہو مگر بدتمیزی بھی ہو"

"پھر مجھے بدتمیز کو یہاں بلایا کیوں ہے؟"

"ہم تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں"۔

"کیوں مذاق کرتے ہو زمیندار۔ امیر' غریب کی کیا دوستی' دشمنی ختم ہو جائے یہی بہت ہے"

"اس کی تو ایک ہی شرط ہے۔ وہ دلاور کی بہن ہے' وہ یہاں نہیں آئے گی۔"

"سوچ لو دلاور حسین' اگر وہ یہاں نہیں آئے تو کہیں بھی نہیں جا سکے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے۔ تمہیں اس کی شادی بھی تو کرنی ہوگی۔"

"وہ تو ہے مگر........................."

"اس گاؤں میں ہماری مرضی کے بغیر کیا کوئی ڈولی اٹھ سکتی ہے؟" .... زمیندار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ ڈولی میری مرضی سے اٹھے گی۔"

"مگر ڈولی اٹھنے سے پہلے ہی کوئی ڈاکا پڑ گیا' کوئی اغوا کی واردات ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اس پر بھی سوچ لیا ہے؟"

"بس زمیندار آگے ایک لفظ منہ سے نکالنا۔

"نہیں نکالتے۔ اب تم دفع ہو جاؤ یہاں سے" زمیندار زور سے دہاڑا' اور ہاں' ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں صرف اپنی رعایا کی بات سنتا ہوں۔ تمہاری مدد کرنا میری ذمے داری نہ ہوگی۔

"دلاور حسین جو اب تک بڑی پامردی سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا' سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گیا۔ وہ جان چکا تھا' زمیندار کا مطلب کیا ہے مگر اس نے اپنی کمزوری کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ اسی شان سے واپس ہوا جس غرور کے ساتھ حویلی میں داخل ہوا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اسے زندہ دیکھ کر ماں اور گلابو دونوں اس سے لپٹ گئیں "کیا کہا زمیندار جی نے؟" ماں سے پہلے گلابو بول پڑی۔"

"کہنا کیا تھا' مان گیا۔ کہنے لگا دلاور حسین نہ تم آؤ گے بیگار کے لئے اور نہ تمہاری بہن' بس ماں کو بھیج دیا کرنا' وہ بھی اس لئے کہ ان کے آنے سے میرے گھر میں رحمت کے فرشتے آتے ہیں" دلاور حسین نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"سچ دلاور' یہ کہا؟" گلابو نے بے یقینی سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا' تو دلاور کی بہن ہے' کوئی مذاق تھوڑی ہے۔"

"زمیندار جی تیرے باپ کے احسانوں کو بھولے تھوڑی ہوں گے' اسی لئے تو وہ

اتنے مہربان ہیں۔ اچھا تو بیٹھ میں تیرے لئے روٹی لاتی ہوں' بہت تھک گیا ہوں میرا پتر" ماں نے کہا

"نہیں ماں' ابھی مجھے بھوک نہیں' تھوڑی دیر میں کھا لوں گا۔"

"جیسی تیری مرضی" ماں مطمئن ہو گئی۔

دلاور حسین بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتا تھا جس کے لئے اسے موقع کی تلاش تھی یا پھر کچھ کہنے کے لئے ہمت جمع کر رہا تھا۔ ماں اس کی اس کیفیت سے بے خبر دھان پھٹکنے بیٹھ گئی۔ آنگن میں چھاج کی لے عجب سماں پیدا کر رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹے خاموش تھے۔ گلابو بھی اندر والی کوٹھری میں کسی کام میں لگ گئی تھی۔

"ماں" دلاور حسین نے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس کی۔

"کیا ہے" ماں نے چھاج کے سروں کو روک دیا۔ دلاور کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر چھاج پھٹکنا شروع کر دیا۔

"ماں' میں یہ کہہ رہا تھا' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ دن کے لئے ہم چاچا کے گاؤں میں جا کر رہ لیں؟ یا ایسا کریں یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ کیا رکھا ہے یہاں' تھوڑی سی زمین ہے اسے میں بیچ دوں گا" دلاور نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات مکمل کی۔

ماں نے اس کی بات اتنی خاموشی سے سنی جیسے کوئی اپنی موت کی خبر سنتا ہے "سچ بتا زمیندار نے تجھ سے کیا کہا ہے؟"

"کچھ نہیں ماں' جو کہا تھا میں نے تجھے بتا دیا"

"پھر یہ گاؤں چھوڑنے کی بات تو نے کیوں کی۔ کیوں کی ایسی گری ہوئی بات؟"

"ماں کیا خبر زمیندار کب بدل جائے۔ اس کی نیت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگی۔

"مگر دلاور یہاں تیرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔ میں یہ جنت چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اس بڑھاپے میں مجھ سے یہ نہیں ہو گا سمجھا' ہاں۔"

"تو پھر ماں ہم ایسا کریں کہ اپنی گلابو کے ہاتھ جلدی سے جلدی پیلے کر دیں۔ پھر میں اس زمیندار کے بچے کو دیکھ لوں گا"۔

"ہاں' میں تو خود تجھ سے یہ بات کرنے والی تھی مگر تو گھر میں نکلتا ہی کہاں ہے
آج تو ذرا جم کر بیٹھا ہے۔ تیرے چاچا کے گاؤں میں جو قمردین ہے' تیرا چاچا اس
رشتہ لایا تھا۔ لڑکے کی عمر زیادہ ہے اس لئے میرا دل ٹھک نہیں رہا تھا مگر اب تو کہہ
ہے تو میں ہاں کہوں گی ویسے ابھی میں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا ہے۔"

"بس ماں تو بات پکی کر لے"

"مگر کچھ گہنا پاتا بھی جوڑ کر رکھا ہے بہنا کے لئے یا بس یونہی"

"تو اس کی فکر مت کر' اللہ بڑا بادشاہ ہے"

"ٹھیک ہے تو پھر کل ہی تو چاچا کو بلا کر لے آ میں بات آگے بڑھاتی ہوں"

"اچھا ماں میں چلا" دلاور نے کہا اور باہر نکل گیا۔ ماں پھر دھان پھٹکنے میں
مصروف ہو گئی۔



گرمیوں کے دن تھے۔ گلابو اور ماں آنگن میں پڑی کھری چارپائیوں پر لیٹی
ہوئی تھیں۔ کوٹھے کی کچی چھت پر دلاور سو رہا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ رات
نہ جانے کس وقت دروازے پر کسی نے دلاور کو آواز دی۔ پہلے گلابو کی آنکھ کھلی' اس
نے ماں کو جگایا۔

"ماں' دیکھ کوئی دروازے پر ہے"

"کون ہو سکتا ہے ری اس وقت" ماں نے اٹھتے ہوئے کہا کسی نے پھر پکارا۔ ماں
نے لالٹین کی بتی کو اوپر کیا اور دروازے تک گئی "کون ہے بھائی؟"

"دلاور کو باہر بھیجو"

"اس کو جگانا میرے بس کی بات نہیں' نہ جانے کب آیا تھا کوٹھے پر بے خبر سو
رہا ہے۔ تم صبح آ جانا" اس نے دروازے کی کنڈی کھولتے ہوئے کہا۔

"تو ہٹ ہم خود ہی جگا لیتے ہیں" دو پولیس والوں نے بڑھیا کو دھکا دیا اور اندر
گھس آئے۔"

"کیا کیا میرے دلاور نے" بڑھیا پولیس کو دیکھ کر سہم گئی۔ "چوری کی ہے جانور چرائے ہیں زمیندار صاحب کے"

"میرا بیٹا چور نہیں ہے"

"تو زمیندار صاحب جھوٹ بولتے ہیں کیا؟"

"ہاں، جھوٹ بولتے ہیں" بڑھیا نے آج پہلی مرتبہ زمیندار کو ایسے لفظوں میں یاد کیا تھا۔

"کدھر ہے وہ" پولیس والے نے کہا اور ایک طرف سیڑھی لگی ہوئی دیکھ کر، سیڑھی پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ دلاور کے ساتھ نیچے اترا۔

"حوالدار صاحب، میری یہ چوڑی چھاتی اس لئے نہیں ہے کہ میں اس پر چوری کا بوجھ اٹھاتا پھروں" دلاور نے سیڑھی سے اترتے ہوئے کہا۔

"یہی بات تم سے پہلے تمہاری ماں ہمیں بتا چکی ہے لیکن زمیندار صاحب نے رپورٹ درج کرائی ہے، کاروائی کرنا ہمارا فرض ہے۔ تم تھانے چلو ہم تفتیش کریں گے، بات غلط ہوئی تو بے شک ہم تمہیں چھوڑ دیں گے"

"ماں، تو آرام سے سو، گلابو کا خیال رکھنا۔ جب میں نے چوری کی ہی نہیں تو میں کیسے پھنس سکتا ہوں۔"

دونوں ماں بیٹیاں سسکیاں بھرنے لگیں دلاور پولیس والوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ گاؤں میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو گیا۔ گلابو کی سسکیاں جھینگروں کی آواز میں دب گئیں اب سمجھنے کے لئے کیا رہ گیا تھا گلابو کی ماں جانتی تھی کہ زمیندار نے اپنی ضد پوری کرنے کے لئے اس کے بیٹے کو پھنسوایا ہے وہ ایسے بہت سے کھیل حویلی میں رہ کر دیکھ چکی تھی۔ اب اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔

صبح ہوتے ہی وہ حویلی پہنچ گئی۔ کام کرنے کے ارادے سے نہیں، بات کرنے کے ارادے سے۔ آج اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ آج وہ رعایا نہیں تھی، دلاور اور گلابو کی ماں تھی۔ زمیندار نے آج ایک ماں سے اس کا بیٹا چھین لیا تھا۔

"زمیندار سو رہا ہے کہ اٹھ گیا؟" اس نے زمیندار کے ایک خاص نوکر سے پوچھا۔

"اٹھ گئے ہیں مالک مگر تو ان سے نہیں مل سکتی"

"مالک کا حکم ہے"

"میں نہیں جانتی اس حکم کو۔ میرا بیٹا مجھے چاہئے ہے۔ میں انصاف مانگنے آئی ہوں" وہ زمیندار کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ نوکروں نے اسے پکڑ لیا مگر آج تو وہ چڑھی ہوئی ندی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اس نے چیخ چیخ کر پوری حویلی سر پر اٹھا لیا۔ اتنا شور مچایا کہ زمیندار خود باہر نکل آیا۔ زمیندار کو دیکھتے ہی بڑھیا کا ازلی خوف اس کے دل میں پھر بیدار ہو گیا۔ یا تو ایسا شور مچا رہی تھی یا ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی

"سرکار، یہ مجھے آپ سے ملنے نہیں دے رہے تھے"

"کیوں بھائی کیوں ملنے نہیں دے رہے تھے۔ بولو گلابو کی ماں، کیا بات ہے"

"سرکار میرے بیٹے کو بچالو"

مگر اس نے چوری کی"

"نہیں مالک میرا بیٹا چور نہیں ہے"

"میرے آدمیوں نے خود اسے دیکھا ہے، کم بخت میری دو بھینسیں چرا کر بھاگ گیا۔ جی دار تو تم جانتی ہو وہ کیسا ہے۔ میرے کسی ملازم کے بھی وہ قابو میں نہیں آیا اور اب تو معاملہ پولیس تک پہنچ چکا ہے۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا"

"سرکار آپ تو ان داتا ہیں"

"میرے کان مت کھاؤ، چلی جاؤ یہاں سے"

"ماں کی بد دعا سے بچو مالک، یہ حویلی جس پر تم اتراتے ہو راکھ میں بدل جائے گی"

"بس آگے کچھ کہا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ پھینک دو اسے حویلی سے باہر اٹھا کر"

"بڑھیا چیختی رہ گئی اور نوکروں نے اسے باہر نکال دیا۔ بڑھیا بہت دیر تک حویلی کی طرف دیکھتی رہی اور پھر گھر کی طرف چل دی۔ گاؤں میں اتنے لوگ تھے، کسی نے زمیندار کے ڈر سے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تجھ پر کیا بیتی۔ وہ بھی اپنا دکھڑا کس سے روتی، کہاں جاتی۔

گھر پہنچ کر ماں بیٹیاں نہ جانے کب تک اپنی قسمت کی سیاہی کو آنسوؤں کے پانی سے دھونے کی کوشش کرتی رہیں مگر آنسوؤں سے پہلے کبھی معجزے ظہور میں آئے ہیں جو اب آتے۔ آنسوؤں کا خزانہ خالی ہو گیا تو گلابو نے مشورہ دیا "ماں' تو داروغہ صاحب کے پاس جا' شاید انہیں رحم آ جائے"

میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔ دلاور کو اس کے کئے کی سزا ملنی چاہئے اس نے کیوں زمیندار سے ٹکرلی۔ ارے دیوار سے سر ٹکراؤ گے تو اپنا ہی سر لہولہان کرو گے۔ میں کہتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ مانی۔ اب بھگتے سزا' گلابوں کی ماں پھر رونے لگی جیسے یہ سب کچھ کہنے کے لئے اس نے آنسوؤں کے سیلاب کو کچھ دیر کے لئے روک لیا تھا۔ گاؤں کی کچھ عورتیں بھی ہمت کر کے اس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس کے آنگن میں آ گئیں اور دبے لفظوں میں زمیندار کی برائیاں کرنے لگیں مگر مردوں میں سے کسی کی بھی اتنی جرات نہیں ہوئی کہ وہ آ کر پھٹکتا گلابو کی ماں نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد آج دوسری مرتبہ یہ جملہ دہرایا' "اس گاؤں میں مرد نہیں رہتے' زمیندار کے غلام رہتے ہیں" گاؤں میں کیسا تھانہ' کیسی عدالت' کہاں کا انصاف' پولیس بھی زمیندار عدالت بھی زمیندار دلاور حسین سے نہ پوچھ گچھ ہوئی نہ تفتیش۔ پوچھ گچھ ہوتی بھی کیا پولیس کو بھی پتا تھا کہ یہ سب کچھ دلاور حسین کو سبق سکھانے کے لئے کیا گیا ہے۔ وہ چیختا چلاتا رہا' اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتا رہا لیکن اسے لاک اپ میں بند ہونا پڑا۔

ایک دن زمیندار اس سے ملنے پہنچا۔ پہرے پر موجود پولیس والے نے دلاور کو خبردار کیا "سنبھل کر ادب سے بیٹھ جاؤ" زمیندار صاحب تم سے ملاقات کے لئے آ رہے ہیں" دلاور حسین نے نفرت و حقارت سے پولیس والے کو دیکھا اور انتظار کرنے لگا۔

زمیندار ایک شان بے نیازی سے سلاخوں کے قریب آیا دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں۔

"اتنا بڑا ہو کر اتنی چھوٹی حرکتیں کرتا ہے" دلاور نے پہل کی۔

"حرکت کوئی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی۔ جو کامیاب ہو جائے وہی بڑی ہوتی ہے اور

میں کامیاب ہو گیا ہوں" زمیندار نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

"مگر کب تک 'کیا تو ہمیشہ مجھے یہاں رکھ سکے گا"

"پھر کچھ اور سوچیں گے" زمیندار نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تیری ہوس کا پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔ اتنے نوکر رکھ کر تو کیا کرے گا؟"

"مجھے اللہ نے دیا ہے تو نوکر رکھتا ہوں' تو فقیر کیا جانے"

"اللہ نے نہیں دیا' تیرے ظلم نے چھینا ہے' ہماری کمزوری نے تجھے دیا ہے' وہی جانور جو گاؤں کے ہر گھر میں ہونے چاہئیں تھے' تیرے شیطان گھر میں جمع ہو گئے ہیں"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ میں تجھ سے بحث کرنے نہیں آیا' میں تو تجھے یہ سمجھانے اور بتانے آیا تھا کہ اگر تو چاہے تو میں تیری ضمانت لے سکتا ہوں"

"میں تیرا کوئی احسان لینا بے غیرتی سمجھتا ہوں"

"اچھا تو غیرت دار صاحب' تم تو یہاں ہو مگر ڈاکو باہر آزاد پھر رہے ہیں یاد ہے نا جو میں نے کہا تھا' کوئی اغوا' کوئی ڈاکہ۔ اب کے آیا تو کسی خبر کے ساتھ ہی آؤں گا" زمیندار نے مونچھوں کی تاؤ دیا اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

"خدا کرے ماں' گلابو کو لے کر چاچا کے گھر چلی گئی ہو۔ وہ مجھ سے ملنے بھی تو نہیں آئی جو میں اسے کوئی صلاح دیتا۔ نہ جانے میرے بعد وہ کس حال میں ہوں" دلاور نے اپنے آپ سے کہا اور آنکھوں میں ابھرنے والی نمی پونچھنے لگا۔

گلابو کی ماں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ دلاور سے مل سکے لیکن غالباً" یہ بھی زمیندار کا کوئی حکم تھا کہ پولیس اسے ملنے ہی نہیں دیا۔ وہ بے چاری رو پیٹ کر بیٹھ گئی۔

آج دلاور کو گئے چوتھا دن تھا۔ اس دن کے بعد سے گلابو کی ماں حویلی بھی نہیں گئی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کی مدد سے اس کا چولھا جل رہا تھا مگر ایسا کب تک چلتا رہے گا' "جب تک دلاور آئے گا ہم چاچا کے یہاں کیوں نہ چلے جائیں؟ دلاور نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر تم مانی ہی نہیں" گلابو نے ماں سے کہا۔

"ہاں تو تیاری کر کل صبح نکل جائیں گے۔ زمیندار کا کیا ہے نہ معلوم اور کیا ظلم توڑے ہم پر" ماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

گلابو نے دن بھر اپنی سہیلیوں کی مدد سے ضروری سامان کی گٹھڑیاں باندھیں۔ بیل گاڑی کا انتظام بھی ہو گیا بس رات گزرنے اور دن نکلنے کا انتظار تھا۔ ابھی رات پہر سے نیچے اتری ہی تھی کہ ایک کالا سایہ ماں کے سرہانے دوسرا گلابو کی پائنتی آکر کھڑا ہو گیا دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں' چہروں پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ "خبردار جو کسی نے آواز نکالی ایک سائے کی زبان سے شعلہ نکلا۔

"کون ہو تم' کیا چاہتے ہو؟" بڑھیا نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔

"ارے لڑکی' ہمارے ساتھ چل"

"نہیں' خدا کے واسطے مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میرا بھیا آگیا تو تمہارا قیمہ کر دے گا" گلابو گڑگڑائی

"اٹھا اسے" ایک سائے نے دوسرے کو حکم دیا۔ بڑھیا راستے میں آ گئی۔ سائے نے اسے دھکا دیا۔ وہ اس وقت ہوش میں آئی جب نہ گلابو تھی نہ دونوں سائے کچھ دیر وہ حیرت سے گلابو کے پلنگ کو دیکھتی رہی پھر اس کی چیخوں سے گاؤں دہل گیا۔ پورا گاؤں اس کے آنگن میں سما گیا۔ کیا ہوا گلابو کو۔ کدھر گئی .... کدھر گئی .... کون تھے وہ لوگ .... مختلف آوازوں کی بھیڑ لگ گئی مگر کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کسی نے کہا "زمیندار کو خبر کر دو اب تو وہی کچھ کر سکتے ہیں"

"زمیندار ہی تو وہ شیطان ہے جس نے یہ سب کچھ کرایا ہے" کیا مدد کرے گا۔

"اس کا تو دماغ چل گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروائے گی۔ زمیندار کے خلاف بولتی ہے جیسا بیٹا ویسی ماں' آؤ بھائی آؤ پاگل کہیں کی" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں اور پھر خاموشی چھا گئی' آنگن خالی ہو گیا۔

گلابو کی ماں' گلابو کی پٹی سے لگ کر رات بھر کبھی اسے کبھی دلاور کو آوازیں دیتی رہی۔

صبح تمام گاؤں نے دیکھا کہ ایک پاگل بڑھیا زمیندار کی حویلی کے سامنے کبھی گلابو کبھی دلاور کو آوازیں دیتی پھر رہی ہے۔ بے چاری گلابو کی ماں۔ حویلی کے سامنے سے بھگائی گئی تو پولیس چوکی کے سامنے اس نے ڈیرا جما لیا پولیس نے وہاں بھی اسے نہ

ٹکنے دیا وہاں سے جانے کے بعد اسے کسی نے گاؤں میں نہ دیکھا۔ اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ کون جانے کس کی تلاش میں کتنی دور نکل گئی راستہ بھٹک گئی یا راستے سے ہٹا دی گئی۔

دلاور حسین اپنے گھر میں برپا ہونے والی ہر تباہی سے بے خبر سلاخوں کے پیچھے تھا۔ آج اس کے پہرے دار نے زمیندار کے آنے کی نوید بھی سنائی۔ زمیندار پھر اسی شان بے نیازی سے چلتا ہوا دلاور کے قریب پہنچا۔

"آج میں تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہوں" زمیندار نے اپنی آمد کا مقصد بتانے کے لئے کہا دلاور حسین مسلسل خاموش تھا "تمہاری بہن اغواء ہوگئی ہے"

"کتے! بکواس بند کر۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا" دلاور نے اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ زمیندار گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

"لیکن یقین کرو۔ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ رات کو ڈاکو آئے اور اس غریب کو اٹھا کر لے گئے" زمیندار نے اپنی صفائی پیش کی۔

"زمیندار، مجھے باہر نکلنے دے، میں چن چن کر تیرے کرتوتوں کا بدلہ تجھ سے لوں گا" دلاور اتنی زور سے دہاڑا کہ پہرے پر متعین پولیس والا جو زمیندار کے جانے کے بعد ادھر ادھر ہو گیا تھا، دوبارہ آ گیا۔

"غصہ تھوک دو دلاور" ہوش کے ناخن لو، میں اتنا گھٹیا نہیں کہ عورتیں اٹھواتا پھروں اور وہ بھی اپنے ہی گاؤں کی۔ گلابو میری بیٹی کی طرح ہے اس کے لئے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم قسم لے لو کہ یہ حرکت میری نہیں ہے" زمیندار بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے ایک نظر دلاور پر ڈالی دلاور سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اسے زمیندار کی باتوں کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ٹھنڈا دیکھ کر زمیندار کی ہمت بندھی۔ اس نے نہایت شفقت سے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ڈاکوؤں کا ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔ وہ پچیس ہزار روپے کے عوض گلابو کو چھوڑنے پر تیار ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں یہ پیغام دلاور تک پہنچا دیتا ہوں"

"مگر میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے"۔

"اوئے مجھے معلوم ہے، میں انتظام کر دوں گا۔ میں جانتا ہوں تجھ میں غیرت

بہت ہے اس لئے یہ رقم تجھے قرض دوں گا' خیرات نہیں' پر میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" دلاور کا غرور ٹوٹ چکا تھا۔

"بھئی تم دونوں بہن بھائی' میرا مطلب ہے گلابو اور تم میرے گھر اس وقت تک کام کرنے کے پابند ہو گے جب تک رقم اتر نہیں جاتی اور اس عرصے میں گاؤں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے"۔

"یہ رقم کتنے دن میں اتر جائے گی؟" دلاور نے پوچھا۔

"بھئی دو روپے تمہاری مزدوری دو گلابو کی۔ چار روپے روز کے حساب سے لگا لو۔ جتنے دن بھی لگ جائیں" زمیندار نے مکاری سے کہا۔

اس وقت حساب لگانے کا وقت کہاں تھا۔ دلاور کو تو یہ فکر تھی کہ جلد از جلد گلابو واپس آ جائے میں ایک مرتبہ اس قید سے باہر نکل جاؤں پھر حالات کو خود ہی سلجھا لوں گا۔ اس نے دل میں سوچا اور نہایت بے بسی سے زمیندار کو دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے زمیندار' میں تیار ہوں' میری گلابو واپس دلا دے۔

"اوئے فکر مت کر۔ اس کاغذ پر دستخط کر دے' کل تیری ضمانت بھی ہو جائے گی۔ سیدھا میری حویلی پہنچ جانا' گلابو وہیں مل جائے گی تجھے" زمیندار نے کاغذ آگے بڑھایا۔ دلاور نے اس پر دستخط کر دیئے زمیندار کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کے جانے کے بعد دلاور کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے سوچا ماں کے بارے میں تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔ خیر ٹھیک ہی ہوگی آج ہی کی تو بات ہے' کل میں گھر پہنچ ہی جاؤں گا اور وہ کل کا انتظار کرنے لگا۔

"دوسرے دن' زمیندار کے کہنے کے مطابق اسے اس پنجرے سے رہائی مل گئی۔ اس نے کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں لیں اور حویلی کی طرف چل دیا۔

حویلی پر پہنچتے ہی اسے اطلاع مل گئی کہ زمیندار اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اس کے مخصوص کمرے تک پہنچا ابھی اس نے کمرے کی دہلیز پار کی ہی تھی کہ زمیندار کی آواز گونجی "واپس جاؤ اور اس طرح کمرے میں داخل ہو جیسا کہ یہاں داخل ہونے کا قاعدہ ہے"۔

"جی مالک" دلاور کو یاد آیا کہ پنجرے سے نکل آیا ہے مگر اس کے پر تو ابھی کٹے

ہوئے ہیں۔

وہ دروازے تک واپس گیا جوتے اتارے تصویروں کی طرف منہ کر کے ہاتھ جوڑے' ہاتھ باندھ کر داخل ہوا زمیندار کے قدم چھوئے اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

زمیندار کے نوکروں میں سے ایک نے اسے یاد دلایا کہ اب تم پوچھو' مالک کیا حکم ہے میرے لئے۔

دلاور نے جی کڑا کر کے پوچھا "مالک کیا حکم ہے میرے لئے؟

زمیندار نے فاتحانہ نگاہوں سے اپنے نوکروں کی طرف دیکھا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ صرف انسان ہی نہیں ان کی غیرت بھی خرید سکتا ہے۔

"علی محمد تمہیں تمہارا کام سمجھا دے گا" زمیندار نے اپنے ایک نوکر کی طرف اشارہ کیا۔

"اور گلابو"

"ابھی پہنچنے والی ہے' مل لینا"

"آپ کی اجازت ہو تو ماں سے مل آؤں"

"علی محمد سے پوچھ لینا' بس اب جاؤ' زمیندار نے ناگواری سے کہا۔ دلاور حسین نے زمیندار کے قدم چھوئے اور الٹے قدموں دروازے سے باہر نکل آیا علی محمد بھی اس کے ساتھ تھا علی محمد کی زبانی اسے ماں کے بارے میں معلوم ہوتے دیر نہیں لگی۔ آگ نے شعلے کا رنگ اختیار کیا' وہ الٹے قدم زمیندار کی طرف لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر پہلے والا دلاور حسین بن گیا تھا "ذلیل کتے کہا ہے میری ماں"

"زمیندار عجیب مٹی کا بنا ہوا تھا' ذرا بھی اشتعال میں نہیں آیا۔ نہایت نرمی سے گویا ہوا بھئی وہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی ہے تمہارے چاچا کی طرف چلی گئی ہو گی' آ جائے گی۔

"میں جا رہا ہوں اسے لینے"

"مگر معاہدہ یہ ہوا تھا کہ تم گاؤں سے باہر نہیں جاؤ گے"

"میں نہیں مانتا تیرے کسی ایسے معاہدے کو۔ اگر روک سکتا ہے تو مجھے روک لے" دلاور واپس جانے کے لئے مڑا۔

"پھر گلابو کو واپس بھیج دوں" زمیندار نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ دلاور کے قدموں پر پھر زنجیر پڑ گئی۔ وہ رک گیا۔

"تو میری کمزوریوں سے کب تک کھیلتا رہے گا' زمیندار"

"تو' تو جذباتی ہو جاتا ہے۔ میں اپنا کوئی آدمی تیرے چاچا کی طرف بھیجوں گا' وہ تیری ماں کو بلا لائے گا فی الحال تو اپنا کام کر"

دلاور نے پھر اس کے پاؤں چھوئے اور کمرے سے نکل آیا علی محمد نے اسے کام پر لگا دیا۔ اس کے ذمے زمیندار کے کتوں کو راتب ڈالنے کا کام آیا دلاور نے قسمت کا لکھا سمجھ کر اسے قبول کر لیا اور آنے والے کسی بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

دوپہر کو اسے مطلع کیا گیا کہ گلابو گھر پہنچ گئی ہے۔ وہ گھر جا کر اس سے مل سکتا ہے اور کل سے دونوں کو باقاعدگی سے ڈیوٹی پر آنا ہوگا۔

دلاور اسی وقت گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ گلابو کوٹھری میں گم سم بیٹھی ہوئی تھی دلاور کو دیکھ کر آنکھوں سے جھرنا پھوٹ پڑا۔ نہ جانے کتنی دیر دونوں بہن بھائی اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے رہے۔

"چل اٹھ ہاتھ منہ دھو لے' تو زندہ آ گئی یہی میرے لئے بہت ہے" دلاور نے اسے دلاسا دیا۔

"دلاور' اماں کہاں گئی؟"

"کہیں نہیں گئی' آ جائے گی' چاچا کی طرف چلی گئی ہو گی .... بیچاری اکیلی رہ کر کیا کرتی یہاں"

"ابھی رضیہ آئی تھی' وہ تو کہہ رہی تھی ...."

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"وہ کہہ رہی تھی کہ ماں کا دماغ چل گیا تھا" گلابو پھر رونے لگی۔

"بکتی ہے وہ' وہ خود پاگل ہوگی۔ زمیندار نے مجھ سے کہا ہے وہ اپنا آدمی بھیج کر ماں کو بلا لے گا" دلاور نے تسلی دی کچھ دیر ٹھہر کر اس نے گلابو سے کہا "اور ہاں کل تو بھی میرے ساتھ حویلی چلنا تیری رہائی کے لئے یہی معاہدہ ہوا تھا مگر تو یہ نہ سمجھنا تیرا بھائی کمزور پڑ گیا ہے بس کچھ دن یہ ستم اٹھا لے پھر نہ زمیندار رہے گا نہ معاہدہ۔ موقع

آنے دے“

”نہیں دلاور نہیں۔ میں زندگی بھر تیری حیاتی کی خاطر حویلی کی مٹی چاٹتی رہوں گی۔ پر تو وعدہ کر' زمیندار کی جان نہیں لے گا۔

”لے' یہ کس نے کہا دیا تجھ سے ' اور بھی طریقے ہوتے ہیں' میں اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگنے لگا تھا۔“

دونوں بہن بھائیوں نے وہ رات' روتے جاگتے گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ زبردستی کی نوکری پر روانہ ہو گئے۔ انہیں یہ بیگار سہتے کئی دن گزرے گئے تھے۔ اب انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ماں' چاچا کی طرف گئی ہی نہیں' زمیندار کا اس میں کیا قصور وہ اپنی مرضی سے گاؤں چھوڑ کر گئی تھی۔ زندہ انسان کی لاکھ امیدیں۔ انہوں نے بھی صبر کر لیا کہ وہ مری تو نہیں زندہ ہے' کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گی۔ ابھی تو اس افتاد سے نمٹنا ہے جو سر پر آن پڑی ہے۔

اس تمام عرصے میں دلاور نے گونگے آدمی کا روپ دھار لیا تھا۔ نہ جانے وہ کسی کچھ کہتا نہ کسی کی سنتا۔ جو کام اسے سونپا گیا تھا' ہر وقت اسی میں لگا رہتا زمیندار بھی خوش تھا کہ کیسے سرکش کو زیر کر لیا۔ پورے گاؤں میں اب کوئی نہیں تھا جو اس پر انگلی اٹھاتا' جو اس سے پوچھتا تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں دلاور کی شکست کے بعد زمیندار کے دبدبے میں اضافہ ہوا تھا۔ بعض لوگ جو زمیندار کی کمزوری پر چھپ چھپ کر ہنستے تھے اب ان کے منہ پر تالا پڑ گیا تھا۔ زمیندار کو اب کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس سے زیادہ دلاور گلابو سے وہ کچھ چاہتا بھی نہیں تھا۔ دلاور نے دیر ہی سے سہی اسے یہ سب کچھ فراہم کر دیا تھا۔

گلابو کے لوٹ آنے کے بعد' دلاور کے دل میں بھی زمین دار کے لئے کچھ نہ کچھ جگہ بن گئی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ اگر زمیندار نہ ہوتا تو اتنی بڑی رقم اسے کون ادھار دیتا۔ قرض ہی سہی زمیندار نے اس کی مدد تو کی۔ اب اسے فکر تھی تو بس اتنی کہ کس طرح گلابو کو اس گاؤں سے رخصت کر دے لیکن ایسا ہوتا ممکن نظر نہیں آتا تھا وہ زمیندار سے کئے ہوئے معاہدے کا پابند تھا۔ وہ چاہتا تو نہیں تھا لیکن مجبور ہو کر اس نے یہ کوشش بھی کر دیکھی کہ اس گاؤں میں کوئی اس کی بہن کا ہاتھ تھامنے والا

مل جائے لیکن تھوڑے دن کی کوشش ہی نے اس پر یہ عقدہ کھول دیا کہ جو لڑکی اغوا ہو کر واپس آئی ہو اس سے شادی کرنے پر کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ اس کی بہن کے دوپٹے پر کیسا داغ لگ چکا ہے اس کی بے گناہی کی قسم اب کون کھا سکتا ہے۔ اب تو وہ یہ تک سوچنے لگا تھا کہ کاش وہ واپس ہی نہ آئی ہوتی۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ یہ سب باتیں گلابو سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب تو یہی ہو سکتا تھا کہ کسی ایسی جگہ اس کی شادی کر دی جائے جہاں لوگ اس کے ماضی کو نہ جانتے ہوں مگر یہ سب کچھ کیسے ہو؟ اس کا فی الحال اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ زمیندار کی طرف سے اس کے دل میں شکر گزاری کے جذبات ہونے کے باوجود انتقام کا لاوا تھا جو باہر نکلنے کے لئے بے چین تھا لیکن ابھی مجبوریوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ آزادانہ کوئی قدم اٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ اپنی خدمت گزاری سے، پہلے اپنا اعتبار بحال کر لے، اس کے بعد کچھ سوچے گا۔

ایک دن وہ خلاف معمول کام نمٹانے کے بعد گھر آ گیا تھا، گلابو جو حویلی پر تھی۔ گھر کی تنہائی نے اس کے خیالوں کو پرواز دی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں گلابو کو دلہن بنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو بھی دیکھا جو گلابو کی بلائیں لے رہی تھی انہی خیالوں کی انگلی تھامے وہ نیند کی وادی میں چلا گیا۔ وہاں بھی یہی خیال، خواب بن کر اس کے ساتھ تھے وہ ابھی ان خوابوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑا یہ گلابو تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر پسینے کے قطرے، سانس پھولا ہوا۔ دلاور اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا، کیا ہوا گلابو، کیا بات ہے" گلابو کے ہونٹ گلاب کی پتی کی طرح کپکپا رہے تھے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر الفاظ نہیں مل رہے ہوں "بول گلابو کیا بات ہے؟" دلاور نے پوچھا۔

بھیا، وہ .... وہ، جس نے مجھے اٹھایا تھا وہ ڈاکو .... " وہ چپ ہو گئی۔

"ہاں بول گلابو وہ ڈاکو"

"وہ ڈاکو حویلی میں ہے، زمیندار سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے"

"تجھے یقین ہے وہ، وہی ہے؟"

"ہاں بھیا! میں اس کی شکل کیسے بھول سکتی ہوں۔"

دلاور آندھی کی طرح چارپائی سے اٹھا اور طوفان کی طرح دروازے کی دہلیز پار کر کے حویلی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ سیدھا زمیندار کے کمرے میں گھس گیا دہرے جسم کا ایک آدمی جس کی ایک آنکھ اندر دھنسی ہوئی تھی' رخسار پر زخم کا نشان تھا' چہرے مہرے سے جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا زمیندار کے پاس بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا جیسے ہی دلاور پر نظر پڑی۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ دلاور کے ایک گھونسے نے اس آدمی کا جبڑا ہلا دیا ابھی وہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے کہ دلاور نے اسے گریبان سے پکڑا اور اس طرح اچھال دیا کہ جیسے وہ کلو دو کلو کا ربڑ کا پتلا ہو اسے اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ وہ کوئی جوابی کارروائی کرتا اس کے گرتے ہی دلاور اس کی چھاتی پر تھا۔ اتنی دیر میں نوکر چاکر جمع ہو چکے تھے زمیندار کی گرجدار آواز بھی دلاور کے کانوں میں آ رہی تھی لیکن اس پر تو خون سوار ہو چکا تھا پوری حویلی کے نوکر مل گئے تب کہیں جا کر دلاور کو قابو کیا گیا لیکن اتنی دیر میں اس نے اس آدمی کی مرہم پٹی کا اچھا خاصا انتظام کر دیا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ تمہیں اتنی جرات کیسے ہوئی کہ میرے مہمان پر ہاتھ اٹھاؤ" زمیندار نے زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"مالک یہ مہمان نہیں شیطان ہے۔ یہی ہے وہ درندہ جس نے گلابو کو اغواء کیا تھا۔ شاید یہ بات آپ کے علم میں نہیں ورنہ یہ تھپڑ آپ مجھے نہیں اسے رسید کرتے" دلاور نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ایک بھرپور کوشش کی لیکن نوکروں نے اسے بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"دیکھو دلاور ہو سکتا ہے یہ بات سچ ہو۔ ڈاکے مارنا اس کا کام ہے دھوکے سے اسے تمہارا گھر نظر آ گیا ہو مگر اس نے ہماری بات مان کر اسے چھوڑ بھی تو دیا تھا۔ اب یہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا' ہم اسے سمجھا دیں گے۔"

میں اس کی جان لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا"

زمیندار نے دلاور کے تیور دیکھ کر بندوق اٹھا لی "اگر اب تم نے میرے مہمان کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہیں ڈھیر کر دوں گا' لے جاؤ اسے"

زمیندار کے اس رویے سے دلاور کے دل میں شک پیدا ہوا وہ تو اس جذبے کے ساتھ حویلی آیا تھا کہ زمیندار کے لئے یہ انکشاف ہوگا اور وہ مجرم کی گرفتاری میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا۔

"جانتا ہوں مالک' آپ کے مہمان ہیں اس لئے چھوڑے دیتا ہوں ورنہ ...." اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ کہ سکا اور کمرے سے نکل گیا لیکن آج اس نے ایسی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا جس کی توقع ہی اس سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ حویلی سے نکلا اور اس راستے کی طرف چل دیا جو حویلی سے جنگل کی طرف جاتا تھا جنگل کے اس طرف ندی بہتی تھی' ندی کے اس پار پہاڑی سلسلہ تھا۔ مشہور تھا کہ ان پہاڑوں میں ڈاکو رہتے ہیں۔

دلاور حسین' جنگل کے قریب پہنچ کر ایک گھنی جھاڑی میں چھپ گیا۔ اس کی مددگار' واحد ہتھیار' اس کی لاٹھی اس کے پاس تھی۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا اسے معلوم تھا زمیندار کا وہ منحوس مہمان اسی راستے سے گزرے گا۔

دور سے آنے والی گھوڑے کی ٹاپوں نے اسے چونکا دیا اس نے لاٹھی سنبھالی اور سنبھل کر بیٹھ گیا جیسے بلی' چوہے کا انتظار کرتی ہے۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی' یہاں تک کہ گھڑسوار اسے نظر آنے لگا۔

جیسے ہی گھڑسوار قریب آیا' دلاور نے اپنی لاٹھی کو کمال چابک دستی سے گھوڑے کی ٹانگوں میں الجھا دیا۔ گھوڑا اپنے سوار سمیت زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے کے گرتے ہی دلاور جھاڑیوں سے نکلا اور ایک ہی جست میں گھڑسوار کی چھاتی پر سوار ہو گیا اجنبی گھڑسوار گھوڑے کے اس طرح گر جانے سے پہلے بدحواس تھا دلاور کو اپنی چھاتی پر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنا دفاع کرسکے وہ زیادہ دیر تک دلاور کے زوردار مکوں کا سامنا نہ کر سکا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون جاری تھا۔

"بتا کس کے کہنے پر تو نے یہ جرات کی تھی کہ میرے گھر میں داخل ہو" دلاور نے اس سے پوچھا۔

"اب وہ اتنا بے دم ہو چکا تھا کہ سب کچھ بتا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

"ہم تو حکم کے بندے ہیں زمیندار کے کہنے پر ہم نے یہ سب کیا تھا۔ مارنا ہے

تو اسے مار مجھے کیوں مارتا ہے"۔

دلاور کو شک تو پہلے ہی تھا' اب یقین ہو گیا اس نے ڈاکو کے ہاتھ پاؤں اس کی چادر سے باندھے اور اسے گھوڑے پر لاد کر تھانے پہنچ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس ڈاکو کے اقبالی بیان کے بعد زمیندار ' گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گا۔ تھانے پہنچتے ہی اس نے زوردار آواز لگائی داروغہ! لے سنبھال لے اپنا مجرم اور پوچھ اس سے "یہ کس کے حکم سے وارداتیں کرتا ہے کون ہے اس کے پیچھے جب تمہیں معلوم ہو گا تو ہوش اڑ جائیں گے تمہارے۔ جسے تم عزت دار سمجھتے ہو' عزتوں کا رکھوالا سمجھتے ہو .... گاؤں کی بہو بیٹیوں کا مالک سمجھتے ہو' زمیندار کہتے ہو' وہی ہے اس شیطانی کھیل کا اصل کردار اور ہاں داروغہ یہ تو ایک ہے' ایسے ایسے کتنے ڈاکو اس نے پالے ہوئے ہوں گے۔ میں نے اپنا کام کر دیا اب تم اپنا کام کرو"

"شاباش دلاور' تو نے کمال کر دیا۔ تو اب جا' میں اسے سنبھالتا ہوں۔ داروغہ نے چالاکی سے کہا۔

"کیا پاگل ہو گیا ہے دلاور زمیندار ایک عزت دار آدمی ہے' اس پر ہم ہاتھ نہیں ڈال سکتے ہمیں اوپر سے اجازت لینی ہوگی۔"

"اجازت کیسی' یہ ڈاکو اپنے منہ سے اس کا نام لے رہا ہے"

"نہ بابا! مجھے اپنی وردی نہیں اتروانی۔ میں پہلے اوپر سے اجازت لوں گا پھر اس پر ہاتھ ڈالوں گا تو ابھی گھر جا' صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا" داروغہ نے دلاور کو سمجھایا دلاور اس ڈاکو کو داروغہ کے حوالے کر کے گھر لوٹ آیا۔

"صبح ہوتے ہی ' گلابو روزانہ کی طرح حویلی جانے کے لئے تیاری کرنے لگی

"آج سے تو حویلی نہیں جائے گی"

"کیوں دلاور؟"

"آج تو زمیندار سرکاری مہمان بن چکا ہوگا۔ اب کیسا زمیندار کہاں کی زمینداری۔ تو میرا انتظار کر میں ابھی پولیس چوکی سے ہو کر آتا ہوں؟"

"رات جو ڈاکو میں نے آپ کے حوالے کیا تھا' اس کا کیا بنا' کیا کارروائی کی آپ نے؟"

"ڈاکو؟ کیسا ڈاکو کوئی خواب تو نہیں دیکھ لیا تم نے" داروغہ کے پاس بیٹھے ہوئے پولیس والوں نے قہقہے لگائے۔

"تم سب بکے ہوئے ہو زمیندار کے ہاتھوں' قہر ٹوٹے گا تم پر۔ یاد رکھو' ظلم کا ساتھ دینے والا کبھی سرسبز نہیں ہوتا داروغہ ' اگر تمہارے جسم پر قانون کی یہ وردی نہ ہوتی تو میں تمہاری تکا بوٹی کر دیتا" دلاور نے ان ضمیر فروشوں کی طرف منہ کر کے تھوک دیا اور باہر نکل آیا۔ اس کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا۔ وہ گھر جانے کے بجائے حویلی پہنچ گیا۔

"زمیندار! آج میں آزاد ہوں۔ میں نے تجھ سے کئے ہوئے معاہدے کو اپنے ارادے کی قینچی سے کترن کترن کر کے بکھیر دیا ہے۔ تیری چالیں میری سمجھ میں آ چکی ہیں۔ میں تیرے گندے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا لیکن اگر تو نے مجھے مجبور کر دیا' میری مزاحمت کی کوشش کی تو پھر تیرے وفادار مجھے نہیں روک سکیں گے اور یاد رکھ' جس دن تو میرے راستے میں آیا وہ تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ تو نے اپنے آدمی کو تو بھگا دیا لیکن اب تو مجھے بھی نہیں روک سکے گا۔ اپنے آدمیوں سے کہہ دے مجھے راستہ دے دیں ورنہ مجھے راستہ بنانا بھی آتا ہے دلاور کی بے خوفی دیکھ کر زمیندار سوچ میں پڑ گیا' "اسے راستہ دے دو" اس نے اپنے آدمیوں سے کہا جو دلاور کے وہاں پہنچتے ہی زمیندار کی حفاظت کے لئے جمع ہو گئے تھے دلاور کو راستہ مل گیا۔

دلاور کے نکلتے ہی زمیندار کے ملازموں نے بیک آواز کہا "مالک آپ نے اسے کیوں جانے دیا۔ آپ کہیں تو راستے ہی میں اس کا کام تمام کر دیں۔"

"نہیں' اس کے سر پر اس وقت خون سوار تھا اور ہاں اگر یہ گاؤں سے بھی چلا جائے تو اسے نہ روکنا ہمارا جو مقصد تھا پورا ہو گیا ہم نے اس کی اکڑی ہوئی گردن کو حویلی کی دہلیز پر جھکا دیا الیکشن قریب آ رہا ہے' اگر یہ گاؤں میں رہا تو ہمارے لئے مشکل پیدا کر دے گا۔ ہم جو کام کرتے ہیں شاباش' اب تم جاؤ اپنا کام کرو"

"دلاور گھر پہنچا تو گلابو اس کی منتظر تھی "کیا ہوا دلاور؟"

"تیری عزت کا قاتل تو فرار ہو گیا لیکن میں اس کے سرپرست سے پروانہ آزادی لکھوا لایا ہوں زمیندار اب ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بس تو چلنے

کی تیاری کر' میں دن کی روشنی میں یہ گاؤں چھوڑ دینا چاہتا ہوں رات کی تاریکی بزدل دشمن کے لئے بڑا سہارا ہوتی ہے"۔

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"اب تو چاچا کا گاؤں ہی ہمارا سہارا ہے"۔

"اور یہ گھر' زمین؟"

"میں زمیندار سے خوف زدہ تھوڑی ہوں' میں تو تجھ سے ڈرتا ہوں' وہ ہر مرتبہ تجھے میری کمزوری بنا دیتا ہے۔ تیری حفاظت کا انتظام ہو جائے' مجھے تو یہیں آ کر رہنا ہے۔ میں بھی چلا گیا تو ظلم کے خلاف آواز کون اٹھائے گا۔

گھر میں تھا ہی کیا۔ دو تین گٹھڑیاں اور ہتھیلی پر جان لے کر دونوں گھر سے نکلے۔ ہر آنکھ نے افسوس کیا مگر ہمت کسی کی تھی کہ انہیں روکے' یوں بھی نہ روکتے اور اب تو ان کے جانے میں زمیندار کی مرضی بھی شامل تھی۔

دلاور نے آنسوؤں کی کنجی سے گھر کے تالے کو بند کیا' لاٹھی پر گرفت مضبوط کی اور گلی چھوڑ دی گاؤں کے کتے دم ہلاتے اسے بڑی دور تک چھوڑنے آئے یہاں تک کہ گاؤں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دلاور کے گاؤں چھوڑنے کے بعد زمیندار نے بھی سکھ کا سانس لیا اور دلاور نے بھی۔

دلاور کا چاچا ان کی اس حالت سے بے خبر تھا۔ خبر ہو بھی جاتی تو بے چارہ کیاکر سکتا تھا زمیندار کسی گاؤں کا ہو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات کس میں' ہمدردی کے دو بول ہی کوئی بول دے یہی بہت ہے۔ چاچا کا یہی سہارا بہت تھا۔

گلابو اب مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کا گلاب پھر شاداب ہونے لگا تھا۔ کبھی ماں کا خیال آ جاتا تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں ورنہ چاچا کے گھر میں اسے کوئی غم نہیں تھا البتہ دلاور اب پہلے سے زیادہ فکر مند رہنے لگا تھا۔ وہ زمیندار کے خلاف طرح طرح کے پلان سوچتا' پھر خود ہی مسترد کر دیتا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ تنہا اس نظام کو نہیں بدل سکتا۔ بز دلوں کو بہادر نہیں بنا سکتا۔ ظلم کرنے والوں کے دلوں میں خوف خدا نہیں ڈال سکتا دولت کی طاقت کو غریبوں میں بانٹ کر اس کی مرکزیت کو

ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی طاقت نہیں وہ اس دھارے کا رخ تبدیل نہیں کر سکتا جو برسوں سے ایک ہی سمت بہہ رہا ہے اور جسے لوگوں نے اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا ہے آہستہ آہستہ اس کا وہ جذبہ خاموش ہو گیا جسے لے کر وہ گھر سے نکلا تھا۔

اچانک ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے کنکر پھینکا۔ آج باتوں باتوں میں چاچا نے اسے بتایا کہ زمیندار الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے دلاور کو یہ اطلاع اندھیرے میں جگنوں کی طرح معلوم ہوئی۔ اس نے الیکشن میں یہی سوچا تھا کہ الیکشن میں کھڑا ہونے والا اپنے جلسوں میں ' مخالفین کے خلاف جو بھی کہنا چاہتا ہے اسے اس کی آزادی ہوتی ہے اور لوگ اس کی بات سنتے بھی ہیں اگر وہ بھی الیکشن میں کھڑا ہو جائے اور زمیندار کے کرتوتوں سے لوگوں کو آگاہ کرے تو ممکن ہے لوگ اس سے متنفر ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ ملک کی خدمت بھی ہوگی اور گاؤں کی بھی اس نے سوچا اور چاچا سے کہا چاچا کیا میں بھی الیکشن میں کھڑا ہو سکتا ہوں؟"

اس کی یہ بات سن کر چاچا اتنی زور سے ہنسا کہ دلاور ڈر گیا وہ سمجھا کہ شاید اس نے مضحکہ خیز بات کر دی ہے؟"

کیوں چاچا' تو ہنس کیوں رہا ہے؟"

"ہنسوں نہیں تو اور کیا کروں بھائی یہ الیکشن بازی بڑے لوگوں کے کام ہیں بڑا پیسہ لگتا ہے اس میں"

پیسے کی تو فکر مت کر۔ بس تو یہ بتا دے کہ میں کھڑا ہو سکتا ہوں؟"

"کھڑا کیوں نہ ہو سکتا۔ تو شہری ہے اس ملک کا مگر پھر وہی بات کہ اتنا پیسہ کہاں سے لائے گا؟"

"چاچا مجھے معلوم ہے الیکشن میں پیسہ نہیں خرچ ہوتا ہے خرچ ہوتا ہے ووٹ خریدنے میں۔ میں تو لوگوں تک اپنی بات پہنچانا چاہتا ہوں' وہ مفت پہنچ سکتی ہے۔ میری بات سن کر بھی وہ مجھے ووٹ نہ دیں تو ان کی مرضی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے اگر ظلم ختم نہیں ہو جاتا تو کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔ میں ہار بھی گیا تو مجھے یہ فخر تو ہوگا کہ میں نے ظلم کو کمزور کیا' زمیندار کو یہ دکھ تو ہوگا کہ اس کی دولت مجھے نہیں خرید

سکی۔ بس چاچا تو اتنا کر دو چار ہزار روپے یا جتنے تیرے پاس ہوں اس وقت مجھے دے دے‘ میں زمین بیچ کر تجھے لوٹا دوں گا۔“

دلاور نے اپنے گاؤں میں الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور زمیندار کے خلاف کاغذات نامزدگی داخل کرا دیئے پہلے تو زمیندار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب اس نے دیکھا کہ کاغذات منظور ہو گئے‘ دلاور نے اپنے گھر کو الیکشن آفس بھی بنا لیا۔ گلابو تو گلابو اس کا چچا بھی اس کے ورکر بن کر اس کا کام کر رہے ہیں‘ تھوڑے بہت گاؤں والے بھی اس کی باتوں میں آ گئے ہیں باقی لوگوں کے بھکنے کا بھی امکان ہے تو اس کے کان سرخ ہوئے۔

”اب دلاور ہمارے لئے خطرناک ہوتا جا رہا ہے“ اس نے اپنے ہمنواؤں سے کہا۔

”آپ ہی نے اسے اتنی چھوٹ دی ہوئی ہے آپ کہیں تو اسے آج ہی راستے سے ہٹا دیں“ خوشامدیوں نے اجازت مانگی“

”نہیں پہلے کی بات اور تھی لیکن اب اس کی جان کو نقصان پہنچانا ہماری بدنامی کا باعث بن سکتا ہے“

” گلابو کو اغوا کرا لیں؟“

”اب اس کا وقت بھی نکل چکا ہے“

”پھر کیا کیا جائے ؟“ خوشامدیوں نے تشویش کا اظہار کیا زمیندار کے شیطانی ذہن نے اپنی جیب سے روایتی کارڈ نکالا۔

”تمام ووٹروں میں اس وقت تک نوٹ بانٹتے رہو جب تک الیکشن ہو نہیں جاتا۔ وہ کنگلے کی اولاد ‘ ووٹوں سے ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے‘ نوٹوں سے کیسے کرے گا۔“

”جو حکم سرکار کا“

الیکشن کی گہما گہمی زور و شور سے جاری تھی۔ زمیندار جہاں جلسہ کرتا دوسرے دن دلاور وہیں جلسہ کرتا۔ گاؤں والوں کو تو شغل ہاتھ لگ گیا دلاور کے جلسے میں بھی لوگ بڑی تعداد میں آ رہے تھے دلاور بھی اپنی حسرتیں خوب نکال رہا تھا۔ وہ باتیں جو

گاؤں کے لوگ صرف محسوس کرسکتے تھے ' دلاور نے ان باتوں کو زبان دی تھی۔ گاؤں والوں کے لئے یہ باتیں نئی بھی تھیں' انوکھی بھی اور حیرت انگیز بھی انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ برسرعام' زمیندار کی برائیاں سنی تھیں اور برائیاں کرنے والے کسی شخص کو دیکھا تھا دلاور کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ گلابو نے عورتوں کا محاذ سنبھالا ہوا تھا۔ زمیندار کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

آخر الیکشن کا دن آ گیا۔ دلاور کو اپنی جیت کا مکمل یقین تھا۔ وہ سچائی پر تھا اور اس نے یہی سنا تھا کہ سچائی کی جیت ہوتی ہے لیکن شاید یہ قول اس وقت ایجاد ہوا تھا جب پیسہ ایجاد نہیں ہوا تھا الیکشن کا رزلٹ آیا تو دلاور بری طرح ہار چکا تھا زمیندار کے آدمی گلی گلی بھنگڑا ڈالتے پھر رہے تھے رات گئے زمیندار کو لوگ کاندھوں پر اٹھائے بھنگڑا ڈالتے پھر رہے تھے۔ رات گئے زمیندار کو لوگ کاندھوں پر اٹھا کر حویلی میں لائے حویلی کے صدر دروازے پر اس نے اپنے استقبال کے لئے جمع ہونے والوں سے مختصر خطاب بھی کیا اس کی پوری تقریر دلاور کے خلاف تھی۔ دلاور سے اب صبر نہیں ہوا اس نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر گاؤں کو للکارا ! گاؤں والو" اس نے پھر پکارا ' "تم نے اپنی تلوار سے اپنے ہاتھ خود قلم کر لئے ہیں تم نے ایک ایسے ظالم کو اپنا آقا چن لیا ہے جو تمہاری عزتوں کا لٹیرا ہے جو تمہارے سکون کا ڈاکو ہے تمہیں موقع ملا تھا لیکن تم اس نظام کو بدلنے کے لئے آگے نہیں آئے جس نظام نے تمہاری تقدیر کا مالک اس شیطان کو بنا دیا ہے جس کا نام زمیندار ہے۔ یاد رکھو' جب تک ایک ظلم سہنے والا بھی اس دنیا میں موجود ہے' ظلم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ تم ظالم کی حمایت کرنے کے گنہگار بنے ہو۔ اب اس گاؤں کے ہر گھر سے ایک گلابو روز اٹھے گی۔ اس واسطے کہ اب تک زمیندار کے پاس صرف دولت کی طاقت تھی۔ اب تم نے اس کے ہاتھ میں سیاست کی طاقت بھی دے دی ہے۔ اب تک اس کو زمینداری کا نشہ تھا تم نے اسے جیت کے نشے کا حق دار بھی بنا دیا ہے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ میری ماں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا' اس گاؤں میں مرد نہیں زمیندار کے غلام رہتے ہیں"

ان لفظوں کے بعد اسے کسی نے بولنے ہی نہ دیا ہر طرف سے اتنے پتھر آئے کہ

اسے ٹیلے سے اترنا پڑا۔

وہ بازی ہار چکا تھا اب اس گاؤں میں اس کا رہنا خطرناک بھی تھا اور باعث شرم بھی۔ وہ اس ارادے سے گھر کی طرف چل پڑا کہ اب اسی وقت وہ گلابو کو لے کر اس بے وفا گاؤں سے نکل جائے گا۔

اس نے گھر کا دروازہ پار کیا ہی تھا کہ زمین نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ گلابو کی لاش چھت کی کڑیوں سے لٹکی ہوئی تھی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے جیسے مرنے سے پہلے اس پر کسی نے تشدد کیا ایک طرف اس کا چاچا اوندھے منہ پڑا تھا پیٹھ پر گولی کا نشان صاف نظر آ رہا تھا زمیندار نے دلاور کو غافل پا کر اپنی ہار کا بدلہ لے لیا تھا۔

دلاور کی آنکھیں پتھر بن گئی تھیں اس نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اجازت ہی نہ دی اس نے لالٹین کی دھیمی روشنی میں کلہاڑی ڈھونڈی اور حویلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”حویلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ زمیندار ابھی تک صدر دروازے پر بیٹھا مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ بھیڑ اسی طرح لگی ہوئی تھی جیسی کچھ دیر پہلے دلاور چھوڑ گیا تھا فتح کے نشے میں بدمست ہجوم نے دیکھا ہی نہیں کہ دلاور کب آیا اور ہجوم کے بیچ پہنچ کر تھم گیا ہجوم تو اس وقت چونکا جب دلاور کی آواز گونجی۔

”زمیندار' تو نے وہ زنجیر خود ہی کاٹ دی جو تیری زندگی کی ضمانت تھی۔ تو نے میری کمزوری مجھ سے چھین لی جو تیری طرف ہاتھوں کو بڑھنے ہی نہیں دیتی تھی تو نے میری بہن گلابو کو مجھ سے چھین لیا' اب ہے کوئی جو تجھے بچا لے؟“ دلاور نے کلہاڑی ہوا میں لہرائی مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

”دلاور وہیں رک جا“ زمیندار نے بندوق اس کی طرف کرتے ہوئے کہا مگر دلاور تو جیسے اندھا ہو چکا تھا اس کے قدم بڑھتے رہے۔

”رک جا دلاور“ زمیندار کی خوفزدہ آواز ابھری۔ دلاور اب اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا فائر کی آواز گونجی۔ دلاور کے قدم لڑکھڑائے کلہاڑی' ہوا میں لہرائی اور زمیندار کی گردن پگڑی سمیت زمین پر گر گئی۔

دلاور بھی شاید اسی لمحے تک کے لئے زندہ تھا۔ زمیندار کی بندوق سے نکلی ہوئی گولی اس کے بدن میں اتر گئی تھی کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی، وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ زمیندار کی ہر بات پر واہ واہ کہنے والے اس کی موت پر آنسو بہانے کو تیار نہیں تھے۔ اچانک ایک پاگل بڑھیا مجمع کو چیرتی ہوئی آئی۔ تیز روشنیوں میں ہر آنکھ نے اسے پہچان لیا، وہ دلاور کی ماں تھی۔

بڑھیا زمیندار کی لاش کے قریب گئی۔ اپنی ٹھوکر سے زمین دار کی کٹی ہوئی گردن کو ٹھکرایا پھر دلاور کی لاش کے قریب آئی اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر بیٹھ گئی اور غضب ناک آواز میں گاؤں والوں سے مخاطب ہوئی ''اس گاؤں میں صرف زمیندار کے غلام نہیں رہتے'' ایک مرد بھی رہتا تھا مگر تم نے اسے مار دیا اب تو زمیندار بھی نہیں رہا۔ اب صرف غلام رہتے ہیں، صرف غلام۔

میں غلاموں میں کیوں رہوں کیوں رہوں غلاموں میں!

بڑھیا نے دلاور کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جنگل کی طرف نکل گئی۔



بند گلی

زبیدہ کالج کے عین سامنے، کچی زمین کے سینے پر کچے بلاکوں اور لکڑی کی چند خالی پیٹیوں سے بنے ہوئے ڈبے نما کمرے میں وہ پچھلے ایک سال سے رہ رہا تھا۔ زبیدہ کاٹیج اور اس لکڑی کے محل کے درمیان ایک پتلی سی سڑک حائل تھی جو شارع عام نہیں تھی۔ اس پر عموماً اسی علاقے میں رہنے والوں کی گاڑیاں گزرتی تھیں یا پھر کوئی بھولا بھٹکا رکشا ادھر آنکلتا تھا۔ زبیدہ کاٹیج اس سڑک کا آخری گھر تھا جس کے برابر والی سڑک سے بس گزرا کرتی تھی اور اسٹاپ کا نام تھا زبیدہ کاٹیج۔ یہ اس علاقے کا سب سے شاندار گھر تھا۔ اس کے علاوہ جو گھر تھے وہ پکے تو تھے شاندار نہیں تھے دراصل یہ علاقہ ابھی آباد ہونا شروع ہی ہوا تھا' اس لئے دولت مندوں کا رخ اس طرف نہیں ہوا تھا۔ دکانیں بھی بس اکا دکا ہی تھیں۔ شام ڈھلے تو ایسا سناٹا ہو جاتا تھا جیسے ان گھروں میں لوگ نہ رہتے ہوں صرف روشنی آباد ہو۔ دریچوں سے جھانکتی ہوئی روشنی' بالکونیوں پر ٹنگی ہوئی روشنی' سڑک پر پھیلی ہوئی روشنی لیکن یہ منظر سڑک کے ایک طرف تھا۔ دوسری طرف میدان' گھپ اندھیرا مکڑی کے کھوکھوں سے بنا ہوا کمرا اور اس میں رہنے والا' جو پاگل ہرگز نہیں تھا' بس اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا مگر آنکھیں بے چین رہتی تھیں' جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔

اس کا نام سوکھا تھا جی ہاں سوکھا عجب سا نام تھا مگر تھا حالانکہ وہ سوکھا کہیں سے بھی نہیں تھا۔ جیسے سب ہوتے ہیں ویسا ہی تھا بلکہ دوسروں مردوں سے ہاتھ پیروں میں کچھ زیادہ ہی مضبوط تھا البتہ چہرے پر ہر وقت مردنی چھائی رہتی تھی جو اس کے دل میں چھپے ہوئے کسی گہرے دکھ کا پتا دیتی تھی وہ دن بھر زبیدہ کاٹیج کو تکتا رہتا' شام کو میدان

میں جمع ہونے والوں کو دیکھتا اور رات کو سڑک کو روشنی میں جب تک اس کا دل چاہتا چہل قدمی کرتا۔ اس کی خاموش طبعی اور بے نیازی نے اسے محلے بھر میں مقبول بنا دیا تھا مگر اس کا حال یہ کہ ملتا سب سے تھا' کھلتا کسی پر نہیں تھا۔

بیشتر لوگ جن میں بزرگ خاص طور پر شامل تھے اسے مجذوب یا ولی اللہ سمجھتے تھے۔ اکثر چھٹی والے دن یا یونہی کسی شام کو بابو پان والے کی دکان پر لوگ جمع ہو جاتے تو اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

"بابو جی' کیا بات کرو ہو' پڑا پہنچا ہوا ہے اپنا سوکھا میاں" رشید پان والا پان پہ کتھا لگاتے ہوئے کہتا۔

"اس کی گواہی تو پیارے اپنا دل بھی دیتا ہے" کوئی اور کہتا۔

"ابے تو کیا' تیرا دل کیا' سوکھا بھائی کی کرامت مجھ سے سن۔ میں سناؤں گا تجھے" گامو سبزی والا اپنی دکان سے کود کر آ گیا "لے بھائی ایک دن کی بات ہے' میں گلے سے پیسے نکالنا بھول گیا اور چلا گیا جی گھر۔ رات کو مجھے خیال آیا' گامو پیسے تو ہیں نہیں صبح منڈی کیسے جائے گا۔ بس جی' میں بھاگم بھاگ دکان پر آیا راستے میں مجھے حجرت سوکھا میاں مل گئے۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں نکالے اسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ارے میاں' اسمان سے باتیں' جنے کیا راج و نیاج ہو رہے تھے اللہ میاں سے۔ دو کالے کتے' اللہ جھوٹ نہ بلوائے' گائے کے برابر ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے تو میں ڈرا پھر میں نے سوچا اپنے سوکھے میاں اسلام علیکم انہوں نے اپنی آنکھیں اسمان سے اتاریں اور میرے چہرے پر رکھ دیں۔ بولے پھر بھی کچھ نہیں۔"

"ایسے لوگ بولتے نہیں ہیں اور پھر اس وقت تو وہ ہم کلام تھے اللہ میاں سے" ایک بزرگ نے تسبیح گھماتے ہوئے لقمہ دیا۔

"مگر چچا میاں' سلام کا جواب تو دینا چاہئے تھا" ایک نوجوان نے شوخی دکھائی۔

"چپ گستاخ' دے دیا جواب انہوں نے مگر سنیں گے اس کے کان؟ گامو کے گنہگار کان ان کی آواز سن سکتے ہیں؟ ارے نادان' ایسے لوگوں کی تو نماز بھی دوسری ہی ہوتی ہے۔"

"چچا تو میں یہ کہہ رہا تھا" گامو نے اپنا قصہ پھر شروع کیا "میں نے اجازت لی

اور دکان کھولی۔ پوری دکان میں نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ میری تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ یا اللہ ! یہ کیا ماجرا ہے گلا کھولا۔ نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اتنی تو سبزی نہیں بکی تھی' جتنے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ میں نے نوٹ جیب میں بھرے اور دکان کو تالا لگا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں' سوکھے میاں غائب۔ جیسے تھے ہی نہیں۔ اب سنو' صبح منڈی گیا تو ہر آدمی مجھے سلام کر رہا ہے منشی الگ' آڑھتی الگ' ہر آدمی مجھے سلام کر رہا ہے اچانک عجت بڑھ گئی اپنی۔"

"سبحان اللہ۔ قسمت کا دھنی ہے تو گامو" ایک اور بزرگ نے اسے مبارکباد دی اور ہاتھ ملایا۔

"برکت ہے ہمارے محلے کے لئے ان کی ذات"۔

"اس نوجوانی میں اس شخص نے کیا مرتبہ پایا ہے' سبحان اللہ !

جب یہ کہانیاں عام ہوں تو سوکھا میاں کو زندگی گزارنا کیا مشکل۔ تقریباً ہر گھر سے ان کے لئے کھانا آ جاتا تھا۔ کوئی دو چار روپے جیب میں ڈال دیتا آتے جاتے سلام الگ!

سوکھا کو بچپن میں سوکھے کی بیماری ہو گئی تھی لہٰذا سب اسے سوکھا کہنے لگے تھے اور جب یہ بیماری گزر گئی اس کے ہاتھ پیروں نے جان پکڑی تب بھی اس ہٹے کٹے کو سب سوکھا کہہ کر پکارتے رہے اور اب تو اتنے دن گزر گئے تھے اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے وہ گلاب پور نامی گاؤں کا رہنا والا تھا اپنی محبوبہ' زبیدہ کی تلاش میں شہر آیا تھا۔ انسانوں کے اس جنگل میں اس کی زبیدہ اسے کہاں ملتی۔ نہ اس کا پتا معلوم تھا نہ نشان کا علم۔ بس انکل سے ادھر ادھر ڈھونڈتا پھرتا۔ ہر گھڑی کھڑکی میں جھانکا' ہر دروازے پر دستک دی۔ وہ بڑی امیدیں لے کر آیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ شہر میں بھی گاؤں کی طرح سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے لیکن چند ہی دن بعد اس ک ہوش ٹھکانے آ گئے بھوک پیاس نے اسے ادھ موا کر دیا لیکن دیوانگی ایسی طاری تھی کہ گاؤں واپس جانے کا خیال بھی اسے وحشت زدہ کر دیتا تھا اور پھر گاؤں میں اس کا تھا بھی کون جس کی خاطر واپس چلا جاتا ۔ جہاں مزدوری مل جاتی دو پیسے کما لیتا' جہاں رات ہوتی سو جاتا۔ کئی برس اس طرح بیت گئے۔ اس کی حالت دیوانوں کی طرح ہو

ئی۔ داڑھی بڑھ گئی' کپڑے میلے ہوتے چلے گئے' آنکھوں کی وحشت بڑھتی چلی گئی تلاش کا سفر ابھی تھما نہیں تھا۔ ایک بس سے دوسری بس میں وہ محلے محلے کی خاک پھانتا پھرا کہ شاید کسی موڑ پر اس کی زبیدہ اسے دکھائی دے جائے۔ بے شک وہ کسی کے ساتھ ہی ہو مگر وہ اسے دیکھ تو لے گا۔ اسے یقین تو دلا سکے گا کہ سوکھا' مرا نہیں زندہ ہے۔

ہر دن کی طرح اس دن بھی وہ بس میں سفر کر رہا تھا' ہر چہرے میں زبیدہ کو تلاش کر رہا تھا کہ کنڈیکٹر نے آواز لگائی' زبیدہ کالج۔ وہ سمجھا اس کے کان بج رہے ہیں کنڈیکٹر نے پھر صدا لگائی "زبیدہ کالج والے گیٹ پر پہنچیں"

وہ ھڑبڑا کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا زبیدہ تک تو بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی مگر کالج کیا ہے' یہ معاملہ اس کے پلے نہیں پڑا۔ پھر بھی وہ گیٹ پر پہنچ گیا۔ بس رک گئی۔

"بھائی' یہ زبیدہ کالج کیا ہے؟" اس نے ایک مسافر سے پوچھا۔

"تمہیں اترنا کہاں ہے" مسافر نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"یہیں زبیدہ پر"

"تو پھر اترو"

اور وہ اتر گیا مگر جائے کہاں یہاں زبیدہ تو کیا' کوئی بھی لڑکی نہیں تھی۔ ایک طرف میدان تھا' دوسری جانب مکانوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ وہ مکانوں کی طرف چل دیا اس نے سوچا' لڑکیاں تو مکانوں میں رہتی ہیں کیا خبر کسی مکان کی چھت پر اس کی زبیدہ بال سکھاتی کپڑے پھیلاتی اسے نظر آجائے۔

وہ چھتوں کو ٹٹولتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر چلنے والے اکثر گر ہی جایا کرتے ہیں مگر سوکھا تو اسے اپنی خوش بختی سمجھ کر زمین سے اٹھنا ہی بھول گیا اس نے محسوس کیا کہ شاید اس کی منزل قریب آگئی ہے زبیدہ یہیں کہیں رہتی ہو گی ورنہ وہ گرتا کیوں۔ یہ دوسری مرتبہ ہوا تھا کہ وہ راہ چلتے گرا تھا۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ اور زبیدہ گاؤں میں تھے اور ایک مرتبہ زبیدہ اسے

ستانے کے لئے کسی گھر میں جا چھپی تھی۔ وہ اسے ہر گھر میں ڈھونڈتا پھرا تھا۔ پھر رمو کے گھر میں وہ ہے ہی ایسی۔ جب گرو تب ملتی ہے' سوکھا نے زمین پر پڑے پڑے سوچا اور کپڑے بغیر جھاڑے اٹھ کھڑا ہوا۔ زبیدہ یہیں کہیں رہتی ہو گی مگر پوچھوں کس سے سوکھا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

"بھائی' یہاں زبیدہ رہتی ہے' کون سا گھر ہے اس کا؟"

راہ گیر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پاگل سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ سوکھا پھر اکیلا رہ گیا اب وہ ایک دو منزلہ مکان کے نیچے کھڑا تھا۔

"اے پاگل' کیا دیکھ رہا ہے"" ایک لڑکے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

سوکھا نے گھبرا کر کہا "زبیدہ"

ہاں' یہی ہے زبیدہ کاٹیج' لڑکا یہ کہتا ہوا کسی گلی میں مڑ گیا۔

"عجیب لوگ ہیں یہ شہر والے بھی۔ مکانوں کے نام زبیدہ رکھتے ہیں" وہ خود سے ہم کلام ہوا پھر جیسے اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ میری زبیدہ یقیناً یہیں رہتی ہو گی مگر اتنے بڑے گھر میں چلو خوش تو ہو گی اب تو وہ موٹروں میں گھومتی ہو گی وہ بہت دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ مکان کے اندر کیسے پہنچے' زبیدہ کو کیسے معلوم ہو کہ سوکھا آیا ہے کہ مکان کا دروازہ کھلا۔ سوکھا گھبرا کر ایک طرف ہو گیا۔ دروازے سے ایک کار نمودار ہوئی کوئی مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا' برابر میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ سوکھا نے اس عورت کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ عورت اسے صاف نظر نہیں آ رہی تھی کار تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی سوکھا نے سرگوشی میں کہا "زبیدہ" اور کار کے پیچھے تیزی سے دوڑتا چلا گیا کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی سوکھا' ہارے ہوئے جواری کی طرح پھر زبیدہ کاٹیج کی طرف لوٹ آیا۔ اس پر یہ راز نہیں کھل سکا تھا کہ وہ عورت کون تھی اس کی زبیدہ یا کوئی اور! اس نے سڑک پار کی اور زبیدہ کاٹیج کے عین سامنے کھلے میدان میں بیٹھ کر کار کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ شام کے وقت زبیدہ کاٹیج کے دروازے پر ایک کار آ کر رکی لیکن جتنی دیر میں وہ سڑک پار کر کے وہاں پہنچا'

گاڑی مکان میں داخل ہو چکی تھی۔ سوکھا کی مراد اس مرتبہ بھی پوری نہیں ہوئی۔

کار تو اپنے ٹھکانے پر واپس پلٹ آئی مگر وہ کہاں جاتا۔ اس کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا یوں بھی کوئی نہ کوئی فٹ پاتھ ہی اس کا بستر ہوا کرتا تھی' آج یہیں سہی شاید وہ نظر آ جائے اس نے سڑک پار کی اور میدان میں بیٹھ گیا جب گھروں میں روشنیاں روشن ہو گئیں تو اس کے دل میں اندھیرا پھیل گیا اب وہ کیا آئے گی کل دن کے اجالے میں شاید نظر آ جائے اس نے ادھر ادھر وقت گزاری کے بعد کھلے میدان میں آنکھیں بند کر لیں۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو زبیدہ کاٹیج کے آثار بیدار ہو چکے تھے مگر ابھی تک وہ مردہ ہی تھا اس کی جان تو زبیدہ میں تھی وہ مکان کی جانب نظر لگا کر بیٹھ گیا مکان سے وہی کار برآمد ہوئی مگر اب اس میں صرف مرد بیٹھا ہوا تھا اس کا مطلب ہے' زبیدہ گھر ہی میں ہے وہ مطمئن ہو گیا اب اس کی نگاہیں دریچوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

راہ گیروں نے اسے دیکھا اور پاگل سمجھ کر اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے وہ پلکیں جھپکے بغیر اس مکان ک اینٹیں گنتا رہا گنتا رہا اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ دھوپ کب اس کے سر سے گزر گئی وہ کار پھر مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ دروازہ بند ہو گیا اس کے حلق میں اب کانٹے چبھنے لگے تھے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک طرف کو چل دیا۔

"پانی پلاؤ گے؟" اس نے چائے کے ایک چھوٹے ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ رکھا ہے' پی لو ہوٹل والے نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے سوکھا سے کہا "چائے پیئے گا"

سوکھا نے اثبات میں گردن ہلا دی ہوٹل والے نے چائے منگا دی۔

ابھی اس نے چائے کا ایک گھونٹ ہی لیا تھا کہ وہ کار ہوٹل کے سامنے سے گزری۔

"زبیدہ ' رکو۔ میں ہوں تمہارا سوکھا رکو تو" اس نے چیخنا اور گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ نتیجہ وہی نکلا' گاڑی دور نکل گئی سوکھا' ہانپتا کانپتا واپس آ گیا۔

"ابے کیا ہو گیا تھا ' کہاں بھاگا جا رہا تھا"۔ ہوٹل والے نے اسے واپس آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"وہ زبیدہ میری زبیدہ ابھی ابھی گاڑی میں گئی ہے۔"

"تیری زبیدہ؟"

"ہاں' روز گزر جاتی ہے' میری طرف دیکھتی ہی نہیں۔"

ہوٹل والے کی ہنسی نکل گئی پھر اس کے فلک شگاف قہقہوں نے پورے ہوٹل کو جمع کر لیا۔

"لو بھئی' یہ تو بڑے پہنچے ہوئے نکلے۔ ہم تو خود ہی کہتے تھے' ان کا تو جواب ہی نہیں"

لوگوں نے زبیدہ کا نام لے کر سوکھا کو چھیڑنا شروع کر دیا۔

سوکھا کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے ہوٹل والے کو گھورا اور آدھی چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قہقہے اس کے پیچھے گونجتے رہے' وہ پھر میدان میں آ بیٹھا۔

زبیدہ کالج سے نکلنے والی گاڑی کے پیچھے دور تک بھاگنا اس کا معمول بن چکا تھا بلکہ ایک روز تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ وہ کار کے سامنے سے ہٹا ہی نہیں تھا۔ اگر گاڑی چلانے والا مشاق نہ ہوتا وہ کچل چکا تھا۔

"ارے کیا پاگل ہے' ہٹ سامنے سے" گاڑی میں بیٹھا ہوا مرد پوری طاقت سے بریک پر پاؤں رکھ کر چلایا۔

گاڑی رکتے ہی سوکھا کھڑکی کی طرف دوڑا "زبیدہ ' زبیدہ" کھڑکی میں اس کی زبیدہ نہیں کوئی اور عورت بیٹھی ہوئی تھی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"زبیدہ کہاں ہے؟ میری زبیدہ کو کہاں بند کیا ہوا ہے تم نے' مجھ سے ملنے کیوں نہیں دیتے۔"

"لیجئے' دادی اماں کے زمانے کی روح سے ملاقات کیجئے"' عورت نے پاس بیٹھے ہوئے مرد سے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' اب تو ملنا ہی پڑے گا"

"کیا کام تھا تمہیں ان سے" عورت نے دلچسپی لیتے ہوئے سوکھا سے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی' ملنا تھا اس سے' وہ میری .... وہ جی زبیدہ میری ....گاؤں میں بھی نہیں ہے' معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے"۔

"دیر کر دی تم نے' دادی اماں کو تو مرے ہوئے بھی کئی برس گزر گئے۔"

عورت نے سوکھا کا مذاق اڑایا اور مرد نے گاڑی چلا دی۔

"پاگل ہے بے چارہ" مرد نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا اور شیشے میں سوکھا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا ہوا تھا۔

اس دن کے بعد سے سوکھا نے یہ سمجھ لیا کہ جیسے زبیدہ کاٹیج' اس کی زبیدہ کی قبر ہو اور وہ اس کا مجاور زبیدہ کاٹیج والی عورت کو اس کے عاشقانہ جذبے پر اتنا پیار آیا کہ وہ کبھی کبھی اس کے لئے کھانا بھیجنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی اور گھروں سے بھی کھانا آنے لگا اور یوں سوکھا کے قدم اس زمین سے مانوس ہوتے چلے گئے' وہ وہیں جم گیا اسے یقین ہو گیا تھا کہ زبیدہ مر چکی ہے لہٰذا اب اس نے اس کا ذکر بھی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

واقعات کی یہ تفصیل اس محلے کے ایک صاحب احمد کمال کی مرتب کردہ تھی ان کے کہنے کے مطابق یہ تفصیلات خود سوکھا نے انہیں بتائی تھیں۔

سوکھا کی آمد کے چھ مہینے بعد کمال صاحب اس محلے میں آئے تھے۔

احمد کمال صاحب نہایت جاذب نظر تھے۔ پچاس کے قریب عمر ہو چکی تھی لیکن چالیس سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ درمیانہ قد' چوڑی چھاتی جو ہمیشہ آگے کی طرف نکلی رہتی تھی۔ تیکھے نقوش اور آنکھیں ایسی جیسے کسی کو بلا رہی ہوں آنکھوں کے نیچے کچھ رگیں اس طرح ابھری ہوئی تھیں کہ ہر وقت مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اس کے باوجود چہرے پر ایسا رعب تھا کہ آنکھ ملا کر بات کرنا مشکل تھا بائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ کو مروڑتے رہنا ان کی عادت تھی جس سے ان کی بے چین طبیعت کا اظہار ہوتا تھا۔ عورتوں کے لئے ان کے چہرے پر ایک خاص کشش تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی عورت کو بھرپور نگاہ سے دیکھیں اور وہ ان کی گرویدہ نہ ہو جائے۔ رنگین مزاج تھے اور باتیں ایسی خوبصورت کرتے تھے کہ سڑک پر مجمع لگا لیں راہ چلتے ہر ایک

کی خیریت پوچھنا' فقرے کسنا' چھیڑ چھاڑ کرنا ان کی عادت میں شامل تھا۔ لہٰذا اس محلے میں آتے ہی ' وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

"کمال صاحب' پان" رشید پان والا کہتا۔

"نہیں میری جان" وہ قافیہ ملاتے۔ رشید دانت نکال کر ہنستا۔

"کمال صاحب' سبجی لے جاؤ" گامو سبزی والا آواز لگاتا۔

"ابے ہماری عمر ابھی دودھ پینے کی ہے' تو ہمیں سبزی پہ لگا رہا ہے" کمال صاحب کہتے اور بازار میں قہقہہ پڑ جاتا۔ فقروں کی بارش میں وہ گھر سے نکلتے اور قہقہوں کے ہجوم میں گھر لوٹ آتے۔

کمال صاحب کے مزاج میں ملنساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دراصل وہ اپنی دلچسپ باتوں کے ہتھیار سے لوگوں کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ان کے احساس برتری کو تسکین ملتی تھی اگر کوئی ان سے بے رخی اختیار کرتا تو وہ اسے شکست سمجھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ البتہ تڑپنے کے یہ مواقع ان کی زندگی میں بہت کم آئے تھے اس لئے کہ ان کی سحرزدہ شخصیت کسی کو اس قابل چھوڑتی ہی نہیں تھی کہ وہ ان سے بے رخی اختیار کرے۔

اس محلے میں آتے ہی انہوں نے اپنا سکہ جما لیا تھا البتہ سوکھا پر ان کا جادو نہیں چل سکا۔ بہت دن تک تو انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی لیکن جب اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں انہوں نے سنیں تو ان کے جذبہ تجسّس نے سر ابھارا اور جب سوکھا نے انہیں اہمیت نہیں دی تو یہ جذبہ ضد میں تبدیل ہو گیا۔ اب انہوں نے محلے بھر کا پیچھا چھوڑ کر سوکھا کا دامن تھام لیا۔

کچھ دن تو سوکھا ٹس سے مس نہ ہوا لیکن آخر کار احمد کمال کے ہتھیاروں کے سامنے اسے مغلوب ہونا ہی پڑا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور چند ہفتوں کی محنت کے بعد احمد کمال اس کی زندگی کے کئی اہم رازوں سے واقف ہو گئے لیکن اس سراغ رسانی میں خود ان کے ہی کئی راز آشکار ہو گئے جس کا احساس انہیں ذرا بعد میں ہوا۔

احمد کمال کی فطرت میں قدرتی جلد بازی تھی' پیٹ کے ہلکے تھے ' کوئی بات چھپانا جانتے ہی نہیں تھے اور یہ تو ان کی عظیم فتح کی کہانی تھی۔ انہوں نے قلعہ فتح کیا تھا۔

انہوں نے اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر سوکھا کی کہانی محلے بھر میں نشر دی مگر جب پورے محلے میں زبیدہ زبیدہ' کی دھوم مچ گئی اور بچے بالے زبیدہ کا نام لے کر سوکھا کو چھیڑنے لگے تو اچانک احمد کمال کو جیسے عقل آگئی "ارے' میرے گھر میں بھی تو ایک زبیدہ ہے' کہیں ...." اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے۔ انہیں صرف ایک اور تصدیق کرنی تھی جسے وہ بھول گئے تھے انہوں نے سوکھا سے یہ معلوم نہیں کیا تھا کہ وہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے۔

وہ دفتر سے لوٹے تو سیدھے سوکھا کی کٹیا میں جا گھسے۔ سوکھا لوہے کے ٹرنک پر جھکا ہوا نہ جانے کیا الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے گھبرا کر کمال کی طرف دیکھا۔ کمال سے اب وہ مانوس ہو چکا تھا اس لئے اس کا یوں چلے آنا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی اس نے ٹرنک کو ایک طرف کھسکا کر کمال کے لئے جگہ خالی کر دی کمال کو باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس نے اچانک سوال کرنے کے بجائے سوکھا کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھائے رکھا پھر اچانک سوال کردیا " سوکھا تمہارے گاؤں ل کا نام کیا ہے؟ بھئی دوستوں کو دوستوں کے ٹھکانے کا علم ہونا ہی چاہئے نا۔

"اب تو مجھے یاد بھی نہیں ! میں کہا سے آیا تھا" سوکھا نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"نہیں سوکھا' تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ بھلا کوئی اپنا وطن بھی بھولتا ہے"

"بھولا نہیں ہوں مگر یاد کرنے سے بھی کیا حاصل "

" تمہیں نہ ہو' مگر مجھے تو دلچسپی ہے۔ شاباش ' اب جلدی سے بتا دو"

سوکھا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا جیسے وہ اپنے دل کے ٹرنک میں کچھ الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا احمد کمال دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ خدا کرے وہ کسی اور گاؤں کانام لے دے' وہ کسی اور گاؤں کا ہو۔

سوکھا ابھی تک چپ تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی کئی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں جیسے تصور ہی تصور میں یادوں کی تلخیاں اس کا حلق تر کر رہی ہوں اس کی آنکھوں سے پھوار برسنے لگی۔ ظاہر ہے اب وہ اس قابل نہیں تھا کہ لب ہلا سکے۔

احمد کمال کو اس کے گاؤں سے دلچسپی نہیں تھی' وہ تو اپنے اندازے کو غلط ثابت کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا اس نے اپنے سوال کو دوسرے ڈھنگ سے پیش کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ' تم گلاب پور کے تو نہیں ؟''

''جب معلوم ہے تو پوچھتے کیوں ہو''

''کیا مطلب' تم گلاب پور کے ہو؟''

''ہاں''

''اور زبیدہ''

''وہی تو گلاب تھی وہاں کی''

احمد کمال میں اس سے آگے سننے کی تاب ہی نہیں تھی۔ سوکھا آنکھیں بند کئے باتیں کرتا رہا مگر کمال کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ وہاں سے خاموشی سے اٹھ آیا جیسے اسے ڈر ہو کہ سوکھا نے اس کی چوری پکڑ لی ہے اور ہوش آتے ہی نہ معلوم اس کا ردعمل کیا ہو۔ اسے محسوس ہوا جیسے سوکھا نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا ہو'جیسے وہ بھرے بازار میں ننگا ہو گیا ہو' جیسے اس نے خودکشی کرلی ہو' جیسے اسے کوڑھ ہو گیا ہو ' لوگ اس کے منہ پر تھوک رہے ہوں۔ ایسی حالت میں دیوانے بستی کی طرف نہیں دوڑتے جنگل کا رخ کرتے ہیں۔ احمد کمال بھی گھر جانے کے بجائے قریبی پارک میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ میں اترتا چلا گیا۔

سوکھا کی زندگی کے تاروں کو چھیڑتے چھیڑتے وہ اپنی زندگی کے ساز کو توڑ بیٹھا تھا آج اسے احساس ہو رہا تھا۔ کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا کیوں گناہ عظیم ہے۔ خدا پردہ پوشی کو کیوں پسند کرتا ہے شاید اسی لئے کہ تمام پردے ایک ہی رسی پر ٹنگے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی ایک پردہ اٹھاؤ تو رسی کی تھرتھراہٹ سے دوسرا پردہ بھی گر جاتا ہے اور ممکن ہے اس دوسرے پردے کے پیچھے ہم خود ہوں' ہماری غلاظتیں ہوں' ہمارے راز ہوں' حقیقت کی وہ سنگینیاں ہوں جنہیں برداشت کرنے کا حوصلہ ہی ہم میں نہ ہو احمد کمال ایسے ہی حادثے سے دوچار ہو گیا تھا اس کے گھر میں بھی ایک زبیدہ تھی ' وہ بھی گلاب پور کی تھی۔ شادی سے پہلے' زبیدہ کے ساتھ اس نے ایک اور آدمی کا نام سنا تھا ۔ ارے ہاں' یاد آیا وہ سوکھا ہی تو تھا وہ اس وقت اسپتال میں تھا زبیدہ کو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ مرگیا ہے اب وہ پھر زندہ ہو گیاہے وہ اپنی زبیدہ کو واپس لینے آیا ہے جو موت سے زندگی چھین سکتا ہے ' وہ مجھ سے زبیدہ کیوں نہیں چھین سکتا اچانک سوکھا' اپنی لال

لال آنکھیں لئے اس کے سامنے آکھڑا ہوا زبیدہ دور کھڑی قہقہے لگا رہی تھی یہ کیا' سوکھا نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا احمد کمال بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ زبیدہ کے قہقہے اس کا پیچھا کر رہے تھے اس نے پارک کے دروازے پر پہنچ کر پلٹ کر دیکھا پارک خالی پڑا تھا۔ نہ وہاں سوکھا تھا' نہ زبیدہ یہ اس کا وہم تھا اس نے پیشانی پر ابھرنے والے پسینے کے قطروں کو صاف کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ سوکھا اپنی پناہ گاہ میں ٹین کا صندوق کھولے بیٹھا تھا سڑک پر سناٹا تھا!

زبیدہ نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر اس کا استقبال کیا احمد کمال گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا زبیدہ کے دو دانت اس کے دہانے سے نکل کر ٹھوڑی تک آ گئے تھے آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں" زبیدہ نے اس کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"کک .... کک ....کچھ نہیں" احمد کمال نے بمشکل کہا اور بہ غور زبیدہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پھر اپنی جگہ آ گیا تھا۔ وہی غزالی آنکھیں یاقوتی لب !

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے' احمد کمال نے دل میں سوچا اور ہمت کر کے گھر میں داخل ہو گیا۔

"آج آپ کو کیا ہو گیا ہے ' طبعیت تو ٹھیک ہے؟" زبیدہ نے پھر پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں' ایک پاگل پیچھے لگ گیا تھا' اس سے ذرا خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"ہائے اللہ ' پاگل ! کون تھا وہ؟"

"تھا ایک تم بھی جانتی ہو اسے"

"میں جانتی ہوں میں کیوں جاننے لگی تھی کسی پاگل کو"

"جھوٹی"

"جی"

"کچھ نہیں"

احمد کمال بستر پر دراز ہو گیا۔ زبیدہ سلائی مشین پر جھکی کچھ سی رہی تھی۔

"مکار، فریبی" احمد کمال کے کانوں میں زبیدہ کی آواز سنائی۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا"

"یہ آج آپ کو کیا ہو گیا میں سلائی میں مصروف ہوں، آپ آنکھیں بند کئے پڑے ہیں، میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔" زبیدہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

وہی قہقہے جو اس نے پارک میں سنے تھے، بالکل وہی، دل کے پار اترجانے والے۔

ایک تو تم ہنستی بہت ہو" احمد کمال نے سختی سے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ زبیدہ نے اسے حیرانی سے دیکھا اور دوبارہ سلائی میں مصروف ہو گئی۔

احمد کمال جلد سے جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا مگر اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح وہ سوچ رہا ہے۔ کیا واقعی یہ وہی سوکھا ہے اس نے کڑیاں ملانی شروع کیں اور خیالوں ہی خیالوں میں اس مقام تک پہنچ گیا جہاں زبیدہ اس سے ملی تھی۔

پانچ سال پہلے وہ گلاب پور گیا تھا ۔ گلاب پور میں سرکاری ڈسپنسری کی عمارت تعمیر ہوی تھی جس کے معائنے کے لئے دفتر والوں نے اسے بھیجا تھا گویاوہ سرکاری دورے پر تھا گلاب پور چند خاندانوں پر مشتمل چھوٹا سا ایک گاؤں تھا، ہرا ابھرا خوبصورت گاؤں، خوشحال گاؤں۔

احمد کمال کی سرکاری جیپ ، کھیتوں کے درمیان ہوتی ہوئی ،وڈیرے کے مکان کے سامنے رک گئی۔ پورا گاؤں اس کے استقبال کے لئے موجود تھا وہ سب اس طرح اس کے آگے پیچھے ہو رہے تھے جیسے احمد کمال ہی نے ان کے لئے ہسپتال بنایا ہو۔

"کمال صاحب، معائنے پر تو آپ جاتے ہی رہیں گے، پہلے کچھ دن ہمارے ڈیرے پر رہیں، ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

"ارے نہیں صاحب، میں تو صرف ایک دن کے لئے آیا ہوں۔ آج ایک نظر عمارت کو دیکھوں گا اور کل چلا جاؤں گا۔" کمال نے وڈیرے سے کہا۔

"واہ سائیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے اس گاؤں میں ایسا پہلے کبھی ہوا ہی نہیں"

"سرکاری معاملہ ہے، مجھے کل رپورٹ کرنی ہوگی۔" احمد کمال نے پھر کہا۔

"سرکار کو ہم دیکھ لیں گے' آپ آرام کریں' کل دیکھا جائے گا۔"

احمد کمال کو اس کی ضد کے آگے مجبور ہونا پڑا اس نے سوچا چلو ایک ہی دن تو بیچ میں ہے' معائنے پر کل چلا جائے گا۔

دوسرے دن تاروں کی چھاؤں میں' وڈیرے کے آدمیوں نے اسے بیدار کر دیا" وڈیرا سائیں آپ کو بلاتا ہے"

کمال آج تک اتنی صبح کبھی بیدار نہیں ہوا تھا مگر تازہ ہوا' اندھیرے میں چھپتا ہوا اجالا جیسے کوئی حسینہ نقاب کے پیچھے سے جھانک رہی ہو' اس کے لئے دلچسپ بھی تھا اور پر لطف بھی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد وڈیرے نے کہا "آیئے آپ کو گھما پھرا لائیں"

"مگر وہ ...."

"واپسی میں معائنہ کرتے آنا' اپنے اسپتال کا" وڈیرے نے قہقہ لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وڈیرے کی زمین بہت تھوڑی تھی' گھومنے کے لئے تھا ہی کیا مگر وہ ایسا باتونی آدمی تھا کہ ایک ایک انچ زمین کی صفات و خصوصیات بتاتا ہوا چلتا رہا' یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ کمال خود بہت باتونی تھا' وڈیرے کی اس بے تکلفی نے تو اسے شیر بنا دیا۔ دونوں بھول گئے کہ وقت گزرتا بھی ہے۔

"ارے چار بج گئے" وڈیرے نے کہا "چلئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہو گا .... باقی پھر گھومیں گے۔

"مگر مجھے تو معائنے پر جانا ہے' رپورٹ تیار کرنی ہے"

"چھوڑیئے کمال صاحب۔ آپ جیسا دلچسپ آدمی سرکاری نوکری پر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ تو ہمارے ساتھ رہیئے اور گھومیے۔

احمد کمال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' یا اللہ گھومنے کے علاوہ اس شخص کو کچھ اور آتا بھی ہے" اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا اس کے دل میں اس اندیشے نے بھی سر ابھارا تھا کہ کہیں وڈیرا مختلف بہانوں میں الجھا کر اسے معائنے سے روکنا تو نہیں چاہ رہا ہے۔ عمارت بنی بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایسی بہت سی کہانیاں سن چکا تھا۔ اس

نے طے کر لیا کہ آج کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی ڈیوٹی ضرور انجام دے گا۔

"کس سوچ میں پڑے ہوئے ہیں کمال صاحب؟" وڈیرے نے کھانے کے بعد دودھ کا ایک لمبا گلاس حلق میں اتارتے ہوئے پوچھا۔

کمال کو غصہ آ گیا' ایسے پوچھ رہا ہے جیسے خبر ہی نہیں "مجھے اجازت دیں' میں چلوں گا"

"کہاں؟"

"جس کام کے لئے سرکار نے مجھے گلاب پور بھیجا ہے"

"اچھا' وہ معائنے والی بات' سائیں' یہ کوئی وقت ہے' میں نے تو آپ کے لئے ناچ رنگ کا انتظام کیا ہے۔ ابھی وہ پہنچنے ہی والی ہو گی ہائے ' ظالم کیا گاتی ہے اور کیا تھرکتی ہے"

"ناچ رنگ تو رات کی بات ہے میں تو ابھی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

"گانے سے پہلے تیاریاں بھی تو ہوتی ہیں مطلب ہے کوئی بوتل' کوئی گلاس' لال پری' سفید پری۔"

مگر میں تو پیتا ہی نہیں "

"ارے اتنے خوبصورت آدمی ہو کر بھی' خیر ہمارا ساتھ تو دو گے' گھونٹ دو گھونٹ آخر مہمان ہو ہمارے "

مہمان کو ساتھ دینا پڑا۔ رقاصہ واقعی لاجواب تھی چہرہ مسکراہٹوں سے بھرا ہوا تھا اس کے اعضا رقص سے پہلے ہی رقص کر رہے تھے ایک تتلی تھی جو محو رقص تھی ایک شعلہ تھا جو گردش میں تھا۔

رات گئے یہ طوفان تھما اور احمد کمال کو بستر نصیب ہوا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے پھر خیال آیا کہ وہ اس گاؤں میں کیوں آیا ہے اس نے سوچا' کل چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اسپتال کی عمارت دیکھنے ضرور جائے گا۔

صبح وہ سو کر اٹھا تو دن چڑھ آیا تھا ابھی تک وڈیرے نے اسے بلوایا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سو کر ہی نہیں اٹھا موقع غنیمت ہے اسے بتائے بغیر ہی

روانہ ہو جانا چاہئے اس نے ایک ملازم کو ساتھ لیا اور عمارت دیکھنے چل دیا۔

اسے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ عمارت موجود ہے ورنہ وہ تو یہ سمجھنے لگا تھا کہ اسے میدان ناپ کر واپس آنا پڑے گا۔ کمال نے کمرے دیکھے' دیواریں جانچیں دروازوں کا جائزہ لیا' ضروری ناپ تول کی اور اطمینان کا سانس لیا۔

کام نمٹ چکا تھا' وہ گھر واپس جا سکتا تھا مگر اس کی مروت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وڈیرے کو خدا حافظ کہے بغیر وہ واپس چلا جائے وہ اس کی طرف سے دوستی کے جذبات محسوس کر رہا تھا اسے وہ وڈیرا روایتی وڈیروں سے مختلف نظر آیا تھا بہرحال اس نے فی الحال شہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وڈیرے سے ملنے چلنے آیا۔

"کہاں چلے گئے تھے سائیں' مجھ سے کہتے میں آپ کے ساتھ چلتا" وڈیرے نے اسے دیکھ کر کہا۔

"آپ سو رہے تھے' میں نے سوچا میں خود ہی ہو آؤں"

"چلو اچھا ہوا"۔ وڈیرے نے یوں کہا جیسے پاپ کٹا۔

"اچھا' اب مجھے اجازت دیجئے۔" احمد کمال نے کہا۔

"اجازت کیسی' اب کہیں جا کر تو آپ کو فرصت ملی ہے"

وڈیرے نے اس طرح کہا کہ جیسے کمال کوئی قیدی ہو اور فرار کی اجازت مانگ رہا ہو۔

"نہیں' اب مجھے جانا ہو گا' میری بیوی انتظار کر رہی ہو گی' پھر دفتر کو بھی رپورٹ کرنی ہے"

بس ایک دن مجھے خدمت کا موقع دے دیں کل بھلے چلے جائیے گا" وڈیرے نے بچوں کی طرح ضد کی۔

معمولی سی نوک جھونک کے بعد احمد کمال کو اس کی بات ماننا پڑی اور وہ رک گیا۔

اس رات وڈیرہ شغل میں مصروف تھا' کمال اس کا ساتھ دے رہا تھا' کمال کی دلچسپ باتوں پر وڈیرے کا وجود لہریں لے رہا تھا کہ بادل اس زور سے گرجے' گلاس بج اٹھے۔

پینے کا مزہ تو اب آئے گا" وڈیرا چلایا۔

"شرابی کی دعا قبول ہوئی' پینے کا مزہ آنے لگا' بارش شروع ہو گئی۔ کمال نے خوف زدہ ہو کر وڈیرے کی طرف دیکھا یہ آدمی ہے کہ کیا ہے اس نے مجھے روکنا چاہا روک لیا اب کہا' رات کو رک جاؤ جیسے اسے معلوم تھا کہ رات کو بارش ہوجائے گی۔

کمال کو معلوم تھا کہ دیہات میں بارش ہونے کے معنی کیا ہیں پھر بھی اس سے تہیہ کر لیا تھا کہ بارش رکتے ہی روانہ ہوجائے گا لیکن بارش رکتی' جب تا دوسرے دن رات تک ایک ہی رفتار سے بارش ہوتی رہی کئی کچے گھر بارش کی نذر ہو گئے۔

بارش کا زور کچھ ہی کم ہوا تھا کہ رات کے سناٹے میں اتنا شور بلند ہوا جیسے قیامت آگئی ہو کمال اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا تھا' وڈیرا سو چکا تھا۔

صبح تک گاؤں میں جو کچھ ہوتا رہا' کمال اس نے بے خبر تھا وہ صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ کچھ گھر بہہ گئے ہوں گے صبح ہوتے ہی اس کا اندازہ درست ثابت ہوا اس کے اندازے سے زیادہ نقصان ہوا رات کو کسی وقت' گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کا پانی پشتا توڑ کر گاؤں میں داخل ہوا اور کئی مکانات بہا کر لے گیا۔

اگر گاؤں کے لوگ جاگ نہ رہے ہوتے اور بروقت کاروائی نہ کرتے تو جانے کیا ہو جاتا۔

"سائیں' آپ کا اسپتال اس وقت بہت کام آیا غریبوں کے گھر بہہ گئے' میں نے ان سب کو اسپتال میں ٹھہرا دیا ہے دورے پر تو اب چلیں گے' مزہ تو اب آئے گا سب رعایا وہاں ہو گی آپ کے نام کے نعرے لگیں گے" وڈیرے نے دانت نکالے"

احمد کمال نے بھی سوچا' بارش کے بعد عمارت کا جائزہ لینا چاہئے اس سے عمارت کی مضبوطی کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا عین وقت پر وڈیرا کسی اور کام میں مصروف ہو گیا اور کمال کو اکیلے جانا پڑا۔

وہ اسپتال پہنچا تو وہاں موجود' عورتوں اور مردوں نے اس کو اس طرح گھیر لیا جیسے وہ کوئی بہت اہم شخصیت ہو وہ سب اپنے اپنے مسائل بیان کر رہے تھے اور اس بات پر اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اس نے یہ عمارت بنوا کر ان پر احسان کیا کہ اگر یہ عمارت نہ ہوتی تو وہ اس وقت کہاں سر چھپاتے وہ انہیں تسلیاں دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا

کہ اسے عورتوں کے درمیان ایک سرخ رنگ کی گٹھڑی پڑی ہوئی نظر آئی۔

"یہ گٹھڑی تھوڑی ہے بابو جی' یہ تو جبیدہ ہے" ایک دیہاتی نے کہا۔

"ہاں' وہی وہی"

گٹھری میں حرکت پیدا ہوئی۔ اب وہ بیر بہوٹی معلوم ہو رہی تھی۔ سرخ گہری سرخ' سر سے پاؤں تک سرخ اس کی نازک جلد کے پیچھے سرخ لہو صاف جھلک رہا تھا کمال کو یوں معلوم ہوا کہ جیسے وہ کسی زعفران کے کھیت میں نکل آیا ہے جہاں زرد پھولوں کے ساتھ ساتھ گلاب کے پھول بھی کھلے ہوئے ہیں۔

"بابو جی کو سلام کر" اس کے کسی بڑے نے کہا۔

بیر بہوٹی نے ہاتھ جوڑ لئے۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی جیسے قیامت جوان ہو گئی ہو پھولوں سے لدی شاخ کی طرح وہ کمال احمد کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شرارت کے ڈورے جال بن رہے تھے اس کے رخسار کا تل باتیں کر رہا تھا کمال کو پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی وقتی دکھ نے اداس کر دیا ہے ورنہ وہ ہے بڑی شوخ۔

شوخی' کمال احمد کی کمزوری تھی اور یہاں تو حسن بھی اپنی آخری حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ "گاؤں کی مٹی سے بھی ایسے مجسمے تراشے جاسکتے ہیں" زبیدہ' مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ میں وڈیرے کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ شام کو مجھ سے ملنا' میں جیپ بھیج دوں گا"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' ایک نوجوان بول پڑا' "آپ نے وڈیرے سے پوچھ لیا ہے؟"

"کیا مطلب"

"مطلب یہ کہ وڈیرے کے گھر گاؤں کی کوئی عورت داخل نہیں ہو سکتی۔ اسے عورتوں سے نفرت ہے۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہیں کی۔"

احمد کمال کو یاد آیا کہ واقعی اس نے اب تک اس حویلی میں اس رقاصہ کے علاوہ کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔ یہ انکشاف اس کے لئے مزید حیرتناک تھا۔ یہ وڈیرا مسلسل دوسروں سے مختلف ثابت ہو رہا تھا۔

"اچھا' میں دفتر میں چلتا ہوں' وہاں آ جاؤ"

دفتر کیا تھا' ٹھیکے دار نے ایک کمرے میں ایک میز بچھا کر دو تین کرسیاں ڈال دی تھیں۔

بارش تھم چکی تھی مگر آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں ہوا کے زور سے' درختوں سے اتر کر ادھر ادھر پھیل رہی تھیں احمد کمال مختلف برآمدوں سے ہوتا ہوا اپنے دفتر میں پہنچ گیا اور زبیدہ کا انتظار کرنے لگا۔

وہ شادی شدہ تھا لیکن زبیدہ کو دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ اس نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے زبیدہ کو اسی لئے تنہائی میں بلایا تھا کہ وہ اسے جانچ تول سکے اسے اپنے چہرے پر پھیلی ہوئی بے پناہ کشش کا احساس تھا' اسے معلوم تھا کہ وہ جس عورت کی طرف بھرپور نگاہ سے دیکھ لے وہ اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے وہ زبیدہ کو اپنا گرویدہ کرنا چاہتا تھا' اسے اپنے وجود کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ آج اس کا امتحان تھا چند لمحوں میں وہ اتنے بڑے فیصلے کر لے گا اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"میں آ گئی ہوں' بابو جی" ایک مہین آواز کمرے میں گونجی۔

"آں' آؤ' بیٹھو۔ ادھر بیٹھ جاؤ" کمال نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی "ہاں' اب بتاؤ کیا بات ہے" زبیدہ نے سادگی سے پوچھا۔

"کمال نے محسوس کیا کہ وہ بہت معصوم ہے۔ اس کے لہجے میں وہ حیا نہیں ہے جو ایک مرد کی موجودگی میں کسی لڑکی کے لہجے میں جھلکتی ہے' اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ زبیدہ کا دل بہت صاف ہے وہ مجھے مرد نہیں صرف بابو جی سمجھ رہی ہے' صرف بابو جی۔

کمال نے دوسری کرسی پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وہ کچھ دیر کمال کو بے غرض آنکھوں سے تکتی رہی پھر شاید وہ اس چبھن کی تاب نہ لا سکی' اس کی پلکیں جھک گئیں' "اس کا مطلب ہے' آنکھوں نے پیغام پہنچا دیا" احمد کمال نے سوچا۔

"تم نے کیا کہنے کو بلایا تھا" زبیدہ نے خاموشی میں کنکر پھینکا۔

"یہی کہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے' تعبیر دکھا دو"

"دیکھو بابو' ٹیڑھی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں' ہم سے سیدھی بات کرو دو ٹوک۔"

کمال کو احساس ہوا' واقعی وہ ٹیڑھی بات کر گیا ہے "سیدھی بات یہ ہے کہ تم مجھے اچھی لگی ہوئی ہو' میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے"

"اچھا فیصلہ اپنے پاس رکھ" وہ ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھ گئی۔

"اچھا ہوا میرا سوکھا یہاں نہیں ہے ورنہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ کل کے سیلاب میں زخمی ہو گیا تھا۔ اسے سرکاری گاڑی شہر کے اسپتال میں لے گئی ہے اس سے پہلے کہ وہ آ جائے' تم یہاں سے چلے جاؤ" زبیدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

یہ پہلا موقع ہے کہ ایک معمولی سی لڑکی نے یوں اس کی آنکھوں کے جادو کو ٹھکرا دیا تھا۔ مگر یہ سوکھا کون ہے شاید اس کا محبوب یا شاید ....

کمال کا یہاں کوئی بھی نہیں تھا جو اس کی مدد کر سکتا' ایک وڈیرا تھا جو اس وقت اس کے کام آ سکتا تھا۔ وہ دفتر سے نکلا اور وڈیرے کی طرف چل دیا۔

"آ گئے دورہ کر کے۔ بڑی دیر لگا دی میں سمجھ رہا تھا' دیر ہو جائے گی بڑی رونق ہو گی ادھر زبیدہ کو دیکھ کر کون جلدی آ سکتا ہے۔"

کمال کو یوں لگا جیسے وڈیرا' جادوگر ہے' دلوں میں جھانک لیتا ہے۔

"بولو' ہوئی تھی نا زبیدہ سے ملاقات"

"ہاں ہوئی تھی"

"پھر"

اور پھر احمد کمال نے اپنے خواب بیان کرنے شروع کر دیئے وڈیرے کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ سوکھا اور زبیدہ کی محبت سے بچہ بچہ واقف ہے اور جب تک سوکھا درمیان میں ہے' زبیدہ کو کوئی نہیں اپنا سکتا۔ وڈیرے ہی نے سازش تیار کی کہ سوکھا کی موت کی جھوٹی خبر اڑا دی جائے' پھر زبیدہ کو توڑنا آسان ہو جائے گا۔ زبیدہ کی کمزوری اس کی سوتیلی ماں ہے جسے دولت سے خریدا جا سکتا ہے۔

تمام باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد وڈیرے نے کہا "سائیں ' آپ مجھے اتنا پسند آئے ہو کہ آپ کی کوئی بات میں ٹھکرا نہیں سکتا۔ ابھی آپ شہر چلے جاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد آ کر زبیدہ کو لے جانا۔ وڈیرے کا حکم یہاں کوئی نہیں ٹال سکتا"

"ایک ہفتے بعد" کمال نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں' اس بے چاری کو سوکھا کا غم مٹانے کے لئے ایک ہفتہ تو دینا ہی پڑے گا۔ جب تک میں اس کی سوتیلی ماں کو اس کے گھر کی مرمت کے لئے پیسے بھی دے چکا ہوں گا اور پھر زبیدہ کے عاشق کا بھی تو کچھ انتظام کرنا ہے"

"مارنا مت بے چارے کو"

"نہ سائیں 'بس پاگل خانے چلا جائے گا وہ۔"



ایک ہفتے بعد احمد کمال پھر وڈیرے کے گھر میں داخل ہوا۔

"زبیدہ تیار ہو گئی ہے" کل تمہارا نکاح اسی حویلی میں ہو جائے گا" وڈیرے نے کہا۔

وڈیرے نے نہ معلوم کیا جادو کیا تھا کہ زبیدہ نہ صرف تیار تھی بلکہ خوش بھی تھی۔

دوسرے دن چند لوگوں کی موجودگی میں ان کا نکاح ہو گیا اور وہ زبیدہ کو لے کر شہر آ گیا۔

اس نکاح کو پہلی بیوی سے چھپانے کے لئے احمد کمال نے اپنا تبادلہ دوسرے شہر میں کرالیا۔ اب پانچ سال بعد وہ اس شہر میں آیا تھا اور دوسری بیوی سے الگ گھر لے کر رہ رہا تھا کہ سوکھا پھر درمیان میں آ گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا' کمال آنکھیں بند کئے ہوئے ماضی کی ورق گردانی کر رہا تھا آخری ورق تک پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ کو کچھ معلوم ہو' اسے یہ محلہ یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے اس کے اندر کسی نے چیخ

کر کہا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ آج آپ کو کیا ہوا ہے۔ کتنی مرتبہ میں کمرے میں گئی' آپ تو بالکل بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔" زبیدہ نے اسے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"احمد کمال نے اس کی طرف اجنبیت سے دیکھا اور گھر سے نکل گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ آج ہی کسی دوسرے گھر کا بندوبست کرنا ہے۔

رات گئے وہ مختلف دوستوں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا اتنی جلدی گھر کا انتظام تو کیا ہوتا ہاں اتنا ہوا کہ ایک دوست نے اسے پیشکش کر دی کہ وہ جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا وہ اس کے گھر میں آ کر رہ سکتا ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی بہت ہوتا ہے احمد کمال بہل گیا۔

رات کے دو بج رہ تھے لیکن اس وقت بھی اس میں گھر جانے کی ہمت نہ تھی اسے ڈر تھا کہیں زبیدہ اس کی چوری نہ پکڑ لے' کہیں سوکھا اس سے مل نہ چکا ہو۔ پھر یہ سوچ کر اس کی ہمت بندھ گئی کہ اب تک تو زبیدہ سو چکی ہو گی بس صبح تک کی ہی تو بات ہے اور وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر کے قریب پہنچ کر اس کا دل زور سے دھڑکا جیسے دور کہیں بادل گرجے ہوں' جیسے زبیدہ کے گاؤں میں آج پھر بارش ہوئی ہو سڑک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی دور ایک سایہ سڑک پر ٹہلتا ہوا نظر آیا "سوکھا" احمد کمال نے زیر لب کہا پھر نہ جانے کیا ہوا' اس کا پاؤں خود بخود ایکسیلریٹر پر چلا آیا زور کا دھماکہ ہوا' سایہ اچھل کر دور چلا گیا۔ گاڑی ذرا دیر لہرائی اور پھر سنبھل گئی۔ اب رکنا خطرناک تھا احمد کمال کسی اور طرف نکل گیا۔

رات کسی دوست کے گھر گزارنے کے بعد صبح پھر وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رشید پان والے نے اسے راستے ہی میں روک لیا "کمال صاحب' آپ کہاں تھے رات؟"

"تمہیں تو معلوم ہی ہے میری ایک بیوی اور ہے۔ اس کی طبعیت خراب تھی' بس وہیں رک گیا تھا کیوں خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت کہاں صاحب' اپنے سوکھا میاں کو رات کوئی گاڑی والا ٹکر مار گیا۔"

"ارے"

"ہاں صاحب' پرخچے اڑ گئے بے چارے کے"

"مر گیا"

"اور کیا صاحب' لاش آپ کے گھر میں رکھی ہوئی ہے' دیکھ لو جا کر"

"میرے گھر میں"

"سب سے پہلے آپ کی بیوی ہی گھر سے نکلی تھی اسی نے شور کر کے سب کو اکٹھا کیا ورنہ سب تو سوئے پڑے تھے صاحب' بڑا نیک کام کیا ہے اس وقت آپ کی بیوی نے۔"

احمد کمال نے گاڑی وہیں کھڑی کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا پورا محلّہ اس کے گھر کے سامنے موجود تھا ہر ایک نے اسے وہی کہانی سنائی جو رشید پان والا اسے سنا چکا تھا۔ اس نے انجان بن کر سب کی باتیں سنیں اور گھر میں چلا گیا۔ آنگن میں سوکھا کی لاش رکھی ہوئی تھی' محلے کی چند بوڑھی عورتیں لاش کے قریب بیٹھی تھیں۔

کمال نے اشارے سے زبیدہ کو بلایا اور اپنے کمرے میں لے گیا "یہ سب کیا ہے زبیدہ؟"

"دیکھتے نہیں سوکھا مر گیا ہے"

"وہ تو ہے مگر تم اسے یہاں کیوں لے آئیں؟"

"میرے ہاتھ اس کی لاش ہی لگی' میں لے آئی"

"خواہ مخواہ کسی مصیبت میں ہم نہ پھنس جائیں"

"مصیبت!" زبیدہ نے حقارت سے کہا "تم تو اسے کئی سال پہلے مار چکے تھے۔ وہ زندہ بچ گیا' تم نے پھر مار دیا۔ مصیبت میں پھنسنا کیسا' تمہیں تو مصیبت سے چھٹکارا ملا ہے"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ تمہیں راہ چلتوں سے اتنی ہمدردی کب سے ہو گئی؟"

"وہ راہ چلتا نہیں تھا میرا سوکھا تھا"

"اچھا تو یہی وہ سوکھا تھا"

"اتنے انجان مت بنو' تم اس سے پوری طرح واقف تھے۔"

"مگر پھر بھی' اب تم شادی شدہ ہو"

"میں نے یہی سوچا تھا' میں نے اس محلے میں آ کر پہلے دن ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرا خالہ زاد بھائی تھا اور میں اس روپ میں اسے دیکھتی تھی لیکن تم نے اسے مار کر پھر سے اسے میرا محبوب بنا دیا ہے۔ یہ سوکھا کی نہیں' میرے محبوب کی لاش ہے جس پر میں بین کر رہی ہوں میرے ننگے ہاتھ' بکھرے بال کیا بتا رہے ہیں تمہیں غور سے دیکھو میرے محبوب کے قاتل کمال نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی وحشت نے کمال کو دہلا دیا۔

"پاگل مت بنو وہ تمہارا کچھ بھی ہو' میں اسے کیوں قتل کرنے لگا۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے"

"فکر مت کرو' کوئی کچھ نہیں سنے گا۔ میں اپنے سہاگ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ باہر جاؤ اپنے ہاتھوں سے میرے محبوب کو قبر میں اتار آؤ جب اتنا نوازا ہے تو یہ احسان اور کر دو۔"

احمد کمال اس طرح گھبرا کر کمرے سے نکلا کہ اگر کچھ اور دیر وہ وہاں ٹھہر گیا تو زبیدہ کی وحشت اسے جلا کر خاک کر دے گی۔

سوکھا کی لاش اسی طرح آنگن میں رکھی تھی۔ احمد کمال مطمئن تھا کہ جو کچھ بھی ہوا یہ کانٹا تو نکلا مگر اسے یہ دھڑکا بھی تھا کہ زبیدہ کو اس پر شک ہو گیا ہے "اونہہ! اس کے پاس ثبوت کیا ہے' محض اس کے کہنے کا یقین کون کرے گا" کمال نے کندھے اچکائے اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"سنا ہے سوکھا" کمال صاحب کی بیوی کے گاؤں کا تھا"

"جان پہچان بھی ہو گی پہلے سے"

کمال کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے مگر یہ دو فقرے اس کے کانوں تک پہنچ ہی گئے اسے اندازہ ہونے لگا کہ لوگ' اس موت کو کیا رنگ دے رہے ہیں۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا یہ کہانی خود ہی اس نے لوگوں تک پہنچائی تھی اور اب خود ہی اس کا شکار ہو رہا تھا۔

سوکھا جو اکیلا تھا' مرنے کے بعد اس کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ کمال کو محسوس

ہو رہا تھا جیسے وہ اکیلا رہ گیا ہے سب سوکھا کے ساتھ ہو گئے ہیں' حتیٰ کہ زبیدہ بھی!

سوکھا کو دفنانے کے بعد وہ محلے والوں کے ہمراہ لوٹ تو آیا لیکن زبیدہ کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اس نے گاڑی نکالی اور گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔

"بہت دن بعد وہ اپنی پہلی بیوی کے گھر گیا' اپنے بچوں سے ملا' اپنی گزشتہ زندگی پر غور کیا سوکھا جیت گیا تھا' زبیدہ کو وہ جیت کر بھی ہار چکا تھا مگر ابھی تقدیر کے پاس کچھ اور مہرے باقی تھے شکست کوئی اور رنگ دکھانے والی تھی۔

اس نے سوچا تھا اب وہ کئی دن تک زبیدہ کے پاس نہیں جائے گا مگر جوں جوں رات گزرتی گئی اسے زبیدہ کی تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ گھڑی نے رات کا ایک بجایا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ بھرے گھر کو سوتا چھوڑ کر اکیلا' سڑک پر نکل آیا

سرخ رنگ کی کار تیزی سے زبیدہ کاٹیج کی طرف دوڑ رہی تھی دور ایک سایہ نظر آیا۔ کمال کے پاؤں بریک تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ سایہ اچھل کر اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ دھماکہ ہوا' سایہ دور جا پڑا' مگر آج سرخ گاڑی فرار کا راستہ بھول کر وہیں رک گئی۔ سڑک پر ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ کمال گاڑی سے اترا اور لپک کر لاش کے قریب پہنچا۔

"زبیدہ تم! اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ زبیدہ کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر بیٹھ گیا "تم یہاں کیسے۔" آ گئیں؟"

"دیکھنے آئی تھی' سوکھا پر کیا گزری ہوگی جب اسی کار نے اسی طرح اسے کچلا ہوگا"

"یہ تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے"

"غلط فہمی نہیں۔ میں اس روز تمہیں دیکھنے چھت پر چڑھی تھی۔ تم آئے جو نہیں تھے رات گئے تک سوکھا بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا پھر تمہاری گاڑی آئی' میں خوش ہو گئی سوکھا تمہاری گاڑی سے بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگا مگر تم نے اسے مار دیا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا' آج میں نے ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ محلے بھر میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سوکھا جس زبیدہ کو ڈھونڈنے شہر آیا تھا وہ میں ہی ہوں کل سوکھا مر گیا' آج میں مر جاؤں گی' لوگ کڑیاں خود ملا لیں گے۔ کڑیاں نہ

بھی مل سکیں تو میں سوکھا سے تو مل ہی جاؤں گی" زبیدہ کی گردن ڈھلک گئی۔
کمال نے لاش کو سڑک پر چھوڑا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بھاگا مگر آج فرار کے تمام راستے بند تھے۔ لوگ جمع ہو چکے تھے۔



اندازے کی غلطی

موسم کیسا ہی خوش گوار ہو' خوشی کا خزانہ تو انسان کے اندر ہوتا ہے۔ دل کے طاقوں میں چراغ جل رہے ہوں تو باہر کا اندھیرا خود بخود روشن ہو جاتا ہے باہر دیوالی ہو مگر دل میں ارمانوں کی چتا جل رہی ہو تو کہاں کی دیوالی کیسی ہولی۔ بجھی ہوئی راکھ' ادھ جلی چنگاریوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

شہزاد رضا نے چابی گھمائی' ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر سے باہر نکل آیا جسے ضرورت ہوگی' خود دروازہ بند کر لے گا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اسے وہ لڑکی بھی نظر نہیں آئی جو اس کی گاڑی کو دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی تھی اور بعد میں ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

رات بھر تیز بارش ہوئی تھی اور اب آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ دور جا کر اسے ہیڈ لائٹس جلانی پڑ گئیں۔ سڑک کے دونوں جانب لگے ہوئے درخت ہوا کی تال پر رقص کر رہے تھے۔ یہ اس کا آئیڈل موسم تھا برسات میں وہ دیوانہ ہو جاتا تھا۔ وہ کل رات بھی دیوانہ ہو گیا تھا آسمان نے جونہی پاؤں میں پائل باندھی' بادل گرجے طبلے پر تھاپ پڑی' بارش کی چھم چھم اس کی سماعت میں رس گھولنے لگی۔ وہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ بھاگتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا۔ کھڑکی کا پٹ کھولتے ہی پھوار نے اس کا منہ دھلا دیا۔ شکریہ' بارش کی دیوی شکریہ! بارش اور بیماری کا زور ہمیشہ رات ہی میں کیوں ہوتا ہے' اس نے سوچا۔ بیماری تو خیر ٹھیک ہے۔ برائی تو برائی ہے' کسی وقت بھی آئے مگر بارش کا لطف تو دن میں ہوتا ہے۔ یہ موسم محسوس کرنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جوگن تو نظر نہیں آتی جو آسمان

پر بیٹھی کائنات کا منہ دھلا رہی ہوتی ہے لیکن نکھری ہوئی کائنات کا چہرہ تو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان بچوں کی خوشی تو دیکھی جا سکتی ہے جو اس بارش میں نہاتے ہیں۔ وہ شاعر نہیں تھا لیکن بارش شروع ہوتے ہی شاعر بن جاتا تھا۔

اس کی ماں جب تک زندہ تھی' برسات کی راتوں میں سوتی نہیں تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بارش شروع ہو جائے اور شہزاد سوتا رہ جائے۔ بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی وہ شہزاد کو جھنجوڑ کر اٹھا دیتی تھی۔ وہ اس طرح کھڑکی کی طرف بھاگتا تھا جس طرح آج بھاگا تھا اسے ماں یاد آ گئی اس نے بستر کی طرف دیکھا اس کی بیوی غزالہ موسم کی ہر کروٹ سے بے خبر سو رہی تھی۔== غم میں چاہے کوئی شریک نہ ہو لیکن خوشی میں کسی کو شامل کرنے کو ضرور دل چاہتا ہے۔ اکیلے ہی قہقہے یا تو پاگل لگاتے ہیں یا خود غرض جنگل میں صرف مور ناچ سکتے ہیں' انسان نہیں' بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ غزالہ کو اپنی خوشی میں شریک کر لے اسے اٹھائے' اسے بتائے کہ باہر بارش ہو رہی ہے اسے لے کر باہر لان میں نکل جائے لیکن وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ اس حرکت پر برا مان جائے گی' لڑنے بیٹھ جائے گی۔ اس کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا اور اس ایک سال میں اسے یہ ناخوشگوار تجربہ ہو چکا تھا کہ غزالہ کو ہر وہ چیز ناپسند ہے جو اسے پسند ہے وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی کو خوش رکھ کر خوش رہنا نہیں جانتیں بلکہ خوش رہنا جانتی ہی نہیں ہیں۔ جاہل عورتوں کی طرح پسند و ناپسند کے کچھ بت اس نے تراش لئے تھے ان بتوں کے قریب سے ہٹنا اسے گورا نہیں تھا اسے یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص خواہ اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو اس کی مرضی کے خلاف اسے کوئی کام کرنے پر مجبور کرے یا مجبور کرنے کی کوشش کرے اس معاملے میں وہ حد درجہ ضدی تھی۔ شہزاد کو یاد آیا کہ ایک دن اس نے اپنی پسند کا اظہار کرتے ہوئے غزالہ سے کہا تھا کہ مجھے گلابی رنگ بہت اچھا لگتا ہے تمہارے پاس اس رنگ کے کئی جوڑے ہیں' کیوں نہیں پہنتیں۔ اس نے جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا کہ گلابی رنگ اسے زہر لگتا ہے اس لئے پہننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کئی دن کے لڑائی جھگڑوں کے بعد اس نے پہن ضرور لیا تھا لیکن اتنی نفرت کے ساتھ جیسے کسی نے اس کی سات پشتوں کو قتل کر ڈالا ہو اور اب حکم دے رہا ہو کہ گلابی جوڑا پہنو۔ ضد کا یہ عالم کہ ایک مرتبہ گلابی

رنگ کے کپڑے پہن لئے تو جیسے دنیا میں سارے رنگ ختم ہو گئے ہوں اس رنگ کو اپنی وردی بنا لیا اس رنگ کے سوا جتنے کپڑے تھے وہ سب اس کے لئے بے کار ہو گئے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ بھائی دنیا میں اس رنگ کے علاوہ بھی رنگ ہیں جواب توقع کے مطابق ملا کہ آپ کو بھی چین نہیں ہے۔ اب یہ کپڑے پہن لئے تو بھی تکلیف ہے' آپ کو لڑنے کے لئے بہانے درکار ہیں۔

اس کی کوئی ایسی نفسیاتی مجبوری تھی کہ کسی کی مرضی پر چلنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی اس کی حکمران طبیعت کو یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر اس پر حکم چلائے وہ صرف ان کاموں کو شہزاد کی خدمت کہہ کر انجام دیتی تھی جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہوتے تھے شہزاد کو یاد آیا اس نے غزالہ کو ایک رات سوتے سے جگا لیا تھا یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس پر جو اس کا ردعمل ہوا تھا وہ حیرت کے لائق تھا اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا تھا خبردار' ! آئندہ مجھے سوتے سے مت اٹھانا یہ میرے مزاج کے خلاف ہے بتاؤ تو سہی۔ رات کو دو گھڑی آرام کے لئے لیٹو' اس وقت بھی چین نہیں' کہو ے کیا ہے؟"

اس طرح پوچھا جائے تو کون وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے لئے اٹھایا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد اس نے آئندہ کے لئے کان پکڑ لئے تھے لیکن کسی بے قرار جذبے کے تحت اس نے کل رات پھر سوئے ہوئے فتنے کو بیدار کر دیا تھا۔

"کیا قیامت آ گئی 'کیوں اٹھا رہے ہو؟"

"باہر جا کر نہا لو' مجھے کیوں پریشان کرتے ہو"

میں تمہیں نہانے کے لئے نہیں اٹھا رہا ہوں باہر چل کر بارش دیکھیں گے اور کافی پئیں گے۔

"کیا بچکانا شوق ہے' تمہیں' سونے دو مجھے" وہ کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔

صبح اٹھ کر وہ اپنے رویے پر معذرت کر سکتی تھی لیکن اسے تو کوئی شرمندگی تھی ہی نہیں اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر وہ رات کو اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے میری خوشی میں شامل ہو جاتی تو میرا کتنا دل بڑھ جاتا۔ اسے اگر ایک چیز پسند نہیں تو میری پسند کی خاطر قبول کر لیتی۔ اگر بیویاں اس بات کی خواہش کرتی ہیں کہ ان کے شوہر

انہیں خوش رکھیں تو انہیں شوہر کے مزاج کا خیال بھی تو رکھنا چاہئے کوئی کسی پر دولت لٹا سکتا ہے لیکن پیار نچھاور نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس سے خوش نہ ہو۔

اسے رات کی بارش دیکھ کر خیال آیا تھا کہ وہ صبح دفتر نہیں جائے گا۔ گھر پر رہ کر بارش کا لطف اٹھائے گا یا پھر غزالہ کو لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل جائے گا لیکن غزالہ نے اس کا سارا موڈ خاک میں ملا دیا تھا اسے معلوم تھا' غزالہ گھومنے پھرنے کی شوقین ہے وہ جھوٹے منہ بھی کہے گا تو وہ چلنے کو تیار ہو جائے گی لیکن پھر اس نے سوچا کہ جسے میری پسند کا خیال نہیں' میں اس کا دل کیوں رکھوں۔ ضد کا انجام یہی ہوتا ہے اس نے دفتر کے راستے کا آخری موڑ کاٹتے ہوئے سوچا۔

اس موسم میں وہ کبھی دفتر آتا بھی تھا تو اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن آج موسم کا نشہ بے اثر ہو کر رہ گیا تھا اس نے بے دلی سے گاڑی کو مقررہ جگہ پر پارک کیا اور دفتر کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کمرے پر لگی جنرل مینجر کی تختی کو حقارت سے دیکھا اور چپراسی کے سلام کو نظرانداز کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا عام طور پر وہ دفتر پہنچتے ہی اپنے سیکرٹری کو بلاتا تھا لیکن جس دن اس کا موڈ آف ہوتا تھا' اس دن کوئی اس کے کمرے میں نہیں آ سکتا تھا۔ کوئی کام ہوتا بھی تھا تو وہ خود کمرے سے باہر آ کر عملے کو ہدایات دے دیتا تھا یا سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھ کر خط وغیرہ لکھوا دیتا تھا یہ اس کی عادت ہی تھی۔ اس سے لوگ سمجھ بھی جاتے تھے کہ آج صاحب کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔

چپراسی نے دروازے پر ہی بھانپ لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے اس کی زبانی پورے دفتر تک یہ بات پھیل گئی تھی کہ صاحب آج گھر سے لڑ کر آئے ہیں۔

"آج کل صاحب کا موڈ کچھ زیادہ ہی آف نہیں رہنے لگا ہے؟" سیکرٹری کے پاس بیٹھے ہوئے ایک باریش بزرگ نے کہا۔

"میرے خیال میں کوئی گڑ بڑ ہے صاحب کو بیوی اچھی نہیں ملی' سیکرٹری نے خیال ظاہر کیا۔

"ایسی عورتیں جہنم کا ایندھن ہیں" باریش کلرک نے کہا "جس سے اس کا شوہر خوش نہیں' وہ بیوی جنت میں جا ہی نہیں سکتی"

"غلطی صاحب کی بھی تو ہو سکتی ہے سیکرٹری نے دبی فائل کو درست کرتے ہوئے بے توجہی سے کہا۔

"نعمان صاحب، میں تو یہ سمجھتا تھا کہ میری تنخواہ کم ہے اس لئے میری بیوی مجھ سے لڑتی ہے لیکن صاحب کے پاس کسی چیز کی کمی ہے پھر بھی ...." چپراسی نے کہا۔

بھائی، لڑائی کا تعلق تنخواہ سے نہیں ہوتا' مزاج سے ہوتا ہے بعض عورتیں ایسی ناشکری ہوتی ہیں کہ ان کے لئے سوٹ کے پہاڑ بھی کھڑے کر دو پھر بھی ان کے منہ بنے رہتے ہیں وہ اپنی عادت سے مجبور ہوتی ہیں بے چاریاں سونے کا نوالہ کھاتی ہیں لیکن اندر سے بہت غریب ہوتی ہیں تم نے دیکھا ہوگا' بعض عورتیں چٹنی روٹی کھاتی ہیں لیکن خوش رہتیں ہیں اپنے مرد کو طعنے دینے کے بجائے ان کی خدمت کرتی ہیں پھر لڑائی کیوں ہوگی"

"یار تم لوگ تو ہاتھ دھو کر عورتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ کیا مردوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔" سیکرٹری نے کہا۔

"قصور ہوتا ہے' کیوں نہیں ہوتا' یہی قصور کیا کم ہے کہ لڑائی کے باوجود وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتا رہتا ہے اس توقع پر کہ شاید اسے عقل آ جائے"

"یہ مال خرچ کرنے کی تم نے کیا رٹ لگا رکھی ہے"

"قرآن نے عورتوں پر مردوں کی فضیلت کا ایک ہی جواز یہی دیا ہے کہ وہ تم پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں" باریش کلرک نے کہا۔

"لیکن میرے بھائی' عدل کی تلقین بھی تو کی ہے" سیکرٹری نے کہا۔

"عدل صرف مادی چیزوں میں ہو سکتا ہے کوئی اپنی بیوی کو اچھا پہنا سکتا ہے' اچھا کھلا سکتا ہے لیکن اس کی طرف محبت سے دیکھے' یہ اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ عورت کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس سے کتنی محبت کی جائے"

"یار' تم مولویوں سے کوئی جیت نہیں سکتا"

"جب جواب نہیں بن پڑتا تو تم لوگ مولویوں کو برا بھلا کہہ کر غصہ اتار لیتے ہو۔"

"خیر ہمیں کیا' جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں لیکن شہزاد صاحب تو گھر کا غصہ یہاں اتارتے ہیں۔"

"یہی ہوتا ہے میرے بھائی۔ گھر کا سکون بڑی چیز ہوتی ہے"

جتنے منہ اتنی باتیں کچھ دیر تبصرے ہوتے رہے اور پھر تمام لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کے قریب' لنچ سے کچھ دیر پہلے شہزاد کو اس کے انٹرکام نے متوجہ کیا دوسری طرف اس کا سیکرٹری تھا۔

"سر' کچھ لڑکیاں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"میں آج کسی سے نہیں مل سکتا" بتا دو انہیں۔

"میں نے انہیں بتایا تھا مگر وہ بضد ہیں"

"کون ہیں اور کیا چاہتی ہیں؟"

"سر' کچھ چندے وغیرہ کامعاملہ ہے۔"

"ڈائریکٹر صاحب کے پاس بھیج دو۔ چندے کا مجھ سے کیا تعلق۔"

"وہ کہتی ہیں' آپ سے ملیں گی ڈائریکٹر صاحب سے شاید وہ مل چکی ہیں۔"

"اچھا بھیج دو" شہزاد نے مجبور ہو کر اجازت دے دی۔

دروازہ کھلا اور چار لڑکیاں یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"سر' ہم آپ کے پاس چندہ لینے حاضر ہوئے ہیں۔"

"کوئی کرکٹ میچ کھیلنے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ ! معاف کیجئے گا ہم اپنے منصوبے کا تعارف کرانا تو بھول ہی گئے" اس میں سے ایک لڑکی نے کہا۔

"دراصل ہم نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ پروگرام طے کئے ہیں جس کے لئے ظاہر ہے ہمیں رقم کی ضرورت ہے"۔

"معاملہ عورتوں کا ہے تو پھر آپ غلط جگہ پر آ گئی ہیں۔ میں خود مظلوم مردوں کے لئے کچھ منصوبے اپنی جیب میں لئے پھر رہا ہوں جس کے لئے عنقریب مجھے چندے کی ضرورت ہوگی۔"

"کیوں مذاق کرتے ہیں سر' آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی اگر عورتوں کی مظلومیت سے واقف نہ ہوں گے تو کیسے کام چلے گا۔"

"بائی دی وے کیا آپ بتا سکتی ہیں' یہ مظلوم عورتیں کہاں پائی جاتی ہیں اور ان پر کس قسم کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں"

"کیا آپ سنجیدہ ہیں سر۔ کیا آپ واقعی عورتوں کی مظلومیت کے قائل نہیں؟"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ اور آپ نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ میں عورتوں کی مظلومیت کا قائل نہیں۔"

"ہم اس موضوع پر آپ سے باقاعدہ بحث کرسکتے ہیں"

"کرنی بھی چاہئے کیوں کہ جو حقیقت نہیں ہوتی اسے حقیقت ثابت کرنے کے لئے بڑے ہوشیار وکیل کی ضرورت پڑتی ہے لیکن میں بحث کے موڈ میں نہیں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ جگہ بتا دیں جہاں یہ مظلوم عورتیں پائی جاتی ہیں۔ چار تو آپ بھی ہیں۔ آپ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی فہرست بھی گنوا سکتی ہیں وعدہ ہے کہ آپ کے بیانات صیغہ راز میں رہیں گے۔

"کمال ہے' آپ اپنے ملک کے دیہات کی عورتوں کے حالات سے واقف نہیں۔"

"اچھا! تو آپ بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں جس میں بہت سے بڑے گھروں کی عورتیں مبتلا ہیں دیہات کی عورتوں کی جان بخشو۔

وہ اپنے گھروں میں ' اپنے مردوں کے ساتھ خوش ہیں۔ مظلومیت کے چونچلے بڑے گھروں کے نخرے ہیں۔ ان سادہ عورتوں کو کچھ معلوم بھی نہیں کہ وہ مظلوم ہیں۔ دن بھر اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں' رات کو اپنے مردوں کی خدمت کرتی ہیں ان پر مہربانی کیجئے۔ ان کے نام پر اپنی دکانداری کیوں چمکاتی ہو بی بی"

"یہی شعور تو بیدار کرنا ہے انہیں بتانا ہے کہ صدیوں سے تمہارا استحصال ہو رہا ہے" لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے نہایت جوش میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا' ان غریب عورتوں پر رحم کھایئے اپنی بات کیجئے۔"

"شہروں میں کیا کم ہیں یہ داستانیں۔ ابھی کل پرسوں ہی کے اخباروں میں آپ

نے پڑا ہوگا کسی شوہر نے اپنی بیوی کو زندہ جلا دیا۔"

"یہ آپ کی دشمنی کا نتیجہ ہے ایسے قتل تو مردوں اور مردوں کے درمیان بھی ہوتے رہتے ہیں بلکہ انہی کے درمیان زیادہ ہوتے ہیں۔"

"کیا آپ اس بات کو بھی جھٹلا دیں گے کہ اچھی خاصی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی یہ مرد' دوسری شادی رچا لیتے ہیں۔"

"تو کون سا غضب کرتے ہیں۔ یہ مردوں کا شرعی حق ہے ہمارے مذہب نے اجازت دی ہے کہ چار شادیاں کر سکتے ہیں اب اگر کوئی اسے عورت کی مظلومیت سے تعبیر کرے تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔

"تو گویا آپ اس بات کو نہیں مانتے کہ عورت مظلوم ہے"

"قطعی نہیں مانتا۔ مظلوم کوئی بھی ہو سکتا ہے اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں۔"

"کمال ہے' آپ پڑھ لکھ کر بھی اتنے دقیانوسی ہیں۔ صدیوں سے عورتوں پر ظلم ہوتے چلے آ رہے ہیں اور آپ کو نظر ہی نہیں آتے۔ اس پر تعلیم کے دروازے بند کئے جاتے ہیں' اسے پردے میں گھونٹ کر رکھا جاتا ہے شادی سے پہلے بھائیوں کی جھڑکیاں سنتی ہے' شادی کے بعد شوہر کے غضب کا نشانہ بنتی ہے آپ ہیں کہ کسی بات کو مانتے ہی نہیں"۔

"محترمہ! عورت اتنے پردے میں ہے کہ آپ چار نوجوان' غیر لڑکیاں' پردے کے بغیر میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں اور غالباً" آپ پر تعلیم کے دروازے بھی بند نہیں ہوئے ہیں"

"آپ تو ذاتیات پر اترے آئے ہیں۔ ہم پر نہ سہی لیکن کہیں نہ کہیں ' ہم جیسی عورتوں پر ظلم ہو ضرور رہے ہیں۔"

"ظلم سے زیادہ پروپیگنڈا ہوا رہا ہے عورتوں کی مظلومیت کا سہارا لے کر چند فیشن ایبل عورتیں اپنے لئے اور زیادہ آزادی تلاش کر رہی ہیں اور بس!

"آپ ہمارے فلسفے سے اتفاق نہ کریں لیکن چندہ تو آپ کو دینا پڑے گا" اس لڑکی نے شوخی سے کہا جو بہت بول رہی تھی۔

"آپ لوگوں کو چندے کی اپیل کے بجائے اچھے رشتوں کی مہم شروع کرنی چاہئے۔ گھر گھر جا کر عورتوں کو بتانا چاہئے کہ وہ مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کے بجائے اپنے شوہروں کی مرضی پر چلنا سیکھیں۔ جدید تعلیم کے بہکاوے میں نہ آئیں۔ انہیں بتائیں کہ عورت کی پابندی ہی کا نام ان کی آزادی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مردوں کو عورت پر حاکم مقرر کیا گیا ہے لہٰذا وہ روک ٹوک تو کریں گے۔ عورتیں اگر اسے ظلم سمجھیں تو یہ ان کی کم عقلی ہے۔ مظلومیت کا یہ مقدمہ اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو ہماری عورتیں اتنی ہی آزاد ہو جائیں گی جتنی مغرب کی عورت ہے اور اب وہ عورت نہیں رہی"

"دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت کو غلام ہونا چاہئے"

"نہیں، فرماں بردار ہونا چاہئے۔ قانون پسند رعایا کی طرح گھر ایک سلطنت کی طرح ہوتا ہے اس کی رعایا کو اس کا قانون تسلیم کرنا چاہئے۔

"عورت کیا بے زبان گائے ہے، اس کی اپنی کوئی رائے نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں۔ ہر اچھی حکومت کو اچھے مشیروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مشورہ مان ہی لیا جائے جو اب وہ چونکہ مرد ہے اس لئے حتمی فیصلہ اس کا ہونا چاہئے پھر یہ بھی ہے کہ جسے آپ مشورہ دے رہی ہیں وہ آپ سے اتنا خوش تو ہو کہ آپ کے مشورے کو اہمیت دے مشورے افہام و تفہیم سے مانے جاتے ہیں، ضد اور جھگڑوں سے نہیں"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کا خوشی سے مطلب کیا ہے، کیا شوہر کا یہ فرض نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو خوش رکھے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر آتی ہے، آپ کے بچے پالتی ہے اور آپ کہتے ہیں، خوش ہی نہیں رکھتی۔ یہ ڈھکوسلے ہیں مردوں کے" وہ لڑکی ہار نہ ماننے والے انداز میں برابر بحث کئے جا رہی تھی۔

"جی، یہ بے چاری نام نہاد مظلوم عورتیں یہی تو سمجھتی رہتی ہیں کہ اماں، باوا نے میاں کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اب انہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرنا ہے جسے خوش رہنا ہو خود ہی خوش رہ لے بھئی، کھانا پکانے اور بچے پالنے کے لئے تو ملازمہ بھی رکھی جا سکتی ہے۔ بیوی کا مطلب ہے ایک ایسی عورت جو جذباتی سکون فراہم کرے۔

ہماری عورتوں کا عالم یہ ہے کہ وہ کپڑے سلواتی ہیں تقریبات میں پہننے کے لئے اور مسکراتی ہیں دکاندار کے سامنے۔ گھر میں دل نہیں لگتا' تقریبوں سے دل نہیں بھرتا اب اگر کوئی شکایت کرنے کی جسارت کر بیٹھے تو ظالم ہو گیا"۔

"آپ تو سر سے پاؤں تک جلے بیٹھے ہیں"۔

"میں نے اپنا بہت وقت آپ کو دے دیا۔ اب آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لئے چندہ میں ہرگز نہیں دے سکتا۔"

"آپ مظلوم عورتوں کے لئے نہ سہی' عورتوں کے لئے تو چندہ دیں"

"آپ نے جو پروگرام مجھے دیا ہے' اسے میں نے پڑا ہے اس کے مطابق ایک تو آپ عورتوں کا کلب قائم کریں گی تاکہ جو تھوڑا بہت وقت وہ گھر کو دے دیا کرتی تھیں ' اب اس سے بھی جائیں گی دوسرا پروگرام یہ ہے کہ آپ ایسا ادارہ بنائیں گی جو غریب عورتوں کے مقدمے مفت لڑے گا۔ یہ مقدمے ظاہر ہے شوہروں کے خلاف ہوں گے ظاہر ہے جو عورتیں غریب ہوں گی ان کے شوہر بھی غریب ہوں گے ان بے چاروں کے مقدمے کون لڑے گا۔"

اس لڑکی کو بے اختیار ہنسی آ گئی البتہ اس کے ساتھ آئی ہوئی دوسری لڑکیوں کے چہرے اب تک غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

اس تناؤ کے ماحول میں اچانک ایک خوشگوار جھونکا آیا۔ اس لڑکی نے ایک دم سے ماحول کو تبدیل کر دیا۔

"شہزاد رضا' تم اب تک ویسے کے ویسے ہی ہو' میں یہی دیکھنے کے لئے تم سے بحث کر رہی تھی کہ تم میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں لیکن توبہ کرو۔ مرد کبھی تبدیل ہوا ہے؟"

"کون؟ تم کہیں یاسمین تو نہیں ہو"

"شکر ہے' تم مجھے پہچانے تو"

"شک تو مجھے بھی ہو رہا تھا لیکن تم اتنی بدل گئی ہو کہ پہچاننا مشکل تھا"

"مگر تم نہیں بدلے۔ صورت بھی وہی' باتیں بھی وہی' میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی"

شہزاد رضا کو یاد آ رہا تھا کہ یاسمین اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور جہاں تک اسے یاد تھا وہ اسے پسند بھی کرنے لگی تھی۔ کالج کے بعد وہ یونیورسٹی میں چلی گئی تھی اور شہزاد بیرون ملک روانہ ہوگیا تھا وقت کے اس الٹ پھیر نے اسے اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ وہ کالج کے ساتھیوں کو یاد کرتا۔ بے خبری کی بھیڑ میں یاسمین کا چہرہ بھی گم ہو گیا تھا۔ آج اچانک وہ اس کے سامنے آ گئی تھی جب تک وہ کالج میں تھا' یاسمین اسے کبھی متاثر نہیں کر سکی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے لیکن آج وہ اسے اچھی لگ رہی تھی جیسے حال کے آئینے میں ماضی کا چہرہ حسین معلوم ہوتا ہے وہ یاسمین کے برابر اپنی بیوی غزالہ کو بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس کی شادی یاسمین سے ہو جاتی وہ غزالہ سے زیادہ خوبصورت نہ سہی لیکن ممکن ہے وہ اس کی ہم مزاج میں حکمرانی نہ ہوتی یا کیا خبر یہ بھی غزالہ سے مختلف نہ ہوتی۔ کیا خبر سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہوں۔

"مجھے زندہ دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے یا یہاں دیکھ کر؟" یاسمین نے شوخی سے پوچھا۔

نہیں' یاسمین ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں یہ حیرت ضرور ہو رہی ہے کہ کتنی اچانک ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں' آدمی زندہ ہو تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی ہے"

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے اور باقی لڑکیاں بے زاری سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً" وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر اس طرح چندہ مانگا گیا تو ہو چکا چندہ جمع۔

"اچھا بھئی یاسمین' تم یہاں بیٹھ کر ماضی کے اوراق کھنگالو' ہم کہیں اور جاکر چندہ مانگتے ہیں۔" لڑکیوں نے کہا۔

یاسمین اس طنز کو نظرانداز نہ کرسکی۔ لڑکیوں نے توجہ دلائی تو اسے خود احساس ہوا کہ اس نے اپنی توجہ کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا ہے۔ اس کی توجہ تو چندے کے حصول پر ہونی چاہئے تھی مگر وہ تو شہزاد رضا میں گم ہو گئی ہے۔

"تو پھر کتنا چندہ دے رہے ہیں آپ؟" یاسمین نے اپنے ذمے داریوں کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ چندہ نہیں دوں گا۔ میں تمہارے فلسفے ہی سے متفق نہیں"

"فلسفے سے اتفاق نہ کریں لیکن ہمیں خالی ہاتھ تو واپس نہ کریں۔"

"اس وقت تو انکار کر چکا' آپ پھر کسی وقت آئیں تو میں سوچ سکتا ہوں"

"ٹھیک ہے' میں دوبارہ آ جاؤں گی۔" یاسمین نے کہا اور کرسی سے اٹھ گئی۔

شہزاد کو محسوس ہوا جیسے یاسمین نے جان بوجھ کر "میں" پر زور دیا ہے۔ اس نے دوبارہ آنے کے "ہم" کا صیغہ استعمال نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے وہ آئندہ اکیلی آئے گی۔ یہ تین پریشانیاں اس کے ساتھ نہیں ہوں گی۔



اس نے دفتر سے اٹھنے سے پہلے غزالہ کو ٹیلی فون کر دیا تھا لیکن غزالہ کو دیکھ کر اس پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ اس کے کسی اندازے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ انتظار کا سنگار کئے بیٹھی ہو اسے تو یہی لگا جیسے وہ ابھی گھر سے نکلا تھا اور ابھی لوٹ کر واپس آ گیا ہے غزالہ کو اتنی فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ اپنے آپ کو سنوارتی یا اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہوتی۔

شاید روز ہی اس کیفیت سے گزرتا ہو گا لیکن یاسمین سے ملاقات کے بعد اس کے جذبات میں ارتعاش پیدا ہو گا تھا عورت کی مظلومیت کے قصیدے پڑھنے والے اس عورت کو بھی تو دیکھیں۔ کوئی مرد اپنی عورت کو ایک مرتبہ قتل کرتا ہے مگر یہ عورتیں تو دن میں دس مرتبہ اپنے مردوں کو قتل کرتی ہیں' ان کے جذبات کا خون کرتی ہیں اور پھر مظلوم کی مظلوم۔ اس نے نفرت سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ غزالہ بچی نہیں تھی کہ نفرت کی نظر نہ پہچانتی لیکن وہ اتنی بچی ضرور تھی کہ نفرت کا سبب دریافت کرنے کے بجائے خود بھی غصے میں آ گئی۔ اس نے سوچا' میں اتنی گئی گزری ہو گئی کہ دن بھر کے بعد یہ شخص آیا ہے اور اس کا رویہ دیکھو' اس خیال کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر جو فطری شگفتگی تھی وہ بھی رخصت ہو گئی۔ شہزاد نے سوچا' جب اسے توفیق

نہیں تو میں کیوں بات کروں۔ اس کی چھت کے نیچے یہ موسم کئی مرتبہ آیا تھا آج پھر وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے ایسے موقعوں پر وہ اکثر اندر سے ٹوٹ جاتا تھا ویران ہو جاتا تھا' لیکن آج اسے یہ فرصت غنیمت معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور یاسمین کے بارے میں سوچنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس کی تو اب شادی ہو گئی ہو گی یا کیا خبر ابھی وہ اس ایندھن سے آزاد ہو۔ اتنی اہم بات میں نے اس سے پوچھی کیوں نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس نے بھی یہ سوال مجھ سے نہیں کیا جبکہ ہر لڑکی اپنی عادت سے مجبور ہو کر یہ سوال پوچھتی ضرور ہے ممکن ہے وہ جواب میں یہ سننا نہ چاہتی ہو کہ میری شادی ہو چکی ہے اس لئے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ پوچھا ہی نہ جائے اب اگر آئی تو میں اس سے پوچھوں گا ضرور لیکن اب وہ کیوں آئے گی میں نے جب بے مروتی کا اظہار کیا ہے اس کے بعد وہ کیوں آئے گی۔ وہ اپنی عقل پر ماتم کر رہا تھا اس نے کچھ بھی تو نہیں پوچھا تھا کہاں رہتی ہے' کیا کرتی ہے معلوم ہوتا تو خود ہی ملاقات کرنے چلا جاتا۔

یہ اس کی کوئی دبی ہوئی خواہش تھی جو اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہی تھی ورنہ اس نے کئی مرتبہ یہ بھی سوچا کہ وہ شادی شدہ ہے اور کیا خبر یاسمین کی بھی شادی ہو گئی ہو۔

"وہ ان خیالوں سے آزاد ہونے کے لئے کمرے سے باہر نکل آیا۔ غزالہ نے اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ یہ کیسی عورت ہے۔ کوئی بات بھی ہو' کس بات پر اتنی خفا ہے' خفا نہیں ہے ضد اسے بہت رلائے گی لیکن تکلیف میں تو میں بھی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس سے ہنسوں' بولوں اس کے ساتھ کہیں گھومنے جاؤں لیکن کیوں جاؤں۔ جو عورت گھر میں خوش نہیں رہ سکتی اسے باہر جانے کا کیا حق ہے جس کے قہقہے میرے لئے نہیں ہیں' اسے قہقہے لٹانے کے لئے کسی تقریب میں کیوں لے جاؤں۔

"میری شکل سے ایسی ہی نفرت تھی تو شادی کیوں کی تھی؟" غزالہ نے اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکلوں سے کیا ہوتا ہے۔"

"تو پھر گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟"
"دیکھ رہا ہوں کہ میرے لئے تمہارے چہرے پر ہنسی تک نہیں ہے۔"
"کیا صرف پاگلوں کی قسمت میں ہنسنا ہوتا ہے۔ اپنے گھر کی فضا کو خوش گوار بنانے کے لئے تم نہیں ہنس سکتیں"۔
"تو کوئی بات بھی ہو"
"ہزار باتیں ہیں۔ مسکرا کر بات کرسکتی ہو' یہی سمجھ لو گھر میں کوئی مہمان آیا ہے منہ دھو کر ہلکا سا میک اپ ہی کرلو تو میری خوشی کا سامان ہو جائے۔"
"تمہیں تو میری صورت ہی اچھی نہیں لگتی۔ کیا میک اپ میں کیا میک اپ کے بغیر بے کار کی باتیں"
"یہ بے کار کی باتیں ہیں؟" شہزاد نے بلند آواز میں کہا۔
"اچھا چیخو مت"
"کیوں نہ چیخوں"
"چیختے رہو' پڑھے لکھے جاہل" اس نے زیر لب کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
کھانے کا وقت ہے۔ چاہتی تو کھانے پر بلا کر ناراضگی دور کرسکتی تھی لیکن اسے تو یہ پروا بھی نہیں کہ میں کھانا کھاؤں گا بھی یا نہیں۔
"بی بی پوچھ رہی ہیں' آپ کھانا کھائیں گے؟" ملازمہ نے آکر پوچھا۔
جب غزالہ خوش ہوتی تھی تو یہ سوال وہ خود کرتی تھی۔
"نہیں' بھوک نہیں ہے" اس نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ ہوٹل میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اپنی قسمت پر غور کر رہا تھا کیا میں اسی لئے دن رات محنت کر کے کما رہا ہوں۔ میرے ساتھ تو غزالہ ایسا سلوک کر رہی ہے جیسے بے روزگار مردوں کے ساتھ ان کی بیویاں کرتی ہوں گی۔ اچھی زبردستی ہے یہ اس عورت کی مجھے ابھی سے سخت قدم اٹھانا چاہئے ورنہ اس کے دماغ تو اور خراب ہوتے جائیں گے لیکن میں کیا سخت قدم اٹھا سکتا ہوں یہاں تو زور سے ڈانٹ بھی دو تو عورت کی مظلومیت کا سوال آ جاتا ہے یاسمین ٹائپ کی عورتیں ان کے مقدمے لڑتی پھر رہی ہیں حکومت بھی یہی رونا

رو رہی ہے کہ دوڑو' جلدی کچھ کرو' عورتوں کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے یہ مرد بڑے بے درد ہیں۔ بھلا بتاؤ تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جب وہ تھکے ہارے گھر میں داخل ہوا کریں تو یہ عورتیں مسکرا کر ان کا استقبال کیا کریں ان کی پسند کے کپڑے پہنا کریں۔ کہیں جانا ہوا کرے تو ان سے اجازت لیا کریں۔ عورتیں ہیں یا حکم کی غلام۔ آخر ان کی بھی اپنی شخصیت ہے جب وہ حکم مانتی ہیں ان کی شخصیت پر اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں آج کی عورت کوئی پہلے زمانے کی عورت ہے جس کو اپنے شوہر کا حکم ماننے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا آج کی عورت پڑھی لکھی ہے وہ دبنے والی نہیں اس کی تعلیم نے پہلا سبق یہی سکھایا ہے کہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں جاہل عورتیں اس براری کی قائل نہیں ہیں کوشش کر کے انہیں بھی مردوں کے برابر لانا ہے۔ انہیں شدت سے احساس دلانا ہے کہ مرد تمہیں کمتر سمجھتے ہیں اسی لئے تو تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمارے حکم پر چلا کرو۔ چھٹی کے دن خود تو شیو تک نہیں کرتے' تمہیں حکم دیتے ہیں سولہ سنگار کرو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی حکم کے ماننے کی۔ وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں تو تم بھی آزاد ہو اگر وہ تمہاری آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کریں تو تم مظلوم ہو۔

ان خیالات کے ساتھ ہی اسے ایک مرتبہ پھر یاسمین کا خیال آ گیا وہ بھی عورتوں کے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئی ہے ورنہ اس کے چہرے پر کس قدر معصومیت ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے یہ خیالات اس کے کسی تجربے کا حصہ ہوں وہ بھی کسی ایسے تجربے سے گزر رہی ہو جس سے میں گزر رہا ہوں۔

وہ رات گئے گھر واپس آیا اور بیڈ روم میں جانے کے بجائے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے کو بستر بنا کر لیٹ گیا اسے امید تھی کہ غزالہ اسے منانے کے لئے ضرور آئے گی۔

انٹرکام کی گھنٹی نے اسے بیدار کیا۔ اس کی ملازمہ اسے صبح ہونے کی خوش خبری سنا رہی تھی۔

آپ تیار ہو جائیں' میں ناشتا تیار کرتی ہوں"

"غزالہ کہاں ہے؟"

"بی بی جی' اپنے کمرے میں ہیں' میں نے انہیں بھی اٹھایا تھا لیکن وہ کہتی ہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہو کر آتا ہوں' تم ناشتا لگاؤ"

ناشتے کی میز پر غزالہ موجود ضرور تھی لیکن دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہزاد نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

غزالہ اس دن کمرا بند کر کے خوب روئی۔ یہ کیسا بے حس آدمی ہے' اسے اتنا احساس نہیں کہ میں نے رات کھانا بھی نہیں کھایا اپنے کمرے میں رات بھر اکیلی پڑی رہی' اس نے آ کر جھانکا تک نہیں یہ آخر کیوں چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں۔ دنیا میں لڑائیاں ہوتی ہیں لیکن یوں قطع تعلق کر کے کوئی نہیں بیٹھ جاتا اور کوئی لڑائی بھی تو ہو۔ اگر میں بارش دیکھنے کے لئے نہیں اٹھی تو اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات تھی۔ وہ تو مجھے بات تک کرنے کے لائق نہیں سمجھتا' اور کیا امید رکھوں ہمیشہ میں نے پہل کی ہے لیکن اب نہیں کروں گی۔ اگر وہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے تو میں اسے سر کا تاج کیوں سمجھوں۔ خوشامد کر کے دماغ خراب کر دیئے ہیں میں نے۔ میں بیوی ہوں کوئی غلام نہیں۔



وہ دفتر پہنچنے کے بعد دن بھر یاسمین کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ وہ یاسمین کا اس شدت سے انتظار کیوں کر رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ غزالہ نے اپنے رویے سے وہ خلا پیدا کر دیا ہے جس میں کوئی بھی عورت اپنی جگہ بنا سکتی ہے۔ اس نے اپنے دفتر کی ٹائپسٹ مس موہنی کو اپنے کمرے میں بلایا اور ایک خط ٹائپ کرانے کے بہانے بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

"اس خط کو بہت رازداری سے ٹائپ کرنا ہے۔ آپ ایسا کریں' یہاں بیٹھ کر ٹائپ کر دیں"

"یہاں؟ آپ کے کمرے میں!"

"کیوں، ممکن نہیں ہے؟"

"ممکن کیوں نہیں ہے، آپ ڈسٹرب ہوں گے"

"میری فکر چھوڑیئے، آپ چپراسی سے کہہ کر ٹائپ رائٹر یہاں منگوا لیں۔"

مس موہنی کو تعجب ضرور ہوا لیکن پھر اس نے سوچا، ہو سکتا ہے خط کی نوعیت ایسی ہو کہ رازداری کی ضرورت ہو۔

شہزاد نے جو خط اسے ٹائپ کرنے کے لئے دیا وہ ہرگز ایسا نہیں تھا جس کے لئے اتنی رازداری ضروری ہو لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

"مس موہنی" ، آپ سے ایک ذاتی سا سوال پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی۔"

"پوچھیے سر"

"مس موہنی" آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ میرا مطلب ہے کوئی خاص وجہ ہے یا بس یونہی"

"رشتے بہت آئے لیکن کوئی ہمارے معیار پر پورا نہیں اترا، کسی کے معیار پر ہم پورے نہیں اترے اور کوئی خاص وجہ نہیں۔"

"شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"شادی ضرور کرنی چاہیئے"

"کیوں؟"

"اس سے آدمی کو اپنی اوقات کا پتا چلتا ہے اس کا غرور خاک میں ملتا ہے۔ وہ حقیقت میں آدمی بنتا ہے۔"

مس موہنی نے شادی کے فلسفے کو عجیب و غریب رنگ دیا تھا۔ اس نے کبھی شادی کے مسئلے پر اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ مس موہنی اس کے لئے بڑی دلچسپ ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ یہ کیسے کہتی ہیں کہ شادی سے آدمی کو اپنی اوقات کا پتا چلتا ہے"

"دیکھئے نا سر، شادی سے پہلے لڑکیوں کو اپنے حسن پر کتنا غرور ہوتا ہے۔ شادی

کے بعد یہ ہتھیار کند ہو جاتا ہے۔ شوہروں کو ناز نخرے اٹھانے کی فرصت ذرا کم ہی ملتی ہے۔ یہی حال مرد کا ہوتا ہے۔ اس کی بھی ساری اکڑ نکل جاتی ہے۔" مس موہنی نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا مس موہنی یہ بتائیں۔ اس کھیل میں مرد مظلوم ہوتا ہے یا عورت۔

میرے خیال میں تو دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں حالات کے ظلم کا شکار"

"یہ کیابات ہوئی؟"

"بات یہ ہوئی سر' کہ دونوں ہی اپنی اپنی اصلیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تھوڑے دن خوب رگڑا رگڑی ہوتی ہے پھر یہ پکے رنگ کچے ہو کر اترنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جس کے رنگ زیادہ اتر جاتے ہیں وہ اتنا ہی زیادہ مظلوم بن جاتاہے یا خود کو مظلوم کہلواتا ہے تو یہ ہے مظلومیت کی کہانی۔ کہانی مردوں کے رنگ زیادہ اترتے ہیں کہیں عورتوں کے لیکن اترتے ضرور ہیں۔"

"پھر یہ عورتیں ہی کیوں مظلوم سمجھی جاتی ہیں۔ مردوں کو کوئی مظلوم نہیں کہتا۔ اس دن چندہ مانگنے جو لڑکیاں آئی تھیں' وہ بھی یہی کہہ رہی تھیں اخبارات' سیاسی لیڈر' فلمی کہانیاں سب یہی کہتے ہیں آپ کیا کہتی ہیں ایسا کیوں ہے"

"وہ اگر خود کو مظلوم نہ کہے تو ظالم مشہور ہو جائے"۔

"مگر دوسرے لوگ بھی کہتے ہیں۔"

"وہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسے مظلوم کہہ کر مزید کمزور کر دیا جائے اور پھر اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

"اچھا' یہ تو مانیں گی کہ مرد بے چارہ مظلوم ہوتا ہے"

"یس سر' اس کی تو میں قائل ہوں' کبھی کبھی تو وہ اتنا مظلوم ہوتا ہے کہ عورت ظالم نظر آنے لگتی ہے" مس موہنی نے پھر ایک فرمائشی قہقہ لگایا۔

اتنی باتیں ہوئیں کہ دفتر کا وقت گزر گیا اور خط اپنی جگہ رہ گیا۔

"ٹھیک ہے یہ خط کل ٹائپ ہو جائے گا" شہزاد نے کہا۔

آج تک وہ اپنے عملے سے کبھی اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا وہی مس موہنی جو اس سے بات کرتے ہوئے کانپتی تھی' آج بڑے اعتماد سے باتیں کر رہی تھی دفتر کے

مردوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ شہزاد نے آج مس موہنی کو اپنے کمرے میں بند کر کے رکھا ہوا ہے اور چپراسی کے ذریعے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں اور اتنی دیر میں ایک مرتبہ بھی ٹائپ رائٹر کی آواز نہیں آئی تو یہ کھلبلی تشویش میں بدل گئی۔ شہزادہ بذات خود اپنے اس رویے پر حیران تھا اس نے گھر جا کر بہت دیر تک سوچا۔ مس موہنی کیا سوچ رہی ہوگی مجھے یہ ضرورت کیوں پیش آئی کہ اسے اپنے کمرے میں بلا کر باتیں کروں۔ کیا مجھے یہ موقع غزالہ نے نہیں دیا؟ بے شک! یہ اسی کی حرکت ہے میں مس موہنی سے باتیں نہیں کر رہا تھا۔ اس پیاس کو بجھا رہا تھا جو غزالہ کی بے رخی نے بھڑکا دیا تھی اگر یہ مظلوم عورتیں ایسا موقع نہ دیں تو کسے پڑی ہے کہ مس موہنی کو اپنے دفتر میں بلاتا پھرے وقت نہ ہو تو وقت ہرگز نہیں اسی لئے تو عورت مظلوم کہلاتی ہے یہ غزالہ کا حق تھا جو میں نے مس موہنی کو دے دیا ہے اگر وہ کسی وجہ سے بات نہیں کر رہی تو میں کر لوں۔ خوش ہو جائے گی۔ شاید آئندہ اسے میرا دل رکھنے کا خیال آ جائے غزالہ کا غصہ بھی اب اتر چکا تھا چنانچہ جیسے ہی شہزاد نے پہل کی' وہ بھی پگھل گئی تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ دونوں میں بول چال بند تھی۔ اگر یہ عورت اس طرح ہنستی رہے تو میرے گھر میں کیسی رونق ہے اس نے محسوس کیا جیسے اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی ہے ایک حوصلہ ہے جو بیدار ہونے لگا ہے۔ پچھلے دو دنوں سے وہ جس مایوسی کا شکار ہو گیا تھا' غزالہ کی ایک مسکراہٹ نے اسے اس قید سے رہائی دلا دی اس نے تازہ ہوا میں کئی گہری سانسیں لیں اور غزالہ کے ساتھ گھومنے کے لئے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر شاپنگ کی' رات کا کھانا ہوٹل میں کھایا اور رات گئے وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھر واپس آ گئے۔

"کچھ فرق محسوس کیا؟" شہزاد نے غزالہ سے پوچھا

"کیا فرق؟"

"کل میں اور آج میں۔ جب تم مجھ سے بول نہیں رہی تھیں اس وقت زندگی کا لطف تھا یا اب لطف آیا۔"

"میں نہیں بول رہی تھی یا تمہارے ہونٹوں پر تالے پڑے ہوئے تھے"

"چلو، ہم دونوں ہی چپ تھے، تھی تو بول چال بند۔"
"تم خود ہی سوچ لو تم ہی لڑتے ہو"
"میں لڑتا ہوں؟"
"تو اور کون لڑتا ہے؟"
"میرا قصور تو صرف اتنا تھا کہ بارش دیکھنے کے لئے تم کو سوتے سے اٹھا دیا تھا۔"
"یہ قصور ہی نہیں! کسی انسان کو نیند سے اٹھالو اور کہو کوئی بات ہی نہیں!
"تم اگر میری خوشی کی خاطر اٹھ جاتیں، تھوڑی دیر کے لئے اپنی نیند خراب کر لیتیں تو کون سی قیامت آ جاتی"۔
"نہیں اٹھی تو کون سی قیامت آ گئی لیکن تم نے مجھے یوں ٹھوکر مار کر الگ کر دیا جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہیں۔"
"میں نے الگ کر دیا، یا تم خود الگ ہو گئیں غلطی بھی تمہاری تھی اور سزا بھی تم نے سنائی۔ معذرت کرنے کے بجائے بات چیت کرنا ہی چھوڑ دی۔"
"تو تم کر لیتے۔ تمہاری کیا شان کم ہو رہی تھی۔"
"بات شان کی نہیں ہے، اصول کی ہے، جس کی غلطی ہو گی وہ منائے گا۔"
"ہاں تم فرشتے ہو۔ تم سے تو کبھی غلطی ہوتی ہی نہیں۔"
"فرشتہ نہیں لیکن بہت سے انسانوں سے بہتر انسان ہوں۔"
"جو اپنی تعریف خود کرے اس سے بڑا بے وقوف کون ہو گا۔
"یہ تعریف نہیں حقیقت ہے"
"تو یہ بھی حقیقت ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں، غلام نہیں"
"تم وفاداری کو غلامی کیوں سمجھتی ہو۔ اگر میری خدمت کر لو گی، میرا دل رکھ لو گی تو کیا یہ غلامی ہے"
"میں کیا نہیں کرتی لیکن میرے پیچھے دم تو لگی ہوئی ہے نہیں کہ تمہیں دیکھ دیکھ کر ہلاتی رہوں۔"
"کتے جیسی وفاداری تو کیا تم کرو گی، تم سے تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ میرے لئے

ایک تبسم بھی خرچ کر دو۔ ہلکا پھلکا سنگار میرے لئے کرلو"

"میں پاگل تو ہوں نہیں کہ ہنستی رہوں اور نہ ہی ننھی بچی ہوں کہ نئے کپڑے پہن کر خوش ہو جاؤں۔

"تو پھر میری سرد مہری کی شکایت بھی مت کرو" شہزاد نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں کوئی شکایت نہیں کرتی بابا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"

"اپنا حال تبدیل نہیں کروگی"

"تم میں عقل ہے کہ نہیں؟"

"عقل تو ہے' قسمت خراب ہے کہ تمہارے جیسے آدمی سے شادی ہو گئی۔"

"شکر ادا کیا کرو خدا کا"

"دن رات جوتے کھاتی رہوں اور شکر ادا کرتی رہوں۔ واہ بھئی واہ اچھی زبردستی ہے۔"

"یہی حال رہا تو بھی جوتے کھاؤ گی۔"

"ہاتھ تو لگا کر دکھاؤ ہاتھ توڑ دیں گے میرے بھائی۔"

"خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو' کفران نعمت مت کرو۔"

"تم سب کچھ کرتے ہو میں کچھ نہ کروں"

"آپ صرف اتنا کریں کہ اپنا بستر کہیں اور لگا لیں' مجھے سکون سے سونے دیں۔" شہزاد نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا لیکن جب ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ خود ہی کمرے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ بس اتنی دیر کی چاندنی تھی میرے تعلقات کی اندھیری رات میں۔ غلطی میری ہی تھی ابھی اس کے دماغ درست نہیں ہوئے تھے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ اس عورت کو نہ تو میرے جذبات کا پاس ہے نہ اہمیت کا احساس اس نے طے کر لیا کہ اب کچھ ہو جائے' غزالہ سے بات نہیں کرے گا۔ سمجھ لے گا کہ اس کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ایک بے سہارا عورت ہے جسے اس نے گھر میں ڈالا ہوا ہے۔

اس کی ملازمہ اس گھر کے ماحول سے خوف واقف تھی اسے معلوم تھا کہ جب وہ

ڈرائنگ روم میں سوتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے اور اسے کیا کرنا ہوتا ہے اس نے انٹرکام پر اسے بیدار کیا اور ناشتے کی تیاری کی اطلاع دی۔

"ناشتے کی میز پر غزالہ موجود نہیں تھی۔ شہزاد کو اپنی تنہائی پر جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی' وہ سوچ رہا تھا یہ ملازمہ معمولی سی تنخواہ کے لئے اپنے فرائض کس خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے' وہ اپنی پوری تنخواہ غزالہ کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے اس کے باوجود اس کے نخرے کم نہیں ہوتے۔ ناشتا تیار کرنا تو بڑی بات' اسے یہ بھی توفیق نہیں کہ ناشتے کی میز پر آ کر بیٹھ ہی جائے۔ وہ تو اس نوکرانی سے بھی گئی گزری ہے اس نے جیسے تیسے ناشتا کیا اور دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ دفتر پہنچا تو اس کے کمرے میں مس موہنی پہلے سے موجود تھی۔

"اب اس کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے کیبن میں جایئے وہیں بیٹھ کر ٹائپ کیجئے۔

"آپ تو کہہ رہے تھے۔ یہ سیکرٹ لیٹر ہے"

"میں بکواس کر رہا تھا۔ یہ قطعی سیکرٹ نہیں ہے"

مس موہنی نے ایک ہی دن میں جانے کتنے خواب دیکھ لئے تھے۔ اسے معلوم تھا' شہزاد کے اپنی بیوی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں اسے ہمدردی کے دو بول بھی خوش کر سکتے ہیں اور اگر وہ خوش ہو گیا تو وہ اس کی بیوی کی جگہ بھی لے سکتی ہے کچھ نہیں تو اس کی ترقی تو پکی ہے لیکن شہزاد نے تو ایک ہی جھٹکے میں اس کا ہر دھاگا توڑ دیا اس نے شہزاد کی اس تبدیلی کو حیرت سے محسوس کیا اور اس کے کمرے سے نکل آئی۔

شہزاد اپنے رویے پر خود حیران تھا۔ جو میری محبت کی حق دار ہے اس کو میری محبت درکار نہیں تو میں یہ دولت کہیں اور کیوں لٹاتا پھروں۔ وہ سوچ ضرور رہا تھا لیکن اسے اپنی حالت پر تشویش بھی ہو رہی تھی۔ میں کسی نفسیاتی مرض میں تو مبتلا نہیں ہونے لگا ہوں ایک عورت کی بے رخی نے میرے دل میں ہر عورت کی طرف سے نفرت کا جذبہ تو پیدا نہیں کر دیا ہے شاید ایسا ہی ہے موہنی کی طرف آج میں نے کس نفرت سے دیکھا ہے اس غریب نے بھی اسے محسوس ضرور کیا ہوگا' پھر اس نے سوچا یہ بھی اچھا ہی ہوا' اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل میں کسی جذبے کو جگہ دیتی اس نے اسے

مایوس کر دیا۔ یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔



دن' دھوپ چھاؤں بن کر گزر رہے تھے۔ غزالہ سے شہزاد کے تعلقات میں مزید ابتری آ گئی تھی۔ شہزاد برابر اس کوشش میں مصروف تھا کہ حالات اس کے اختیار سے باہر نہ ہوجائیں۔ اس نے اب غزالہ کی طرف سے بے نیازی اختیار کر لی تھی۔ اس کی زیادتیوں پر صبر کرنا اس نے اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ اس انداز سے زندگی گزارنا اس کے لئے تکلیف دہ ضرور تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا روز روز کی لڑائی سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کہ غزالہ اس کی بچی کی ماں بن گئی تھی۔ غزالہ جیسی بھی تھی اس کی بچی تو تھی اسے نہ سہی اس کی بچی کو تو غزالہ کی ضرورت تھی۔ اسے تو ماں کے سائے کی ضرورت تھی۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی شکایتوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

اس قدر احتیاط کے باوجود کسی نہ کسی مسئلے پر تلخ کلامی ہو ہی جاتی تھی۔ غزالہ اپنے طور پر یہ سمجھتی تھی کہ اب تک اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی چلی آئی ہیں اس لئے اب اس کے لہجے میں شدت آگئی تھی پہلے اگر دو باتیں سن بھی لیتی تھی تو اب اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ شہزاد اگر ایک کہتا تو دس سناتی اور اسے بے دردی سے بات کرتی جیسے اس کے مقابل اس کا شوہر نہیں' ازلی دشمن ہو۔ ایک دوسرے کی جسمانی ضرورتیں اتنا کردار ضرور ادا کرتیں کہ چند روز کی خفگی کے بعد کچھ دیر کے لئے عارضی جنگ بندی ہو جاتی لیکن جب دل ہی صاف نہ ہوں تو علاج دائمی نہیں ہوتے۔

وہ انہی پھولوں اور زخموں کے درمیان زندگی کی سزا کاٹ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ ایک ایسے ادارے کا اشتہار تھا جو عورتوں کی فلاح و بہبود کا دعوے دار تھا اس ادارے کے عہدے داروں میں یاسمین کا نام بھی شامل تھا۔ آخر اس نے اس ادارے کی بنیاد رکھ ہی دی اس نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ یاسمین کا پتا معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ادارے کا نمبر ملایا۔

ہیلو! دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز ابھری

"مجھے یاسمین صاحبہ کا پتا معلوم کرنا تھا۔"

"کون یاسمین؟"

"آپ کے ادارے کے اشتہار پر جن کا نام ہے "

"اچھا' یاسمین درانی"

"جی ہاں' وہی وہی"

"دیکھئے' میں ان سے پوچھے بغیر ان کا پتا یا فون نمبر آپ کو نہیں دے سکتی"

"اچھا' آپ میرا پیغام تو انہیں پہنچا سکتی ہیں؟"

"جی ہاں' یہ ممکن ہے"

"میرا نام شہزاد رضا ہے۔ میرا فون نمبر لکھ لیں' ان سے کہیں یا تو وہ تشریف لے آئیں یا اس نمبر پر بات کر لیں۔"

"بہت بہتر' آپ نمبر لکھوائے۔

شہزاد نے اپنا نمبر اس لڑکی کو لکھوا دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا کچھ دیر بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی دوسری جانب سے یاسمین بول رہی تھی۔

"تم اس دن کے بعد آئیں نہیں۔"

"کیا کرتی آ کر۔ آپ کو تو ہمارے مؤقف ہی سے اختلاف ہے۔"

"ہماری جان پہچان اس وقت سے ہے جب نہ تمہارا یہ موقف تھا اور نہ میرا اختلاف درمیان میں تھا۔"

"لیکن اب میری دوستی اور دشمنی اسی موقف سے مشروط ہے"

"اس کا مطلب ہے اب ہمارا شمار دشمنوں میں ہے "

"نہیں مخالفین میں۔"

"مذاق چھوڑو اور فوراً" ملاقات کرو۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں جو اس روز نہیں کر سکا تھا۔"

"چندہ دیں گے؟"

"چندہ دینے کے لئے ہی تو بلا رہا ہوں"

"پھر تو میں ابھی آئی"

"میں انتظار کر رہا ہوں"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کے سیکرٹری نے یاسمین کی آمد کی اطلاع اسے دی اور اس وقت یاسمین اس کے کمرے میں موجود تھی۔

تو آخر آپ بھی ہمارے ہم خیال ہو ہی گئے" یاسمین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"ہم خیال نہیں ہو گیا' صرف چندہ دے رہا ہوں"

"آہستہ آہستہ ہم خیال بھی ہو جائیں گے"

"اگر تم کوئی خیال نہ کرو تو کہیں باہر چل کر بیٹھیں"

"یہاں سے اچھی جگہ اور کون سی ہو گی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ یہاں تمہاری آمدورفت زیادہ ہو اس لئے آج ہی سے کوئی مستقل ٹھکانا بنائے لیتے ہیں"

"اول تو ہم کون سا روز ملیں گے اور بالفرض وہ برا وقت آیا بھی تو ذرا بعد میں آئے گا۔ جب آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو یہیں ٹھیک ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی"

شہزاد نے کافی کا آرڈر دیا اور باتوں میں مصروف ہو گیا ابتدائی معلومات کے طور پر جو باتیں اس کے علم میں آئیں وہ اس کے لئے بہت ہمت افزا تھیں ۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کے کہنے کے مطابق اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اس اطلاع نے شہزاد کا سینہ فخر سے چوڑا کر دیا۔ اس کا مطلب ہے اس نے ابھی تک میری محبت کو بھلایا نہیں۔ اسے افسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ اب اگر وہ چاہتا بھی تو یاسمین اس سے شادی نہیں کر سکتی تھی شہزاد نے سوچا' اس کی دوستی ہی اسے سہارا دینے کے لئے کافی ہے۔ شادی تو ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے وہ ہو چکی۔ غزالہ ایسی عورت بھی نہیں کہ یاسمین کے وجود کو برداشت کر لے۔ اس نے شادی کا خیال جھٹک دیا یاسمین نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اس سے بس اتنا فائدہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے آزادانہ میل جول رکھ سکتا تھا پھر یہ کہ وہ ایک

سوشل ادارے سے وابستہ تھی اس لئے بھی اس سے ملنا جلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس ملاقات میں اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل ہے اسی لئے وہ اس ادارے میں خاصی اہم حیثیت رکھتی تھی۔

اب شہزاد سے ملاقاتیں روزانہ ہو رہی تھیں۔ کبھی دفتر میں کبھی دفتر سے باہر چند ملاقاتوں کے بعد یاسمین کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک شہزاد سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ بہت پرامید تھا اور یہ طے کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی دن وہ غزالہ سے چھٹکارا پا لے گا اور یاسمین کو زندگی کا نیا ساتھی بنائے گا ابھی اس نے اظہار نہیں کیا تھا لیکن یہ ملاقاتیں بذات خود اظہار محبت تھیں۔

اشارے کتنے ہی واضح ہوں جب تک زبان ساتھ نہ دے معاملات طے نہیں ہوتے۔ چند مہینے کی قربت نے شہزاد کو وہ ہمت بھی دے دی تھی کہ وہ یاسمین سے اظہار محبت کر سکتا تھا۔

"یاسمین کیا' میں تمہیں اب بھی اچھا لگتا ہوں؟" ایک دن شہزاد نے پوچھا۔

"اچھا لگنے کے لئے کوئی مدت نہیں ہوتی۔ جو چیز کل اچھی لگتی تھی آج بھی اچھی لگتی ہوگی۔"

"مجھے تسلیم کہ میں نے تمہاری محبت کاجواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ اس کا ازالہ میں اب کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے جذبے کی آج بھی قدر کرتی ہوں لیکن اب صرف قدر ہی کی جا سکتی ہے۔ وقت بہت ضائع ہو گیا شہزاد"

"میں تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کر چکا ہوں میں اب زیادہ دن اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا"

"لیکن میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی عورت کا گھر اجاڑ کر اپنی محبت آباد کروں"

"لیکن جب کوئی عورت خود ہی اپنا گھر اجاڑنے پر تلی بیٹھی ہو میں نے بہت چاہا کہ وہ اس خطرے کو محسوس کرے لیکن وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔"

"پھر بھی یہ میرے لئے بڑی بدنامی کا باعث ہوگا"

"کوئی نہیں ہوتی بدنامی ' سب بھول جاتے ہیں لوگ"

یاسمین تیار تو نہیں ہوئی لیکن نیم رضامندی اس کے انداز سے ظاہر تھی اس نے اگر اقرار نہیں کیا تو صاف انکار بھی نہیں کیا شہزاد نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

یاسمین کے الجھنے کے بعد وہ غزالہ کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ اس نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے غزالہ کو بھی اس کی کیا پروا تھی تنخواہ اسے مل رہی تھی بس یہی اس کے لئے بہت تھا۔

شہزاد بھی اب اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی دل بستگی کے لئے یاسمین موجود تھی۔ اب اس نے غزالہ سے لڑنا بھی چھوڑ دیا تھا جب توقع ہی نہ ہو تو لڑائی کیسی۔

غزالہ بہت دن تک تو یہی سمجھتی رہی کہ شہزاد اس سے انتقام لینے کے لئے اس حرکت پر اتر آیا ہے اپنے آپ ہی راہ راست پر آ جائے گا لیکن جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو اسے فکر ہوئی۔ اس نے پہلے تو شہزاد کو کریدنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے وہ اتنی جلدی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس پوچھ گچھ کا کوئی اور فائدہ تو نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ لڑائی کے لئے غزالہ کو ایک میدان مل گیا۔ غزالہ کا پکا یقین تھا کہ شہزاد کی اس بے زاری کے پیچھے کسی عورت کا وجود ہے۔ وہ کون' اس کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے شک نے شہزاد کو محتاط کر دیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد اپنی ملاقاتوں کو قانون کے دائرے میں لانا چاہتا تھا لیکن مسئلہ غزالہ کا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور ظاہر وہ اجازت دینے والی نہیں تھی۔ اس نے کئی مرتبہ یاسمین سے مشورہ لینا چاہا تھا لیکن وہ ہر مرتبہ بڑی خوبصورتی سے بات کو ٹال گئی۔ اب جو کچھ کرنا تھا شہزاد کو خود کرنا تھا اسے معلوم تھا کہ یاسمین صرف اس لئے ہچکچا رہی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اگر غزالہ درمیان سے ہٹ جائے تو اسے اعتراض نہیں ہو گا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ غزالہ کو طلاق دے دے لیکن ہر مرتبہ بچی کی محبت آڑے آ جاتی تھی۔ موقع بھی ایک دن غزالہ نے اسے خود فراہم کر دیا۔

شہزاد کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر غزالہ کے ایک رشتے دار نے اس کے گھر

میں جگہ بنا لی۔ شہزاد بہت عرصے سے اس آمدورفت کو شک کی نظر دیکھ رہا تھا لیکن ایک دن اس کاشک یقین میں بدل گیا۔ وہ گھر پہنچا تو غزالہ گھر پر نہیں تھی اس کی بچی ملازمہ کے پاس تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور بچی کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کئی دن بعد اسے کھل کر ہنسنے کا موقع ملا تھا ورنہ گھر کی فضا تو ایسی تھی کہ وہ ہنسنا ہی بھول گیا تھا ہنستے ہنستے اسے اچانک پھندا لگ گیا ملازمہ نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔

"صاحب جی' آپ کیوں اپنا گھر اجاڑنے پر تلے ہوئے ہیں؟"

"تم بھی یہ کہہ رہی ہو۔ تم تو گواہ ہو' تم کو معلوم ہے 'کون کیا چاہ رہاہے۔"

"پھر بھی آپ مرد ہو۔ آپ کی زیادہ ذمے داری ہے نرمی سے نہیں تو سختی سے ٹھیک کرو مگر آپ نے ہاتھ پاؤں میں ڈال دیئے ہیں۔ بیگم صاحبہ آپ سے خوش نہیں تھیں لیکن آپ کی بے رخی نے ان کے دل میں نفرت ڈال دی ہے۔"

"یہ بات تو ان کے سوچنے کی ہے۔ ان کے رویے سے میرے دل میں بہت پہلے نفرت پڑ چکی ہے"

"پھر بھی آپ مرد ہو آپ کو دل بڑا رکھنا چاہئے"

کیا مرد' مرد کی رٹ لگا رکھی ہے' میں مرد ہوں' پتھر نہیں۔

"مضبوطی میں مرد کو پتھر ہی ہونا چاہئے بلکہ فولاد"

"پتھر ہی تو ہوں جو اسے اب تک برداشت کر رہا ہوں" عزت بنائے بیٹھا ہوں"

"کہو ساری باتیں تو کہہ ڈالیں اب کیا رہ گیا ہے "

" اب میں جو بات کہنے والی ہوں' وہ بات ایک جاہل عورت ہی کہہ سکتی ہے۔" اس نے کہا اور بچی کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر آ گئی' "ہاں صاحب' اب سنئے میری دادی کہتی تھیں کہ عورت چاہے تو بھرے بازار میں مرد کی ناک کٹوا دے اس لئے مرد کو چاہئے کہ وہ اپنی زنانی سے ڈرتا رہے یا پھر آنکھیں کھلی رکھے۔ آپ ڈرتے بھی نہیں اور آپ نے آنکھیں بھی بند کرلی ہیں۔ کھیتی تو اب اجڑے ہی اجڑے"

"تم کہنا کیاچاہتی ہو"

"آپ وعدہ کرو' میرا نام [illegible] پائے۔ میں آپ کی عزت کی خاطر بتا رہی ہوں"

"میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارا نام نہیں آئے گا"

"اختر صاحب کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ان کا آنا جانا آج کل بہت بڑھ گیا ہے۔ اس وقت بھی بیگم صاحب انہی کے ساتھ گئی ہیں۔ اب بھی وقت نہیں گیا آپ اپنے گھر میں دلچسپی لیجئے۔"

عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ شہزاد پر گھڑوں پانی پڑ گیا حالت یہ ہوگئی کہ کاٹو تو بدن سے خون نہ نکلے ناک تو بعد میں کٹتی اسے تو ابھی سے محسوس ہونے لگا کہ جتنی ناک کٹنی تھی کٹ چکی۔ بھرے بازار میں نہ سہی ملازمہ کے سامنے تو اس کی بے عزتی ہو ہی گئی۔ کیا خبر اور کس کس کو اس بات کا علم ہو چکا ہو۔

"صاحب جی، اب آپ کے اوپر ہے، اس اطلاع کو تماشا بنا دیں یا عقل مندی سے کام لیں۔"

شہزاد نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور کسی ارادے کو دل میں لے کر اٹھ گیا۔

عورت اپنی محبت او مرد اپنی ملکیت کو تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ غزالہ سے وہ خوش نہیں تھا لیکن تھی تو وہ اس کی ملکیت۔ غزالہ کے واپس آنے تک اس کا غصہ اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ بے دفائی کا وہی کھیل وہ بھی کھیل رہا تھا لیکن وہ مرد تھا۔ غزالہ کا قصور اس کے نزدیک ناقابل معافی تھا۔

"مسٹر، میں اب آ گیا ہوں۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں اور آئندہ اس طرف کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے" شہزاد نے کہا۔

بھائی صاحب، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ نہیں تھے، غزالہ نے مجھ سے کہا کہ اسے بازار جانا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلا گیا۔

"سنا نہیں تم نے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" شہزاد اتنی زور سے گرجا کہ اختر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اختر بھائی، آپ اس وقت چلے جائیں" غزالہ نے مشورہ دیا۔

اختر نے شہزاد کی طرف گھور کر دیکھا اور سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کب سے ہو رہا ہے یہ کھیل؟" شہزاد نے غزالہ سے کہا۔

"کیسا کھیل"

"نہ تم اتنی بچی ہو نہ میں اتنا بے وقوف" میری عزت اتنی سستی نہیں کہ اتنی آسانی سے لٹنے دوں گا"

"تمہیں اپنی بیوی پر الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہئے"

"یہ الزام نہیں' حقیقت ہے"

"جب مرد اندھا ہو جائے تو شک کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا"

"میں اندھا نہیں ہوں۔ میں نے وقتی طور پر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ تم سمجھیں شہزاد مرگیا ہے۔"

"اپنے چہرے میں میرا چہرہ مت تلاش کرو۔ میں نے تم سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ آنکھیں بند کر کے کس کی طرف جا رہے ہو"

"کاش! تم پوچھ لیتیں۔ میں جواب میں تمہیں بتا تو سکتا کہ تم وہ کھلونا ثابت ہوئی ہو جس نے کبھی میرا دل نہیں بہلایا۔"

"یہی جواب میں بھی دے سکتی ہوں"

"تمہارا جواب کمزور ہوگا"

"لیکن یہ دلیل بے وزن نہیں ہوگی کہ تم کیسے مرد ہو جو تمہاری عورت کسی اور مرد کا سہارا تلاش کر رہی ہے "

غزالہ کا جواب تیر کی طرح اس کی زبان کی کمان سے نکلا اور شہزاد کے سینے میں کچھ سے پیوست ہو گیا اس کی مردانگی نے گرتے گرتے سنبھالا لیا اور غزالہ کی چیخوں نے پورے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ شہزاد پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ جتنا مار سکتا تھا اس نے غزالہ کو مارا اور پھر گھر سے نکل گیا۔ وہ رات اس نے ایک دوست کے گھر گزاری اور صبح جب غصہ ذرا کم ہوا تو وہ گھر لوٹ آیا گھر میں تنہائی پہرا دے رہی تھی۔

"غزالہ کہاں ہے؟" اس نے ملازمہ سے پوچھا۔

"صاحب' میں نے کہا تھا نا کہ یہ آپ کے اوپر ہے اس اطلاع کو تماشا بنا دیں یا عقل سے کام لیں۔ آپ نے تماشا بنا دیا۔ بیگم صاحبہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی ہیں۔"

"اور نائلہ"

"اسے بھی ساتھ لے گئی ہیں"

"چلو ٹھیک ہی ہوا۔ یہ عورت میرے معیار کی تھی بھی نہیں"۔

"ایسا نہیں کہتے صاحب۔ آپ جایئے اور بیگم صاحبہ کو منا کر لے آیئے۔"

میں اور اسے منا کر لاؤں' مرد ہو کر اس کی خوشامد کروں'

"خبردار' ! آئندہ یہ تقاضا مجھ سے مت کرنا۔ اب میں اسے اس گھر میں نہیں رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔ میں نوکرانی ہوں' میری بات کی حیثیت کیا۔"

شہزاد نے کمرے میں جا کر دیکھا۔ سامان بکھرا پڑا تھا زیور' کپڑے' نقدی تمام چیزیں وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ایک طرف نائلہ کے کچھ کھلونے پڑے تھے اس نے دوڑ کر ان کھلونوں کو اٹھا لیا۔ کیا نائلہ بھی اب یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ میری بچی مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ اسے یاسمین یاد آئی۔ وہ بھی تو وکیل ہے عورتوں کی مظلومیت کے ترانے بھی گاتی ہے اسے بتاؤں گا کہ دیکھے ان مظلوم عورتوں کی کارستانیاں۔ آنکھیں لڑاتی ہیں آنکھیں دکھاؤ تو آنکھیں نکالنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔

اس نے ملازمہ کو ضروری ہدایات دیں اور یاسمین کے دفتر پہنچ گیا۔

"ابھی اسی وقت دفتر سے باہر میرے ساتھ کہیں چلو" اس نے پہنچتے ہی کہا۔

"کیا بات ہے شہزاد"

"چلتی ہو یا نہیں؟"

"چلتی ہوں"

شہزاد کے تیور ہی ایسے تھے کہ وہ ڈر گئی' شہزاد اسے لے کر ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔

"آج تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا" شہزاد نے بیٹھتے ہی کہا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"غزالہ نے میدان خالی کر دیا ہے۔ وہ خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ میں اسے طلاق دینے والا ہوں۔ اس کے بعد تم مجھ سے شادی کرو گی۔" شہزاد نے ایک ہی سانس

یں سب کچھ کہہ دیا۔

یاسمین سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی پتیاں کئی مرتبہ کپکپائیں لیکن وہ کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو یاسمین؟"

"یہ خیال دل سے نکال دو"

کیوں نکال دوں یہ خیال دل سے۔ میں اپنی جان دے دوں گا یا تمہاری جان لے اوں گا لیکن یہ خیال دل سے نہیں نکال سکتا۔

تمہیں معلوم ہے؟ معلوم ہے تمہیں" اس نے بے وفائی کی ہے"

"اور تم اس وقت کیا کر رہے ہو"

لیکن اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہوں میں تمہارا جواب سننا چاہتا ہوں۔"

"میں نے کہہ دیا' یہ خیال دل سے نکال دو"

"کیوں نکال دوں یہ خیال دل سے"

"اس لئے کہ میں شادی شدہ ہوں"

"کیا! شہزاد گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا "نہیں .... یاسمین نہیں۔ تم مذاق کر رہی ہو امتحان لے رہی ہو میرا۔"

"نہیں شہزاد یہ حقیقت ہے"

"تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں۔ مجھے کیوں آسرے میں رکھا۔ یہ جرم تم نے کیوں کیا؟"

"سنو شہزاد' حقیقت یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کالج کے زمانے سے میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن تم نے کبھی اظہار کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب جو تم ملے اور میری طرف جھکتے چلے گئے تو یہ سب کچھ مجھے اچھا لگا۔

"میرے شوہر سے میرے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ وہ شراب کا عادی ہے ئی کئی دن گھر نہیں آتا۔ جب آتا ہے میرا کوئی نہ کوئی زیور لے کر چلا جاتا ہے۔ میں ورت ہوں اس لئے سب کچھ برداشت کرتی ہوں تم ملے اور اپنائیت کا اظہار کیا تو میرے دل میں بے ایمانی آ گئی میں نے سوچا' میں اپنے شوہر سے طلاق لے کر تم سے

شادی کرلوں گی' اس لئے میں نے تمہیں یہ بتایا کہ میری شادی نہیں ہوئی۔

"شہزاد' میں اپنے شوہر کو سخت ناپسند کرتی ہوں لیکن میں یہ ہمت نہیں کر سکی کہ اس سے طلاق حاصل کرتی۔ مجھے معاف کر دینا' میں ایسا نہیں کر سکتی۔ ایسا نہیں کر سکتی تم بھی غزالہ کو طلاق مت دینا۔"

شہزاد نے یاسمین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے سامنے کوئی ماورائی مخلوق بیٹھی ہے۔ وہ ابھی اٹھے گی اور اس کا گلا دبا دے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے تحاشا بھاگتا ہوا ہوٹل کے فیملی روم سے باہر نکل آیا اس نے اپنے پیچھے یاسمین کی آواز سنی۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ اسے رکنے کے لئے کہہ رہی تھی۔

یاسمین کا طلسم ٹوٹتے ہی اسے غزالہ کا خیال آیا۔ میں اسے ہرگز طلاق نہیں دوں گا' میں نے اسے طلاق دے دی تو میری بچی کا کیا ہوگا اس نے گاڑی کا رخ غزالہ کے بھائی کے گھر کی طرف کردیا۔

غزالہ کا بھائی گھر پر ہی تھا۔ ابھی غزالہ کو آئے ایک دن بھی نہیں گزرا تھا اس کے زخم بھی تازہ تھے اور غصہ بھی۔ غزالہ کا بھائی بھی سخت غصے میں تھا۔ شہزاد کو اپنے گھر میں دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔

شہزاد یہ سمجھ رہا تھا کہ غزالہ کا بھائی اس کا سالا ہے۔ اس کے ساتھ عزت سے پیش آئے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ غزالہ کا بھائی اس کی کوئی بات سننے پر تیار ہی نہیں تھا۔ اس کا بس ایک مطالبہ تھا کہ وہ غزالہ کو طلاق دے دے۔ آج سے پہلے وہ خود اس مطالبے کے حق میں تھا اور موقع کی تلاش میں تھا لیکن یاسمین کے جواب کے بعد اس نے اپنی رائے بدل دی تھی اس نے صاف انکار کر دیا کہ قیامت گزر جائے مگر وہ طلاق نہیں دے گا۔

"عدالت کے دروازے بند نہیں ہو گئے ہیں۔" اس کے سالے نے کہا۔

"تو پھر بات عدالت ہی میں ہوگی"

"اس سے پہلے میں تمہیں وہ سبق پڑھاؤں گا کہ تم یاد کرو گے۔"

"برسنے والے گرجتے نہیں ہیں"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے میری تم سے کھلی دشمنی ہے"

شہزاد رضا امیدیں لے کر گیا تھا حسرتیں لے کر واپس آ گیا اس کے کانوں میں ابھی تک اپنے سالے کی دھمکی گونج رہی تھی اس نے کہا تھا میں تمہیں وہ سبق پڑھاؤں گا کہ تم یاد کرو گے یہ محض دھمکی نہیں ہو سکتی تھی اسے غزالہ کے بھائی کے لمبے ہاتھوں کا اندازہ تھا ایک ہفتے بعد ہی اسے اس دھمکی کی پہلی قسط موصول ہو گئی اسے نوکری سے جواب مل گیا۔ کمپنی کے مالکان میں سے ایک اس کے سالے کا دوست تھا اس کی سفارش پر اسے پروموشن ملا تھا اس کی سفارش پر اسے نوکری سے نکال دیا گیا= اس پر الزام بھی ایسے لگائے گئے تھے جو مالی فائدے اسے حاصل ہو سکتے تھے۔ وہ بھی ضبط ہو گئے وہ خالی ہاتھ دفتر سے نکلا تو مس موہنی کے سوا کوئی اداس نہیں تھا۔ گھر پہنچا تو اس کی ملازمہ نے بھی ہاتھ جوڑ لئے۔

"صاحب جی، آپ اکیلے رہ گئے ہیں اس لئے میں یہاں نوکری نہیں کر سکتی۔ دنیا کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا"

"ٹھیک ہے تم بھی چلی جاؤ"

"اگر ایک مہینے کی تنخواہ انعام میں مل جاتی"

شہزاد نے اسے ایک مہینہ کی تنخواہ دے دی اور ملازمہ رخصت ہو گئی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد اسے اپنی حالت پر خود ترس آنے لگا اس نے تو کبھی چائے تک نہیں بنائی تھی رات آئی تو اتنے بڑے گھر سے اسے خوف آنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اسے اپنی بیٹی نائلہ یاد آ رہی تھی غزالہ کیسی بھی تھی اس کی وجہ سے نائلہ تو اس کے پاس تھی۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ تو لیتا تھا اس کا جی چاہا، اسی وقت جائے اور نائلہ کو غزالہ سے چھین کر لے آئے لیکن پھر اسے اپنی بے عزتی یاد آ گئی یہ اس کے وقار کے منافی ہے کہ وہ اس توہین کے باوجود اس دروازے پر جائے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں غزالہ خود میرے قدموں میں گر کر مجھ سے معافی مانگے گی۔ اگر وہ نہیں آئی تو میں عدالت سے اپنی بیٹی کو مانگوں گا۔ اس کے بھائی نے میرے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کی ہے، میرا رزق مجھ سے چھینا ہے اور میں ان لوگوں سے شرافت سے بات کروں؟ "

میری شرافت انہیں اور شیر بنا دے گی۔ وہ تمام رات اپنے آپ سے لڑتا رہا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس کے اعصاب اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے آہستہ آہستہ وہ اس ماحول کا عادی ہونے لگا۔

اب اس نے ایک اور کمپنی میں ملازمت کرلی تھی یہ ملازمت اتنی شاندار تو نہیں تھی لیکن ایسی ضرور تھی کہ وہ ایک باعزت زندگی گزار سکتا تھا۔

دو چار مہینے بعد اس نے اتنی رقم جمع کرلی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو حاصل کرنے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ اپنی گاڑی بھی بیچ دے گا۔

ابھی وہ یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ غزالہ نے اسے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت کا رخ کرلیا۔ شہزاد کو عدالت میں پیش ہونا پڑا۔

پہلی پیشی پر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ غزالہ کی طرف سے یاسمین بطور وکیل پیش ہوئی۔ اسے دیکھ کر شہزاد کو یقین ہو گیا کہ وہ مقدمہ ہار جائے گا۔ عورتوں کے بارے میں یاسمین کے جو خیالات تھے اور عورتوں کے حق میں وہ جو مہم چلا رہی تھی اس سے اس کی جانب داری ظاہر تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ شہزاد کے خیالات اور حالات سے بخوبی واقف تھی۔ اس کی کمزوریوں کو جانتی تھی یاسمین نے پہلے دن جو سوالات اس سے کئے وہ بھی ایسے چبھے ہوئے تھے کہ شہزاد لاجواب ہو کر رہ گیا دوسری پیشی پر پھر اس نے سوالات کے ذریعے شہزاد کے خیالات سے عدالت کو آگاہ کیا تیسری پیشی پر شہزاد کے وکیل نے غزالہ سے بحث کی ایسی باتیں سامنے آئیں کہ یاسمین کا سحر ٹوٹتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے وکیل نے غزالہ کے معاشقے کو بھی بحث کا حصہ بنا لیا اختر اور ملازمہ بھی پیش ہوئے جواب میں غزالہ نے بھی شہزاد پر الزام لگایا کہ وہ کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا تھا اس لئے اس پر ظلم کرتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس موقع پر شہزاد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا ثبوت اسی عدالت میں موجود تھا۔ وہ لڑکی خود یاسمین تھی۔ اگر یاسمین خود ثبوت کے طور پر پیش ہو گئی تو کیا ہوگا لیکن عورت پھر عورت ہوتی ہے وہ صرف اتنا کہہ سکی کہ شہزاد اتنا ہوشیار تھا کہ اس نے کوئی ثبوت غزالہ کے حوالے نہیں کیا۔

چند پیشیوں کے بعد یاسمین نے یہ کہہ کر تقریر کی کہ شاید اسی تقریر پر مقدمے کا

فیصلہ ہو جائے۔

"مسٹر شہزاد رضا سے سوالات کرنے اور اپنی موکلہ کے بیانات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مظلوم صرف عورتیں ہی نہیں ہوتیں' ظلم مردوں پر بھی ہو سکتا ہے وہ بھی مظلوم ہوسکتے ہیں۔ میری موکلہ اس اعتبار سے تو مظلوم ہے کہ اس پر ظلم ہوا لیکن یہ ظلم خود اس نے اپنے اوپر کیا اس کو ایک اچھا شوہر ملا تھا لیکن اس نے اس کی قدر نہیں کی۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ وہ ایک اور مرد کی محبت میں مبتلا بھی ہو گئی اور پھر خود ہی گھر چھوڑ کر بھی چلی گئی اس نے اتنی مشکلات تو اٹھالیں لیکن یہ آسان کام نہیں کر سکی کہ اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے اپنے مزاج کو تبدیل کر لیتی۔

"یہ عجیب بات ہے کہ میں اپنی موکلہ کے خلاف بات کر رہی ہوں لیکن کیا کروں' انصاف کا تقاضا یہی ہے اب میں مسٹر شہزاد رضا سے درخواست کروں گی کہ وہ میری ذاتی درخواست پر اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ ایسی بیوی کو اپنانے سے کیا فائدہ جو شوہر کے لئے اپنی محبت کو بھی قربان نہ کر سکے"

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ ایسا وکیل کسی نے آج تک نہیں دیکھا تھا جو اپنے ہی موکل کے خلاف دلائل دینے لگے۔

شہزاد نے یاسمین کی درخواست پر غزالہ کو طلاق دے دی۔

عدالت نے فیصلہ دیا کہ بچی اپنی ماں کے پاس رہے گی لیکن شہزاد رضا جب چاہیں گے اپنی بیٹی سے مل سکیں گے اور ہفتے میں دو دن کے لئے اسے اپنے پاس بھی رکھ سکیں گے۔



"تم اچھی عورتوں کی طرف دار ہو اور پھر میری وکیل ہو کر مجھ ہی کو تم نے عدالت میں رسوا کر دیا۔ میرا دفاع کرنے کے بجائے میری ہی غلطیوں کا ڈھنڈورا پیٹ ڈالا۔" فیصلے کے بعد غزالہ نے یاسمین سے شکایت کی۔

"یہ بھی میرا ایک حربہ تھا۔ وہ تمہیں کبھی طلاق نہ دیتا۔ میں نے تمہارے خلاف بات کر کے اس کے دل میں جگہ بنائی اور وہ طلاق دینے پر تیار ہو گیا۔ مقدمہ تو ہم ہی جیتے ہیں۔ طلاق چاہیئے تھی سو مل گئی" یاسمین نے کہا۔



دوسرے دن شہزاد' یاسمین کے دفتر میں بیٹھا ہوا اسے مبارکباد دے رہا تھا۔

"یاسمین اب ایک مقدمہ مجھے بھی لڑنے دو۔ میری درخواست پر اگر تم اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر دو تو میں اب بھی تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔"

"عورت اسی لئے تو مظلوم ہے شہزاد۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی بعض اوقات کسی کو نہیں چاہ سکتی۔ مجھے مجبور مت کرو تم نے غزالہ کے براہ راست پر آنے کا انتظار نہیں کیا لیکن میں اپنے شوہر کے راہ راست پر آنے کا انتظار کروں گی۔ عورت اسی لئے مظلوم ہے"

"نہیں یاسمین' نہیں" تم مظلوم نہیں' عظیم ہو۔ مظلوم تو وہ ہوتے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں اسی لئے میں کہتا ہوں' مظلوم تو مرد ہوتے ہیں اسی لئے کہ وہ عورت کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔ وہ اگر ظلم بھی کرتے ہیں تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے۔"

وہ شہزاد کو رخصت کرنے کے لئے دروازے تک آئی۔ شہزاد نے جونہی کمرے سے باہر قدم رکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاید عورت ہی مظلوم ہوتی ہے' شاید دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں۔ شاید دونوں ہی مظلوم نہیں ہوتے۔ دونوں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں مظلوم کوئی بھی نہیں ہوتا۔



اعتراف

وہ برسوں سے اپنے فلیٹ کے ایک کمرے میں اکیلا پڑا ہوا تھا لیکن اس کا خیال تھا وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ارد گرد بکھرے ہوئے مجسّمے اس کا خاندان ہے جن کے درمیان وہ نہایت مکمل زندگی گزار رہا ہے سب سے شاندار مجسمہ ایک عورت کا تھا جسے وہ اپنی بیوی کہتا تھا تینوں وقت اس کے سامنے کھانا رکھتا تھا اور اس کا حصہ بھی خود کھا کر اس کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ رات کو اسی کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی نیند پوری کر لیا کرتا تھا۔ اس کے فلیٹ میں بچوں کا مجسمہ کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بچے اسے پسند نہیں تھے بلکہ اس کا کہنا یہ تھا کہ بچے تو خود تراشیدہ مجسّمے ہوتے ہیں۔ ان کا مجسمہ کوئی کیسے بنائے۔ بچوں کے چہروں پر جو ایک معصومیت ہوتی ہے' اسے کوئی کیسے ابھارے یہ کام چھینی' ہتھوڑوں کے بس کا ہے ہی نہیں۔ فنکار تو فطرت کے حسن کو اور زیادہ حسین بنا دیتا ہے بچوں کا حسن اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ مختلف کمروں میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے مجسّمے تھے جنہیں وہ اپنے دوست کہتا تھا اور آنے جانے والوں سے ان کا تعارف کراتا تھا یہ ہیں مسٹر ایڈیسن مجھے ایک ہل اسٹیشن پر ملے تھے۔ بڑے دلچسپ اور فن کے قدردان تھے میرے فن سے متاثر ہوئے اور مجھے داد دینے میرے گھر بھی آئے تھے یہ ہے بشیر سبزی والا اس کی آواز میں ایسا جادو تھا کہ جب وہ آواز لگاتا تھا' عورتیں اس کے ٹھیلے کے ارد گرد جمع ہو جاتی تھیں کسی نے اس بے چارے کو قتل کر دیا میرا بڑا پکا دوست تھا۔ سبزی مفت دے جایا کرتا تھا۔ یہ ہے زبیدہ' میرے گھر کام کرنے آتی تھی اور اپنی دانست میں مجھ سے عشق کرنے لگی تھی۔ زہر کھا لیا میری خاطر بے چاری نے اور انہیں تو آپ جانتے ہی ہوں گے' مشہور شاعر ہیں۔ مجھ سے ملنے اکثر آتے ہیں

مجھ پر نظم بھی لکھی ہے انہوں نے۔

ہر مجسمے کی ایک کہانی تھی جسے وہ سینکڑوں مرتبہ دہرا چکا تھا ان کہانیوں میں کتنی سچائی تھی، اس کا یقین کسی کو بھی نہیں تھا لیکن اس کی فنکاری کے قائل سب تھے وہ ایک ماہر مجسمہ ساز تھا پتھر اس کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی موم ہو جاتا تھا پھر وہ اپنے اوزار ان پتھروں پر اس چابک دستی سے چلاتا جیسے کوئی مصنف کسی کی سوانح حیات تخلیق کر رہا ہو وہ خدا نہیں تھا ورنہ اس کے بنائے مجسموں میں روح کے علاوہ سب کچھ ہو تا تھا۔

ایسا ماہر سنگ تراش ہونے کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی رنگینی، کوئی خوش حالی نہیں تھی پورے کپڑے وہ صرف اس وقت پہنتا تھا جب کوئی اس سے ملنے آتا تھا کھانے پینے کا حال بھی یہی تھا وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتا تھا اس سے ملنے والوں کا خیال تھا کہ وہ شراب پیتا ہے لیکن اسے پیتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ شاید چھپ کر پیتا ہو گا کیونکہ مہمان نوازی کا وہ قائل نہیں تھا۔

اس کی اس قدر مفلسی میں اس کا قصور بھی تھا، فن کے قدر دانوں کا بھی۔ اس نے پیشہ ہی ایسا اختیار کیا تھا جس کے قدردان انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ جو قدردان تھے وہ بھی اس کی بدمزاجی سے گھبرا کر بھاگ جاتے تھے۔

وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گیا تھا لیکن اس کی عمر سے زیادہ اس کے بال سفید تھے اس کی صحت بھی کچھ ایسی قابل رشک نہیں تھی لیکن ایسی ضرور تھی کہ کسی کا سہارا لئے بغیر اپنے کام کر سکے اور اپنے کام کرنے کے لئے اس کے پاس وقت ہی کتنا بچتا تھا مجسمہ سازی کوئی ایسا فن نہیں ہے جو گھنٹے دو گھنٹے کا کھیل ہو بعض اوقات وہ چوبیس چوبیس گھنٹے اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔

آج کل اس کے پاس کام بہت تھا جب اس کے پاس کام کم آتا تھا، وہ گھٹنوں میں سر دے کر سوچا کرتا تھا اس وقت بھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا ایک نہایت خوب صورت لڑکی فلیٹ کے کھلے ہوئے دروازے پر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ بوڑھے مجسمہ ساز کا جی چاہا کہ نہ صرف اسے اندر آنے کی اجازت دے بلکہ دوڑ کر دروازہ بھی بند کر لے تاکہ وہ جانے کی اجازت نہ طلب کر سکے لیکن پھر اس نے سوچا اتنی جلد

بازی بھی کیسی۔

"بے شک آیئے یہ سنگ تراش کا دربار ہے' حکومت کا قلعہ نہیں جہاں اجازت کی ضرورت پڑتی ہے۔"

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اندر آ گئی۔

اب مجسمہ ساز نے اسے غور سے دیکھا چاند کی کرنوں کو گلاب کی پتیوں میں حل کر کے کسی نے اس کا چہرہ بنا دیا تھا سیاہ زلفیں اس کے شانوں سے گزرتی ہوئی اس کے سینے پر پہرا دے رہی تھی۔

"آپ تنہا آئی ہیں؟"

"ہاں' کیوں' کیا بات ہے؟" لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے' اتنی حسین لڑکی کو اس طرح اکیلے نہیں گھومنا چاہیئے"

لڑکی کو بے اختیار ہنسی آ گئی بوڑھے کا جی چاہا کہ وہ بہت دیر تک ہنستی رہے۔

آپ میری فکر نہ کریں' میں نے کراٹے کی اچھی خاصی مشق کر رکھی ہے

بوڑھا اس اطلاع سے قطعی خوش نہیں ہوا۔ اس نے سوچا' مجھے کیا۔ میرے پاس تو وہ گاہک کے طور پر آئی ہوگی۔

"آپ بیٹھیں' میں ذرا لباس درست کر لوں پھر بات ہوگی"۔ بوڑھے نے کہا۔

لڑکی کو پھر ہنسی آ گئی۔ اسے تو یہ کہنا چاہیئے کہ لباس پہن لوں۔ اس کے جسم پر ہے کیا جسے وہ درست کرے گا۔ فنکاروں کی یہی باتیں تو ہوتی ہیں جو انہیں فنکار بناتی ہیں اگر وہ اتنے سادہ' ایسے معصوم نہ ہوں تو عام دنیا دار آدمی اور ان میں فرق کیا رہ جائے۔

بوڑھے کو کپڑے بدلتے ہوئے لڑکی کا خیال آ گیا۔ یہ لڑکی ہنستی بہت ہے۔ ہنسنے والے لوگ بہت کھلے دل کے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر عورتیں ایسی عورتیں عشق کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں۔ کیا خبر اس نئے معاشقے کے لئے کوئی راستہ نکل آئے۔

وہ کپڑے پہن کر آیا تو لڑکی ایک ایک مجسمے کو غور سے دیکھتی پھر رہی تھی اور بوڑھا اس چلتے پھرتے مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔

"اوہ' آپ آ گئے"

"ہاں' اب فرمائیے؟"

"میرا نام فردوس ہے' مجھے ایک مجسمہ بنوانا ہے"

"پہلے میں اپنے دوستوں سے آپ کو ملوا دوں' اس کے بعد بے تکلفی سے باتیں ہوں گی۔"

فردوس حیران تھی کہ اس اکیلے فلیٹ میں اس کے دوست کہاں سے آ گئے لیکن جب بوڑھے نے کہا "یہ ہیں مسٹر ایڈیسن ...." تو ہر بات اس کی سمجھ میں گئی۔ اسے یہ ملاقاتیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئیں۔ بوڑھا بڑی گرم جوشی سے ایک ایک مجسمے کے بارے میں اسے بتا رہا تھا لیکن جب اس نے کہا "یہ ہے میری بیوی زرینہ" تو فردوس سے نہ رہا گیا۔

"لوگ کہتے ہیں' آپ نے شادی نہیں کی ہے"

"بکتے ہیں لوگ۔ میری بیوی تمہارے سامنے ہے پھر بھی تمہیں شک ہے"

فردوس کو یقین آنے لگا کہ وہ نہ صرف اچھا فنکار ہے بلکہ ایک اچھا خطبی بھی ہے۔ اس نے سنا تو تھا کہ وہ کچھ کچھ کھسکا ہوا ہے لیکن اسے یقین نہیں تھا۔

"اب یہی دیکھ لو۔ لوگ کہتے ہیں میں تنہا رہتا ہوں لیکن کتنے دوست میرے ساتھ ہیں اور مجھ پر ایسے فدا ہیں کہ اپنے گھر بار چھوڑ کر یہیں بسیرا کر لیا ہے لوگوں کے کہنے پر نہ جائیں' آپ فرمائیں آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"میں نے کہا نا مجھے ایک مجسمہ بنوانا ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے بنائے ہوئے مجسموں کی قیمت آپ کو معلوم ہے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ جو قیمت آپ کہیں گے میں ادا کروں گی۔"

"بہت پیسے ہیں آپ کے پاس؟" بوڑھے نے گہری نظروں سے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو نہیں لیکن میرے پاپا کے پاس بہت پیسے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مجھے کسی کی دولت سے کیا سروکار یہ بتاؤ' کس کا مجسمہ بنانا ہے"

"ابلیس کا" فردوس نے کہا۔

"ابلیس کا" بوڑھے کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل کر بڑی ہو گئیں "تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں' میں دو سو میل کا سفر طے کر کے' آپ کا پتا پوچھتی ہوئی آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آپ سے مذاق کروں۔ اس عظیم فنکار سے مذاق کروں جو اس دور کا آذر کہلاتا ہے جس کے ہاتھوں میں پتھر' موم بن جاتا ہے۔

"لیکن .... لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں۔"

"میرا مطلب ہے ابلیس کا مجسمہ' نہیں' یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے' بڑے فنکار نخرے کرتے ہیں لیکن مجھے یہ مجسمہ ہر قیمت پر چاہئے"۔

"یہ آپ کو سوجھی کیا ہے؟"

"آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔ آپ کو تو صرف مجسمہ بنانا ہے۔"

بوڑھے کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ وہ سخت اذیت میں مبتلا تھا ایسی عجیب و غریب فرمائش پہلی مرتبہ اس سے کسی نے کی تھی۔

"آپ کے تخیل' آپ کے ہنر' آپ کی چابک دستی پر تو لوگ خدا کی طرح یقین کرتے ہی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں' میں یوں ہی آپ تک پہنچ گئی ہوں۔ میں نے جس سے بھی پوچھا' اس نے مجھے آپ ہی کا پتا بتایا۔ اب آپ ہی مجھے مایوس کر رہے ہیں جبکہ میں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

بوڑھا سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اب ایک ہی ترکیب تھی اس بلا کو سر سے ٹالنے کی۔

"آپ خود سوچیں' میں نے کبھی ابلیس کو دیکھا ہی نہیں تو اس کا مجسمہ کیسے بنا سکتا ہوں۔ ابلیس تو ابلیس میں نے اس سے ملتا جلتا کوئی آدمی بھی آج تک نہیں دیکھا۔"

"آپ اپنے تخیل میں اسے جس طرح محسوس کر سکتے ہیں اسے پتھر میں منتقل کر دیں۔"

"یہ کام شاعروں کا ہے' میرا نہیں' میں جو دیکھتا ہوں اسے پتھر میں منتقل کرتا ہوں۔ آپ تخیل چاہتی ہیں تو کسی شاعر سے نظم کہلوا لیں۔"

"تو آپ نہیں بنائیں گے"

"آپ ابلیس کو میرے سامنے لے آیئے' میں مجسمہ بنا دوں گا۔"

میں نے آپ کو ڈھونڈ لیا' ابلیس کو کہاں پر ڈھونڈوں۔

"میں بھی آپ کا مجسمہ بنا سکتا ہوں' ابلیس کا کیسے بناؤں؟"

"پھر آپ میں اور ایک عام مجسمہ ساز میں فرق کیا ہوا؟"

"فرق یہ ہے کہ میں ابلیس کی سیرت اس کی صورت پر کندہ کر دوں گا۔ دوسرا فنکار یہ نہیں کر سکتا لیکن صورت تو میرے سامنے لاؤ کم از کم حلیہ ہی مجھے بتا دو۔"

"ہاں' یہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کوئی کتاب اس سلسلے میں کچھ کہہ سکتی ہو۔"

لڑکی نے ایک لفافے میں کچھ پیسے رکھے اور لفافہ بوڑھے کے آگے رکھ کر اٹھ گئی۔

"جب تک میں تحقیق نہیں کر لیتی' اس رقم کو ایڈوانس سمجھ کر قبول کر لیجئے۔

"اگر آپ کامیاب نہیں ہوئیں تو میں اتنی رقم کہاں سے لوٹاؤں گا۔"

"یہ میری کوتاہی ہوگی۔ اگر میں نہیں آتی تو آپ بری الذمہ ہوں گے" فردوس نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

بوڑھے کا بہت جی چاہا کہ اسے روک لے شاید وہ ایسا کرتا بھی لیکن اس وقت تو وہ خود یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ یہاں سے چلی جائے۔ اس نے شکر بھیجا اور اپنی بیوی کے مجسمے سے اس لڑکی کی شکایتیں کرنے بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن برابر سوچ رہا تھا ایسی عجیب و غریب فرمائش آج تک کسی نے نہیں کی تھی وہ لڑکی ابلیس کا مجسمہ کیوں بنوانا چاہتی ہے۔ کہیں وہ مجھے ابلیس کہنے تو نہیں آئی تھی۔ میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کون؟؟"

فردوس کا باپ' دن رات اپنے تجربات میں مگن رہنے والا پروفیسر تھا۔ وہ آج تک کوئی قابل ذکر چیز ایجاد تو نہیں کر سکا تھا لیکن سائنسی تجربات میں ہمہ وقت مصروف

رہتا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ ایک دن اس کے تجربات دنیا میں انقلاب برپا کر دیں گے اس کے اس شوق نے اس کی گھریلو زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ اگر خاندانی جائیداد نہ ہوتی تو فاقوں کی نوبت آ چکی ہوتی۔ اس کی بیوی اسی صدمے سے گھل گھل مر گئی تھی۔ اسد کے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ بیوی سے لڑ سکے لیبارٹری کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہتا۔ وہ بے چاری شور مچا مچا کر تھک جاتی۔

فردوس اپنے باپ کی قابلیت کی معترف تھی لیکن اپنی ماں کی زبانی وہ یہی سنتی چلی آئی تھی کہ اس کا باپ انسان نہیں شیطان ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی اور اس لفظ کے مفہوم سے واقف نہیں تھی اس وقت تو اس نے قطعی توجہ نہیں دی لیکن جوں جوں وہ ہوش سنبھالتی گئی اسے اپنے باپ سے نفرت ہوتی چلی گئی اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ شیطان سے دور رہو لہٰذا وہ کوشش کرتی کہ باپ کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔ پھر کچھ اور عمر بڑھی تو اسے اپنے خیالات پر غصہ آنے لگا۔ بھلا اس کا باپ شیطان کیسے ہو سکتا ہے؟ ماں تو غلط کہتی ہے۔ اس نے اپنی ماں کی غلطی تو پکڑ لی لیکن محبت سے محروم اس بچی کی نفسیات میں یہ عجیب بات پیدا ہو گئی کہ نفرت انگیز چیزوں میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے باپ کو نفرت اور خوف کا مجسمہ سمجھتی ہے اور اس کے باوجود اس سے محبت کرنے پر مجبور ہے اس کے کھلونوں میں کریہہ المنظر مورتیوں کی بہتات تھی خوفناک تصویریں' ڈراؤنے مناظر' دل دہلا دینے والی فلمیں اس کے پسندیدہ مشغلے تھے۔

کچھ دن سے اس پر یہ دھن سوار ہو گئی کہ جس نے تمام دنیا کو برائیوں میں مبتلا کر کے بدصورتی میں اضافہ کیا ہے وہ خود کیسا ہو گا۔ اسے مجسم کر کے وہ اپنے بیڈروم میں رکھے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ بوڑھے مجسمہ ساز کے پاس گئی تھی لیکن اب سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ بوڑھا کہتا تو ٹھیک ہی ہے جس کو کسی نے دیکھا ہی نہ ہو' اس کا مجسمہ کیسے بن سکتا ہے لیکن وہ اپنے ارادے سے باز بھی نہیں آ سکتی تھی۔ تصویر نہیں تو حلیہ تو کہیں مل ہی سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے مکتب خانوں کی خاک چھاننا شروع کر دی صبح سے شام تک کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہتی جب کتب خانوں سے اکتا گئی تو گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئی مدت دراز کے بعد عقدہ کھلا تو

صرف یہ کہ ابلیس کی شباہت کا معمولی سا عکس بھی کسی نے بیان نہیں کیا۔ اس کی سرشت میں وہ بدی بھی کہیں نظر نہیں آئی جن برائیوں کا مجموعہ خود حضرت انسان ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ابلیس ان برائیوں کا ذمے دار ہے اس لئے ان سب سے بدصورت وہ خود ہوگا لیکن کیسا ہوگا' یہ کون بتائے گا؟"

ابلیس سے اتنی واقفیت کے بعد وہ یہ سوچنے لگی کہ جو اتنے لوگوں کو بہکا سکتا ہے' وہ کیسا فاضل و عالم ہوگا مگر وہ ہے کہاں؟ اس سوال کا جواب اس کے کیا کسی کے پاس بھی نہیں تھا لیکن ایک خاکہ اس کے ذہن میں ضرور بن چکا تھا جس میں رنگ بھرنے کی دیر تھی۔

لیکن یہ کوئی تصویر تو تھی نہیں کہ بیٹھتی اور برش پھیر دیتی وہ تو ہوا کو آنکھوں سے دیکھنے پر بضد تھی۔ اس بے مصرف شغل میں آنکھوں کی دکھن کے علاوہ کیا حاصل ہوتا صبح گھر سے نکل جاتی ایک ایک چہرے میں خباثت کے نشان ڈھونڈتی پھرتی۔ ہر چہرہ اس کے معیار سے کم برا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ مایوس ہوتی چلی گئی انسانوں کے ہجوم میں اسے ایک بھی ابلیس نہیں مل سکا۔

یونیورسٹی کی چھٹیاں ختم ہونے میں پندرہ دن باقی رہ گئے تھے پوری چھٹیاں سخت تناؤ کی حالت میں گزری تھیں اس کی کیفیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں لیکن انہیں خود بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کیا تلاش کر رہے ہیں بس پاگل ہونے میں کچھ ہی فاصلہ رہ جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ جب کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ ہو۔ باپ کو فرصت نہیں تھی گھر میں کوئی اور تھا نہیں۔ ایک آدھ دوست سے تذکرہ کیا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ مشورہ دینے کے بجائے لوگ اس پر ہنستے ہیں تو اس نے کسی سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔

اب یونیورسٹی کھلنے والی تھی تو اس نے سوچا' کچھ دنوں کے لئے سب کچھ بھول بھال کر کسی تفریحی مقام پر چلی جائے لیکن تفریحی مقامات اسے کم ہی بہلاتے تھے اس وقت تو اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اس کا دل بہل سکے تفریحی مقامات تو خوبصورتی کا پیکر ہوتے ہیں جبکہ وہ بدصورتی کی دل دادہ تھی یہ اس کی عجیب و غریب سی عادت تھی مگر تھی ایسے موقعوں پر اسے اپنی ایک دور کی رشتے دار یاد آتی تھیں جنہیں

سب قیامت خالہ کہتے تھے۔ وہ تھیں بھی قیامت کی بنی ہوئی جس کے پیچھے پڑ جاتیں' اسے بان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ ہوا سے لڑتی تھیں اور ایسی بدزبان کہ گالیوں کے علاوہ کوئی زبان سیکھی ہی نہیں تھی۔ صورت بھی ایسی پائی تھی کہ جو دیکھے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اسی لئے خاندان میں کوئی بھی ان سے ملنے کا روادار نہیں تھا۔ ایک فردوس تھی جو کبھی کبھی ان کے یہاں رہنے چلی جاتی تھی۔ ان کی بیٹی سلمیٰ سے بھی اس کی بڑی دوستی تھی وہ دوسرے شہر میں رہتی تھیں ورنہ فردوس تو شاید ان کے ساتھ ہی رہنے لگتی۔ اسے خود حیرت ہو رہی تھی کہ پوری چھٹیاں گزار دیں اور اسے خالہ کا خیال نہیں آیا۔ اب بھی پندہ دن باقی ہیں خوب مزہ آئے گا اس نے اجازت اور پیسے لینے کے لئے لیبارٹری کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

"کیا ہے' کیوں پریشان کر رہی ہو۔ جانتیں نہیں میں کتنے اہم کام میں مصروف ہوں اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو کوئی کسی کو بہکا نہیں سکے گا۔ شیطان بھی نہیں' اس کے باپ نے لیبارٹری کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

پہلی مرتبہ اس کے باپ نے اس کے مطلب کی بات کی تھی' وہ بھی ان دنوں ابلیس کو گرفتار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کا باپ بھی شاید اس موضوع پر سوچ رہا تھا لیکن اس وقت وہ کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"پاپا' میں خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔"

"اسی قیامت کے گھر؟"

"مجھے پیسے بھی تو چاہئے ہیں"

"خود چیک لکھ لو' میں دستخط کر دوں گا"

فردوس نے رقم نکلوائی ' چند جوڑے کپڑے ساتھ لئے اور خالہ کے گھر روانہ ہو گئی اس نے جان بوجھ کر ایسی گاڑی کا انتخاب کیا تھا کہ وہ خالہ کے گھر رات کے وقت پہنچے اندھیری راتیں خوف بھری سیاہی کی وجہ سے اسے بہت مرغوب تھیں اور پھر اس کی خالہ جس علاقے میں رہتی تھیں وہ شہر سے دور ایک ایسی جگہ واقع تھا۔ جہاں تین اطراف میں اونچے پہاڑ تھے جو رات کے وقت بڑا بھیانک منظر پیش کرتے تھے۔

رات کے کسی پہر میں وہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر اتری۔

اس کے علاوہ دو مسافر اور تھے جو اس اسٹیشن پر اتر تھے وہ ایسے ماحول سے دلچسپی ضرور رکھتی تھی لیکن اس وقت اس پر خوف غالب آرہا تھا۔ ان دو مسافروں سے اس کی کچھ ہمت بندھی ہوئی تھی لیکن وہ دونوں اندھیرے میں اس طرح گم ہو گئے جیسے برائی' برائی میں جذب ہو جاتی ہے اس نے کانپتے ہاتھوں سے سفری بیگ اٹھایا اور اسٹیشن سے باہر نکل آئی اسے امید نہیں تھی کہ اس وقت کوئی سواری ملے گی لیکن اسے خوش گوار حیرت ہوئی جب اس نے اسٹیشن سے باہر ایک تانگا کھڑا دیکھا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک آدمی نے چھلانگ لگائی۔

"آپ اکیلی ہیں؟"

اس کا یہ سوال عجیب سا تھا لیکن فردوس کے پاس اس کا جواب اثبات میں دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"کہاں جائیں گی؟" پہلے سوال کے بعد اس نے فورا دوسرا سوال کر دیا۔

فردوس نے اچٹتی سی نظر تانگے والے پر ڈالی اس کا چہرہ سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا لیکن ہاتھ پیروں سے وہ ایک جوان آدمی معلوم ہوتا تھا وہ اس کے تانگے میں کبھی نہیں بیٹھتی لیکن اس کے سامنے اور کوئی نعم البدل بھی نہیں تھا۔ اس کا سفری بیگ تانگے میں رکھا جا چکا تھا اس نے بھی ہمت کی اور تانگے میں بیٹھ گئی۔

کسی خود کار مشین کی طرح تانگے والا اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنی نشست سنبھال لی۔ یہ تو اس نے بعد میں پوچھا کہ فردوس کو جانا کہاں ہے۔

فردوس کا خوف تانگے میں بیٹھنے تک تھا۔ جوں ہی گھوڑے نے قدم اٹھایا' وہ مطمئن ہو گئی سڑکوں پر بلب روشن تھے اکا دکا دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ یہ صورت حال اس کے لئے اچھی خاصی ہمت افزا تھی لیکن اب وہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ اس نے اس سفر کے لئے تانگے کا انتخاب کیوں کیا۔ ٹیکسی کر لیتی تو فاصلہ جلدی طے ہو جاتا۔ انتظار ہی تو کرنا تھا کوئی نہ کوئی ٹیکسی آ ہی جاتی۔ وہ پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ تانگے والا اس وقت تک بہت باتونی معلوم ہو رہا تھا' جب تک وہ تانگے میں بیٹھی نہیں تھی لیکن اب وہ بالکل خاموش تھا۔ گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کی خاموشی کو توڑ رہی تھیں کچھ دیر بعد یہ پراسرار خاموشی اسے کھلنے لگی وہ اتنی دیر خاموش رہنے والی کہاں تھی

لیکن ایک اجنبی سے بات بھی کیا کرتی' چپ سادھے بیٹھی رہی۔

اب تانگا شہر کی حدود چھوڑ رہا تھا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا گھوڑے کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔

کئی اونچی نیچی سڑک سے گزرنے کے بعد وہ مقام آ گیا جہاں اسے جانا تھا۔

"بس تانگے والے۔ یہ جو بڑا سا پھاٹک نظر آ رہا ہے ' بس یہی روک دو" فردوس نے کہا۔

تانگے والے نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور تانگا ایک جھٹکے سے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گیا گلی میں ایک خارش زدہ کتا ٹہل رہا تھا اس نے بھونکنے کی کوشش کی لیکن تانگے والے کی چابک اٹھتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

"کتنے پیسے ہوئے؟" فردوس نے سفری بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ دروازہ تو کھٹکھٹائیے۔ اگر گھر میں کوئی نہیں ہوا تو اس اندھیرے میں آپ کہاں کھڑی رہیں گی۔ شاید آپ کو واپس جانا ہو" تانگے والے نے کہا۔

اس کی بات مناسب تھی اس لئے مان لینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ فردوس نے اندھیرے میں کال بیل تلاش کی۔ سناٹے میں گھنٹی کی آواز باہر تک گونج رہی تھی تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد کسی نے اوپر کی منزل سے آواز دی۔

"انکل میں ہوں' فردوس" اس نے خالو کی آواز پہچانتے ہوئے کہا۔

"فردوس' کون فردوس؟" پوچھنے والے کی آواز میں حیرت تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اتنی رات گئے فردوس آئی ہو گی۔

"آپ کی بھانجی فردوس" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھہرو۔ میں آ رہا ہوں"

"ہاں بھئی' اب بتاؤ کتنے پیسے ہوئے' فردوس نے اس طرف سے مطمئن ہوتے ہوئے تانگے والے سے پوچھا جو اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہوا تھا۔

"آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اتنی رات گئے آپ کو بحفاظت یہاں تک پہنچا دیا' کی قیمت آپ کو معلوم ہو گی۔"

"یہ لو" فردوس نے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تانگے والے نے نوٹ لینے کے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر لگا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ تانگے والے نے ایک جھٹکے سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن اس دوران فردوس نے اپنے محسن کی ایک جھلک دیکھ لی۔ کمبل میں جلا ہوا گوشت کا ایک لوتھڑا رکھا تھا۔ فردوس کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی ۔ کیا میں اس کے ساتھ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں؟ مگر اس سے زیادہ سوچنے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ دروازہ کھلا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو تانگے والا جا چکا تھا۔ فردوس اس وقت؟ اکیلی اور بغیر اطلاع کے۔"

دروازے کے پیچھے کھڑی خالہ اور سلمٰی نے تقریباً ایک ساتھ اور ایک آواز میں کہا۔

"میں اس سے پہلے کب اطلاع دے کر آئی ہوں"

"ہاں یہ تو ہے ایک تو ہی تو ہمارے خاندان میں ہے جو ہم پر گئی ہے باقی سب دوسروں کے غلام ہیں۔"

"اب کیا یہیں کھڑی رہو گی" خالو نے کہا

"ہاں ہاں اندر آؤ۔ بہت دن بعد آئی ہے جی بھر کے باتیں کروں گی اپنی بچی سے"

اور واقعی انہوں نے رات بھر خوب جی کھول کر باتیں کیں نیند تو بڑی بات ہے' فردوس تو چین سے جاگ بھی نہیں سکی۔ خالو تو جلد ہی سو گئے البتہ خالہ اور سلمٰی کے تابڑ توڑ حملے صبح تک جاری رہے۔

دن بھر وہ رات کی نیند پوری کرتی رہی شام کو اٹھی تو تازہ دم تھی۔ سفر اور باتوں کی تھکن اتر چکی تھی تھکن اترتے ہی اسے تانگے والا یاد آ گیا اف میرے خدا! کتنی بھیانک شکل تھی اس کی وہ انسان تھا بھی؟ شاید کوئی بھوت تھا جو انسانی روپ میں اسے یہاں تک چھوڑ گیا ایسی کئی کہانیاں وہ پڑھ چکی تھی جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ مخلوق اکثر انسانوں کی شکل میں انسانوں کے ساتھ رہنے لگتی ہے وہ اس قصہ کہانی سمجھتی تھی لیکن آج اس نے ایک بھوت کو اپنے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی بھوت تھا یہ خیال آتے ہی وہ یوں کانپنے لگی جیسے برف پر بیٹھ گئی ہو۔ اگر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا

چاہتا تو؟ وہ خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی بھوت تو ہر جگہ آ جاتے ہیں کیا وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ خالہ اپنے کمرے میں تھیں وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچ گئی۔

"خالہ' مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

"سردی لگ رہی ہے؟ مگر چہرہ تو پسینے سے بھیگا ہوا ہے۔"

"اوہ میرا مطلب ہے گرمی لگ رہی ہے۔"

"پاگل باپ کے ساتھ رہتے رہتے تم بھی کھسک گئیں۔ گرمی اور سردی ساتھ ساتھ لگ رہی ہے اس گھر میں رہنے والوں کی شکلیں بری لگ رہی ہیں تو صاف کہہ دو۔ ہم برا نہیں مانیں گے۔ خاندان بھر ہمیں برا کہتا ہے' ہم برا نہیں مانتے۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتے میں لڑنا نہیں جانتی' بس اسی سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں تمہارے باوا اب پارسا بن گئے ہیں جب جوان تھے سینکڑوں مرتبہ ہمیں گالیاں سنا کر چلے گئے مجھ نگوڑی سے اس وقت بھی کچھ نہیں کیا گیا۔ تم نے مجھ سے محبت جتائی رشتے کی ہوں مگر خالہ کہا۔ میں نے بھی تمہیں سگا سمجھا یہ خیال نہیں کیا کہ کس باپ کی بیٹی ہو اب تم بیزار ہو' ہوا کرو۔ میری جوتی سے خالہ" خالہ نے اپنی عادت کے مطابق لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔

"خالہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں اگر بیزار ہوتی تو یہاں آتی کیوں؟"

"واہ بنو واہ۔ اب ہم "کیسی" باتیں کرنے لگے ہیں۔ آتو تم یوں گئیں کہ کب تک اس بڈھے کھوسٹ باپ کی شکل دیکھتی رہتیں۔"

"چلئے یوں ہی سہی لیکن آپ سے محبت تھی اسی لئے تو یہاں چلی آئی کہیں اور بھی جا سکتی تھی۔"

"ہاں' احسان ہے آپ کا ورنہ کون آتا ہے ہمارے پاس۔"

تمہارے باپ کی طرح ہم رئیس اعظم تو ہیں نہیں۔ حلال کی کمائی میں تو اتنا ہی ہو سکتا ہے"

خالہ اسی طرح بات کا بتنگڑ بناتی تھیں اس وقت بھی وہ پورے عروج پر تھیں فردوس جانتی تھی کہ لوگ انہیں خواہ مخواہ تو خالہ قیامت نہیں کہتے۔ وہ جب رنگ پر آتی ہیں تو کوئی طاقت انہیں خاموش نہیں کرا سکتی اس نے بھی اس میں عافیت سمجھی کہ

سامنے سے ہٹ جائے۔

خالہ کے گرجنے برسنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تانگے والے کا خیال دل سے نکل گیا خوف کی جو لہر اٹھی تھی' دب گئی۔

خالہ سے مایوس ہونے کے بعد سلمٰی ہی کا سہارا تھا لیکن وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ فردوس نے کچھ دیر انتظار کیا او پھر خود ہی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"کیا بوریت ہے یار۔ کب تک سوتی رہو گی" فردوس نے سلمٰی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بس اٹھ ہی رہی تھی۔"

"پہلے اٹھ جاتیں تو خالہ کی تقریر تو سننے کو نہ ملتی۔"

"کیا ہو گیا۔ دوڑ پڑا میٹر۔"

"ایسا ویسا۔ ابھی تک چل رہا ہو گا' وہ تو میں ہی تلوار کے سامنے سے ہٹ گئی۔"

"پھر بھی بتاؤ تو ہوا کیا؟"

"ہونا کیا تھا تم سو رہی تھیں۔ میری شامت آئی تھی کہ میں ان کے کمرے میں چلی گئی۔"

"ان کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔"

"پتا ہے اسی لئے تو برا نہیں لگتا"

"چلو چھوڑو۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں پھر باہر نکلتے ہیں۔"

سلمٰی تیار ہونے لگی اور تنہائی نے خیالات کی باگیں پھر رات کے واقعے کی طرف موڑ دیں۔ اسے ایک مرتبہ پھر تانگے والے کا خیال آ گیا۔

"سلمٰی! تم نے کبھی بھوت دیکھا ہے؟"

"اس وقت بھوت کہاں سے آ گیا؟"

"بتاؤ نا' دیکھا ہے بھوت؟"

"بھوت تو نہیں' البتہ بھوتنی دیکھی ہے۔"

"سچ کہاں؟"

"کل سے ہمارے گھر آئی ہوئی ہے۔ اس وقت میرے کمرے میں ہے" سلمٰی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً فردوس کی طرف تھا۔

"بکواس بند کرو۔ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں میں جس تانگے والے کے ساتھ رات آئی تھی وہ بھوت تھا۔"

"یار' میں دل کی ویسے ہی کمزور ہوں' تم اور دہلائے دے رہی ہو۔"

"ڈرنے کی بات نہیں ہے وہ کوئی نقصان پہنچانے والا بھوت نہیں تھا۔ اس نے تو مجھے ڈرایا تک نہیں تھا۔

"پھر بھی بھوت ہی ہوتا ہے۔ امی کہتی ہیں اسے یاد کرو تو وہ آ بھی جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر کو فردوس بھی ڈر گئی کہ یاد کرنے سے وہ کہیں آ ہی نہ جائے۔

"چلو کہیں چلتے ہیں۔ کچھ دل تو بہلے گا گھر میں رہیں تو تمہیں بھوت صاحب ہی یاد آتے رہیں گے۔" فردوس نے کہا۔

وہ لوٹ کر آئی تو رات ہو چکی تھی فردوس کو اندھیرا اور رات دیکھ کر پھر تانگے والے کا خیال آ گیا۔ کیا مصیبت ہے یہ تانگے والا تو میری جان سے لپٹ کر رہ گیا ہے۔

رات کو وہ سونے کے لئے لیٹی تو تانگے والا پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا وہ بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی پھر اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا اسے وہ مجسّمے والا یاد آ گیا جس سے اس نے ابلیس کا مجسمہ بنانے کو کہا تھا اسے ابلیس کی تلاش تھی ابلیس اگر ہو گا تو ایسا ہی ہو گا جیسا یہ تانگے والا ہے۔ اس کا مطلب ہے میں نے ابلیس کو تلاش کر لیا ہے اب نمونے کے لئے میں اس تانگے والے کو پیش کر سکتی ہوں یا تو وہ خوف زدہ تھی یا اب خوشی سے بے حال ہو گئی مگر اب مشکل یہ تھی کہ وہ اس تانگے والے کو کہاں تلاش کرے یہ کیا ضروری ہے کہ ہر روز وہ اسٹیشن کے سامنے کھڑا ہوتا ہو اور ہو بھی سکتا ہے لیکن اس کے لئے اسٹیشن جانا پڑے گا اور وہ بھی ایک مرتبہ نہیں بلکہ اس وقت تک جانا پڑے گا جب تک وہ مل نہیں جاتا۔ اس کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ مجسّمے والے کے پاس جانے پر رضامند ہو جائے ۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے' پہلے اسے تلاش تو کیا جائے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی اسٹیشن چلی جائے اس نے گھڑی دیکھی رات کے بارہ بج رہے تھے ظاہر ہے وہ اس وقت نہیں جا سکتی تھی۔

صبح اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور سلمیٰ کو بتائے بغیر ہی گھر سے نکل گئی۔

اسٹیشن پر کوئی گاڑی آ کر رکی تھی اسٹیشن سے باہر تانگوں اور ٹیکسیوں کی قطاریں

لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک تانگے والے کو غور سے دیکھتی رہی تھی لیکن کسی پر اسے شک بھی نہیں ہوا وہ ایسی منفرد صورت تھی کہ اگر ہوتی تو نظر ضرور آتی بہت سے تانگے والے تھے لیکن وہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں یہ رونق ختم ہو گئی۔ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو لے کر تانگے اور ٹیکسیاں رخصت ہو گئیں وہ اکیلی رہ گئی۔

وہ انتظار گاہ میں بیٹھ گئی لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر اسے دیکھتی بھی رہی۔ پورا دن گزر گیا لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔

دوسرے دن وہ پھر اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ آج بھی ناکامی ہوئی لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی جہاں بھی اسے کوئی تانگہ اسٹینڈ نظر آتا' وہ وہاں پہنچ جاتی لیکن وہ تو اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے وہ آدمی نہیں فردوس کا وہم تھا۔ اس نے پورے شہر کی خاک چھان لی لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

پندرہ دن گزر گئے تھے چھٹیاں ختم ہو گئیں تھیں' اصولاً اسے واپس اپنے گھر جانا چاہئے تھا لیکن اب وہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر لوٹنا نہیں چاہتی تھی اسے ہر قیمت پر اس تانگے والے کو تلاش کرنا تھا۔ دن آبلے بن کر پھوٹ رہے تھے وہ صبح نکل جاتی اور شام کو واپس آتی اس کی یہ دشت نوردی اس کے کام تو نہیں آئی لیکن خالہ اور سلمیٰ کو اس کی طرف سے تشویش ضرور ہو گئی خالہ کئی مرتبہ دبے لفظوں میں اس سے پوچھ چکی تھیں لیکن ایک دن وہ پھٹ پڑیں۔

"یہ تم دن دن بھر کس کے ساتھ منہ کالا کرتی پھرتی ہو؟"

"یہ کام رات میں ہوتے ہیں' دن میں نہیں" اس نے بھی اتنا بڑا الزام سن کر اس بدتمیزی سے جواب دیا۔

"بی بی' یہ تمہارا قصور نہیں' تمہارے باپ کی تربیت کا اثر ہے۔"

"آخر میں نے ایسا کیا گناہ کر دیا کہ آپ مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا رہی ہیں۔"

"تم اسے الزام کہتی ہو؟ اگر میں الزام لگا رہی ہوں تو تم حقیقت بتا دو۔ اس نئے شہر میں کون ہے تمہارا جس کے ساتھ دن بھر گھومتی رہتی ہو۔"

"میں یہاں گھومنے ہی تو آئی ہوں۔"

"بے شک گھومو مگر ایسی کون سی جگہ گھومتی ہو کہ سلمٰی تک کو لے جانا گوارا نہیں۔"

اب اسے احساس ہوا کہ واقعی غلطی ہو گئی۔ اسے پہلے ہی سلمٰی کو اعتماد میں لے لینا چاہئے تھا۔

"کچھ نہیں خالہ' میں نے سوچا کہ اس کی تو سب جگہیں دیکھی ہوئی ہوں گی' اس کو کیا تکلیف دوں۔ اب آپ کہتی ہیں تو اسے بھی ساتھ لے لوں گی۔"

"اب کیا ساتھ لے لوں گی' اب تو اس کے کالج کھل گئے"

"تو کیا ہم کالج سے آنے کے بعد گھومنے چلے جایا کریں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے' اپنے ساتھ اسے بھی بگاڑنے کی۔"

"خالہ' آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں' میں بگڑی ہوئی ہوں؟"

"اور کیسی ہوتی ہیں بگڑی ہوئی لڑکیاں"

"میں آپ کی بہن کی نشانی ہوں اور آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔"

"تو وہ کون سی نیک پروین تھیں۔ محبت کی شادی کی تھی تمہارے ابا سے۔"

"بس خالہ' بہت کہہ چکیں اب اس سے زیادہ ایک لفظ نہ کہئے گا۔"

"کیوں' کیا زبان کتر لو گی۔"

"وہ تو خیر خاندان بھر میں کوئی نہیں کتر سکا۔ میں تو صرف اتنا کروں گی کہ یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

خالہ نے تو یوں آنکھیں پھیر لی کہ جیسے پندرہ دن کی کھلائی ہوئی روٹی حلق میں انگلیاں ڈال کر نکال لے گی۔

اب ایک لمحے بھی اس کے لئے اس گھر میں رہنا مشکل تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ابھی وہ گھر لوٹنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی اس کا مشن مکمل نہیں ہوا تھا سلمٰی کو اب بھی اعتماد میں لیا جا سکتا تھا لیکن سوال تو رہنے کا تھا کہ وہ رہے گی کہاں۔ اسے معلوم تھا کہ خالہ کے سامنے سلمٰی کی بھی نہیں چل سکتی لیکن وہ اپنے اوپر لگے ہوئے الزام کی صفائی تو کر سکتی تھی۔ وہ اسے بتا تو سکتی کہ دن بھر کہاں گھومتی رہتی ہے۔ کبھی بات نکلی تو وہ اپنی ماں کو قائل تو کر سکے گی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ سلمٰی کو سب کچھ بتا دے گی۔

وہ بے چینی سے سلمیٰ کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ابھی اس نے کالج کے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے کہ فردوس اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ سلمیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور بے رخی سے اپنی کتابیں درست کرنے لگی۔ فردوس کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ خفا ہے' اسے ہونا بھی چاہئے۔

"مجھ سے خفا ہو؟"

"نہیں تو۔ میں کیوں خفا ہونے لگی تھی۔"

"تمہیں خفا ہونا بھی چاہئے۔ میں تو یہاں آ کر تمہیں بھول ہی گئی لیکن یہ تو پوچھو میں کس قدر پریشانی میں ہوں۔"

"میں کیوں پوچھوں جب تم ہی بتانا نہیں چاہتیں۔"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے میں نے یہ سوچ کر تمہیں نہیں بتایا تھا کہ ایک دن تمہیں اپنی کامیابی کی خبر سناؤں گی لیکن اب بتانا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ میں یہاں سے جانے والی ہوں۔"

"کیا جا رہی ہو تم؟"

"ہاں۔ جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن خالہ نے مجبور کر دیا ہے انہوں نے مجھ پر آوارگی تک کاالزام لگا دیا۔"

"تو جو مجھے بتا رہی ہو' انہیں بتا دیتیں۔"

"ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا"

"تمہاری سمجھ واری کی باتیں میری سمجھ میں بھی کہاں آئیں گی؟"

"نہیں تم سمجھ لو گی۔ نہیں بھی سمجھیں تو مجھے پاگل سمجھ کر مجھے معاف ضرور کر دو گی۔"

"سنایئے' آج کل آپ کس مہم میں مصروف ہیں" سلمیٰ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں جس تانگے پر بیٹھ کر تمہارے گھر آئی تھی اسے ایک بھوت چلا رہاتھا آج کل میں اسی بھوت کو تلاش کر رہی ہوں۔"

"بھئی وہ بھوت نہیں ہے' انسان ہی ہے میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ بھوت بھی ہو گا تو ایسا ہی ہو گا۔"

"وہ جو کچھ بھی ہے مگر تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ میرے پاس جن بدصورت چیزوں کا سرمایہ ہے' یہ شخص اس سرمائے کا نادر ترین نمونہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

"افوہ! فردوس' تمہیں اللہ سمجھے۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟ اتنی خوبصورت لڑکی ہو کر ایسے بدشکل آدمی کو تلاش کر رہی ہو۔"

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا' تم مجھے پاگل سمجھو گی مگر اب جو بھی سمجھو"

"بالفرض اگر وہ تمہیں مل گیا تو کیا کرو گی۔ شادی کر لو گی؟"

"اب میں تمہیں پاگل کہوں گی۔"

"پھر کیوں اتنی محنت کر رہی ہو"

اب گفتگو اس منزل پر آ گئی تھی کہ فردوس کو اسے بتانا پڑا کہ وہ اس کا مجسمہ بنوائے گی۔ بات ہی ایسی تھی کہ سلمیٰ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"کیا تم مطمئن ہو جاؤ گی کہ وہ ابلیس ہے۔"

"مطمئن تو آدمی کبھی نہیں ہوتا لیکن یہ احساس ضرور ہو گا کہ میں نے ابلیس کا حلیہ دریافت کر لیا۔"

"یہ بھی تمہارا سڑی پن ہی ہو گا کیونکہ شیطان اپنے حلئے سے نہیں' کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی ابلیس نہیں۔ یہ تو گلی گلی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی انسان ہیں جنہیں ہم شیطان کہہ سکتے ہیں۔"

"اتنی بات میں بھی نہیں جانتی ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ بدکرداری کو بدصورتی کی تمثیل سے ظاہر کر سکوں۔ یہ بتا سکوں کہ اگر کردار کی بدصورتی کو اختیار مل جائے تو وہ کیسا چہرہ اختیار کرے گی۔"

"اس کے لئے تو تم خیالی پیکر بھی تراش سکتی ہو۔ اس غریب تانگے والے کو رسوا کیوں کرتی ہو"

"اگر میں یہ مجسمہ خود بنا رہی ہوتی تو یہی کرتی لیکن وہ بوڑھا سنگ تراش نہیں مانتا کہتا ہے ابلیس کو سامنے لے آؤ' مجسمہ بنا دوں گا۔ اب میں ابلیس کو کہاں سے ڈھونڈتی۔"

کہانی ایسی دلچسپ تھی کہ سلمٰی کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اب وہ بھی سوچ رہی تھی کہ کہانی آگے بڑھے۔ تانگے والا مل جائے۔ معلوم تو ہو' دونوں ایک دوسرے سے کیا سلوک کرتے ہیں اسے یہ اشتیاق بھی ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس تانگے والے کو دیکھے۔

"وہ اگر کہیں مل جائے تو مجھے بھی دکھانا۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارا انتخاب کیسا ہے؟"

"دکھانا کیا مطلب۔ تم اگر تعاون کرو تو دونوں مل کر ڈھونڈتے ہیں۔"

"نہ بابا۔ مجھے تو معاف ہی رکھو"

"تم میری مدد تو کر سکتی ہو"

"میری جان حاضر ہے"

"میں چاہتی ہوں اسے رات کے وقت تلاش کروں۔ ممکن ہے وہ رات کو نکلتا ہو؟"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ تم میری اتنی مدد کر دو کہ میں یہاں سے رات کے وقت نکلوں اور واپس آؤ تو کسی کو شک نہ ہو"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ بس مجھے یہ کرنا ہوگا کہ جب تک تم واپس نہ آ جاؤ' میں جاگتی رہوں تمہاری خاطر یہ زحمت تو اٹھا ہی لوں گی۔"

"اور اگر میرے آنے سے پہلے ہی میری تلاش شروع ہو گئی۔"

"یہ تمہاری قسمت۔ اس وقت میں یہی کہوں گی کہ مجھے نہیں معلوم۔"

اتنا خطرہ تو ہر کام میں ہوتا ہے۔ اگر بات کھل بھی گئی تو مجھے ڈر کس کا ہے۔ یہاں سے جانا تو ہے۔ آج نہیں تو کل۔ اس نے سوچا اور رات کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ اس وقت اسٹیشن پر پہنچے گی جو اس گاڑی کا وقت تھا' جس سے وہ آئی تھی۔

سلمٰی نے چپکے سے دروازہ کھولا اور فردوس اندھیرے میں اندھیرا بن گئی۔

وہ گاڑی آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئی۔ یہ احتیاط اس نے اس لئے کہ گاڑی آنے کے بعد ممکن ہے کوئی دوسرا مسافر اس کے تانگے پر قبضہ جما لے۔

"کئی تانگے والے کھڑے تھے مگر وہ نہیں تھا۔ فردوس کو ایک مرتبہ پھر شدید مایوسی ہوئی بلکہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہ آج نہیں ملا تو وہ اسے تلاش کرنا چھوڑ دے گی بلکہ کل ہی اپنے گھر روانہ ہو جائے گی۔

اتنی دیر میں گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز بڑھتی گئی اور پھر گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی تانگے والوں میں کھلبلی مچ گئی دن میں اس نے یہاں ٹیکسیاں بھی دیکھیں تھیں لیکن اس وقت صرف تانگے تھے اور وہ بھی تعداد میں بہت کم۔ اس کا مطلب ہے اس وقت یہاں کم مسافر اترتے ہیں۔

"اب مسافر باہر آنا شروع ہو گئے تھے اسی لمحے ایک تانگا آیا اور سب سے الگ تھلگ آ کر رک گیا کون ہو سکتا ہے کہیں وہی تو نہیں۔ شاید وہی ہے اس کے علاوہ چادر میں چہرہ کون چھپائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اسے ایسی خوشی ہوی جیسے کسی کا محبوب اچانک اس کے سامنے آ جائے۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ اسے ڈر تھا' کوئی اور اس کے تانگے میں نہ بیٹھ جائے۔

اب وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ اسے چادر میں لپٹا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ تانگے والے نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی اس نے تانگے سے نیچے چھلانگ لگادی اس کی طرف بڑھا پھر رک گیا۔

"آپ کا سامان؟"

"میرے پاس سامان نہیں ہے"

"چلئے کوئی بات نہیں کہیں قریب سے آئی ہوں گی۔"

"ہاں بہت قریب سے۔"

"تشریف رکھئے"

"وہ تو آئی اسی لئے تھی اس نے ادھر ادھر دیکھا اور تانگے میں بیٹھ گئی۔ تانگے والے نے بھی اپنی نشست سنبھال لی۔

"کہاں چلوں جی؟"

"تم یہاں سے تانگا نکالو' پھر بتاتی ہوئی۔"

"جی بہتر" اس نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی' اب تو بتا دیں' چوراہا آ گیا ہے دائیں مڑوں یا بائیں؟"

"جس طرف کوئی ہوٹل ہو اس طرف موڑ لو"

"آپ ہوٹل میں رہیں گی؟"

"ہاں"

"میرا مطلب ہے آپ تو اکیلی ہیں۔"

"اکیلی کہاں۔ تم بھی تو ہو۔"

"میں تو جی ' ہوٹل کے باہر ہی باہر ہوں۔ آپ اکیلی ذات کیسے رہیں گی ہوٹل میں؟"

"تم سے کچھ بات کرنی ہے اس لئے تم بھی میرے ساتھ ہی رہو گے۔ بس صبح تک"

"اجی مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟"

"جلدی کرو کیاکام ہے یہ وہیں چل کر بتاؤں گی"

"ایک بات پوچھوں جی ؟"

"پوچھو"

"آپ جب پہلے آئی تھیں اس وقت تو ہوٹل میں نہیں ٹھہری تھیں۔"

فردوس ششدر رہ گئی۔ کم بخت نے آنکھیں تک چادر میں چھپائی ہوئی ہیں لیکن نظر بہت آتا ہے اسے بات کرنے کا آدھا حسن تو اس نے خراب ہی کر دیا۔

"وہاں میں تمہیں نہیں لے جا سکتی۔ اس لئے ہوٹل جا رہی ہوں۔"

"اگر مجھ ہی سے بات کرنی ہے تو ہوٹل میں کیوں' میرا گھر حاضر ہے۔"

"کہیں بھی چلو' یہاں سے چلو' بیچ سڑک پر تانگا روک کر کیوں کھڑے ہو گئے ہو۔"

"جی اچھا"

"تانگا پھر چلنے لگا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب اس کی منزل ہوٹل نہیں اس کا گھر تھا۔

"میں یہ بتا دوں' میں اکیلا رہتا ہوں۔ ویسے میں شریف آدمی ہوں' آپ بے فکر

رہیں۔"

"میں ہوٹل میں بھی تو تمہارے ساتھ اکیلی ہی ہوتی۔"

"ہاں یہ تو ہے"

"اب وہ دونوں خاموش تھے۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اکیلی سڑک پر گونج رہی تھی۔ فردوس کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آج ہی اس شہر میں آئی ہو۔

سڑک ختم ہو گئی کچھ دیر تانگا کچی سڑک پر ٹھوکریں کھاتا رہا پھر پکی سڑک آگئی اب چھوٹے چھوٹے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ مکانات سرکاری کوارٹروں کی طرح ایک سے بنے ہوئے تھے۔

"یہ مکان سرکار نے بنا کر دیئے ہیں۔ پہلے یہاں ہماری جھگیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب پکے مکان بن گئے ہیں۔"

ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے گھوڑے کو چمکارا اور تانگے سے نیچے کود گیا۔

"آیئے"

وہ پہلے ہی تیار تھی پہلی ہی پکار پر اس نے زمین پر قدم رکھ دیا۔ تانگے والا اس کے اترنے سے پہلے ہی درواز کا تالا کھول چکا تھا اس نے کمرے کی بتی روشن کی کمرے میں ایک چارپائی پڑی تھی' ایک بکس رکھا تھا اور باقی سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔

"میں گھوڑے کو باندھ کر ابھی آتا ہوں جب تک آپ بیٹھیں" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

فردوس ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کہاں بیٹھے کہ آ گیا۔

"ارے آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔ آپ چارپائی پر بیٹھیے' میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں" اس نے بکس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ چادر کیوں اوڑھے رہتے ہیں؟"

"اس سے آپ کو کیا غرض۔ آپ بات کیجئے کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"یہی تو بات تھی جو کہنا چاہتی تھی"

"بعض باتیں اور بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن کا چھپا رہنا ہی بہتر ہوتا ہے"

"مگر دوستوں سے تو پردہ نہیں ہوتا۔ باتوں کا بھی نہیں' چہرے کا بھی نہیں۔"

"آپ میری روزی ہیں' دوست نہیں۔"

"اگر میں دوستی کا دعویٰ کروں؟"

"تو میں کہوں گا' چادر اٹھتے ہی دوستی نہیں رہے گی۔"

"تم غلط سمجھے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے دنیا خوب صورتی سے پیار کرتی ہے' مجھے بدصورتی سے دلچسی ہے میں نے تمہاری ایک جھلک دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تم سے ملوں گی اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہیں پندرہ دن سے برابر ڈھونڈ رہی تھی۔

وہ چادر کی گٹھڑی میں چھپا اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور حیران تھا کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا کہ لوگ میرا چہرہ دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیتے ہیں اور یہ چہرے دیکھنے پر بضد ہے وہ دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہا تھا لیکن وسوسے بھی جاگ رہے تھے۔

اس نے آج تک کسی لڑکی نے اس طرح نرم آواز میں بات نہیں کی تھی۔ بچپن میں بھی کوئی اس کے ساتھ کھیلنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ بچے اسے دیکھ کر چھپ جاتے تھے لڑکیاں تو اسے دیکھ کر رونا شروع کر دیتی تھیں محلے کی عورتیں اس کی ماں سے لڑتی تھیں کہ اگر وہ اس بدصورت بلا کا گلا نہیں گھونٹ سکتی تو کم از کم یہ تو کر سکتی ہے کہ اسے گلی میں نہ آنے دے بچے اسے دیکھ کر ڈرتے ہیں اس کی ماں کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے دیکھ کر ڈر نہ جاتا ہو جب وہ جوان ہوا تو فطری طور پر اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی نرم جھونکا اس کی روح کو چھوتا ہوا گزرے کوئی رنگین آنچل اس کے لئے لہرائے لیکن لڑکیوں کا حال تو یہ تھا کہ اگر راستے میں بھی وہ کسی کو نظر آ جاتا تو راستہ بدل لیتی تھیں۔ ماں اسے خوش کرنے کے لئے کہتی تھی کہ چاند سی دلہن اس کے لئے لے کر آئے گی اور وہ دل ہی دل میں ہنستا تھا اس کی ماں اسی آرزو میں مر گئی اور اس نے چادر اوڑھ لی۔ جب کوئی مجھے دیکھنا نہیں چاہتا تو میں کسی کو اپنی شکل کیوں دکھاؤں؟"

"سوچ رہا ہوں' اپنی قسم کیسے توڑ دوں۔ یہ میرا احتجاج ہے جسے آپ چادر سمجھ رہی ہیں۔ جب دنیا مجھے دیکھنا نہیں چاہتی تو میں اسے یہ موقع کیوں دوں اب اتنا فائدہ

ضرور ہوتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ کر راستہ نہیں بدلتا ہم کتنے ہی لوگوں سے ملتے ہیں جن کے دل گناہوں کی گندگی سے لبریز ہوتے ہیں لیکن ان ک سفید کپڑوں کی چادر ان کے گناہوں کو' ان کی گندگی کو چھپالیتی ہے دنیا کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے اگر سب کے دلوں کی گندگی ظاہر ہو جائے تو کون کس سے ملے؟ سب راستہ بدل لیں عافیت اسی میں ہے کہ جو پردہ ہے پڑا رہے۔"

"بے فکر رہو میں راستہ نہیں بدلوں گی۔ اس لئے کہ تم میرے راستے میں نہیں آئے ہو' میں تمہارے راستے میں آئی ہوں۔"

"اپنے عیب چھپاتے سب ہیں' دکھاتا کون ہے؟"

"کسی کا دل رکھنا بھی تو عبادت ہے"

"بچوں کی ضدیں اکثر ان کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں"

"ضد کسی کی بھی نقصان دہ ہوتی ہے اور تم اس وقت ضد کر رہے ہو۔"

"تم مجھے دیکھ نہیں سکو گی"

"حسن کے مقابلے میں بدصورتی کو دیکھنا آسان ہوتا ہے جب تم مجھے دیکھ سکتے ہو تو میں تمہیں کیوں نہیں دیکھ سکتی۔"

اب وہ کچھ کچھ قائل ہوتا جا رہا تھا اس لئے کہ اب اس کے دلائل دم توڑ رہے تھے وہ مسلسل بول رہی تھی اور وہ مسلسل خاموش تھا۔ بالاخر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

چادر ہٹی تو فردوس گھبرا کر پیچھے کی طرف ہٹ گئی لیکن پھر وہ سنبھل گئی وہ ذہنی طور پر اس حملے کے لیے تیار تھی ورنہ یہ عمل اگر اچانک ہوتا تو اس کی چیخ نکل جاتی۔ بدصورتی اس رنگ میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے' اس کے گمان میں بھی نہیں تھا اس کا آدھا چہرہ جھلسے ہوئے چمڑے کی طرح تھا' آدھا چہرہ ٹھیک تھا۔ ایک آنکھ کی جگہ سوراخ تھا' دوسری آنکھ سے وہ دیکھ سکتا تھا لیکن یہ آنکھ بھی انسانی آنکھ سے مختلف تھی دو دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے بھوؤں پر برائے نام بال تھے پلکوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔

یہی ہے وہ چیز جس کی مجھے تلاش تھی اگر خدا نے شیطان کو کوئی جسمانی سزا دی

ہو گئی تو اس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس نے دل میں سوچا اور خوش دلی سے مسکرا دی۔

"یہ بھی ایک انداز ہے خوف دور کرنے کا" تانگے والے نے کہا۔

"نہیں' میں تو اس بات پر ہنس رہی تھی کہ تمہیں کتنی مایوسی ہوئی ہو گی یہ دیکھ کر کہ میں ڈری نہیں خوب صورتی سے تو سبھی پیار کرتے ہیں' مزہ یہ ہے کہ کوئی تم سے پیار کرے۔"

"ڈراؤنی فلمیں لوگ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں لیکن تفریح کے لئے اسے اپنانے کے لئے نہیں"

"تم فلم نہیں ہو' اسی قدرت کے شاہکار ہو جس نے مجھے تخلیق کیا ہے۔

اس نے دیکھا کہ تانگے والے کی واحد آنکھ سے آنسو کی ایک بوند نکلی اور وہ مسکرا دیا۔

"ارے ہاں' میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں" فردوس نے کہا۔

"میری ماں نے میرا نام افتخار رکھا تھا جب میں چھوٹا تھا تو بچے بھی بھوت کہہ کر بھاگا کرتے تھے پھر تو ان بچوں کی مائیں بھی مجھے اسی نام سے پکارنے لگیں۔ میری ماں کے پاس آ کر کہا کرتی تھیں' تمہارے بھوت نے یہ کہا' تمہارے بھوت نے وہ کیا' کبھی کبھی تو ماں بھی کہہ جاتی تھی' میرا بھوت ایسا نہیں ہے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو لڑکوں نے یہ رعایت کی کہ بھوت اور افتخار کو ملا کر ایک نیا نام بنا دیا' . بھتو' بس جی نام آج تک چلا آ رہا ہے"

"میں تمہیں افتخار ہی کہا کروں گی"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی' ہوں تو میں . بھتو ہی ایسا بھوت کہ اگر چہرہ چھپا کر نہ پھروں تو میرے تانگے میں کوئی بیٹھنا بھی پسند نہ کرے۔"

"میں تو تمہارے ہی تانگے میں بیٹھا کروں گی بٹھاؤ گے نا؟"

"کیوں نہیں جی' اپنا تو کام ہی یہ ہے مگر میں صرف رات میں تانگا چلاتا ہوں اور آپ رات کو کہاں نکلیں گی"

"نہیں اب تم دن میں بھی تانگا چلاؤ گے اس لئے کہ سواری تمہیں دیکھنے کے باوجود تمہارے تانگے میں بیٹھنے کی ضد کر رہی ہے۔"

"اچھا جی چلا لیا کروں گا"

"کیسے جائیں گی آپ؟"

"تمہارے علاوہ اور کس کا تانگا ہے جو مجھے لے جا سکتا ہے"

افتخار نے ایک مرتبہ پھر گھوڑے کو تانگے میں جوتا اور فردوس کو لے کر اس کے گھر کی طرف چل دیا۔



اب فردوس کو اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا اسے تانگے والے کو بوڑھے مجسمہ ساز کے پاس لے جانا تھا اس لئے کہ ضروری تھا کہ اسے شیشے میں اتارا جائے۔ افتخار کی کمزوری محبت تھی۔ اسے زندگی بھر کسی نے نہیں چاہا تھا۔ ذرا سی قربت نے اس کے بدصورت چہرے پر کئی رنگ بکھیر دیئے تھے وہ انہی رنگوں سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس نے یہی منصوبہ بنایا کہ کسی نہ کسی طرح اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر لے گی۔



وہ رہی سہی رات کاٹ کر صبح بیدار ہوئی تو یوں لگتا تھا جیسے ساری زندگی میں گزشتہ رات پہلی مرتبہ سوئی ہو آئینہ سامنے نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ چہرے پر خوشی کی کئی پرچھائیں رقص کر رہی ہوں گی وہ دوڑ کر گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی یہ وہی تھی لیکن کوئی اور ہو گئی تھی۔ سلمٰی کے ساتھ ناشتا کرتے ہوئے اس کی بھوک اڑ گئی تھی لیکن خوشی کی طرح وہ یہ چھپا رہی تھی کہ اسے بھوک نہیں ہے۔

"آج بہت خوش ہو" سلمٰی نے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔

"اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد کون خوش نہیں ہوتا"

"ویسے تمہارا مقصد بھی خوب تھا۔ اچھا یہ تو بتاؤ' اب اس تانگے والے کو کس

چوراہے پر نمائش کے لئے رکھو گی؟"

"میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں اس کا مجسمہ بنوانا چاہتی ہوں مجسمہ بنتے ہی وہ الگ میں الگ"

"یہ تو خودغرضی ہوئی۔"

" خود غرضی کیسی میں اس کا معاوضہ ادا کروں گی ۔ غریب آدمی ہے خوش ہو جائے گا۔"

""""جیسی تمہاری مرضی۔ میں تو کالج جا رہی ہوں۔"

اس کے کالج جانے کے بعد فردوس کچھ دیر کے لئے خالہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ابھی اسے کچھ دن اور یہاں رہنا تھا اس لئے خالہ کو منانا ضروری تھا خالہ کا غصہ تو پانی کے بلبلے کی طرح تھا۔

آج معلوم بھی نہیں ہو رہا تھا کہ کل انہوں نے کیسی الزام تراشیاں کی تھیں۔

"خالہ میں ذرا باہر گھوم آؤں"

"ہاں ہاں ' کیوں نہیں۔ گھومنے تو آئی ہو مجھ بڑھیا کی طرح کیا گھر میں پڑی رہو گی۔"

خالہ کا یہ جواب غیر متوقع تھا لیکن اس وقت کچھ بھی سوچنے کی اسے فرصت نہیں تھی۔ اس نے پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی ابھی وہ گلی کے کونے تک پہنچی تھی اور کسی سواری کے لئے ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی کہ اس کا تانگا نظر آ گیا۔

"بیگم جی ' تانگا حاضر ہے"

"ارے افتخار تم !

"ہاں بیگم جی۔ آج پہلی مرتبہ دن میں تانگا نکالا ہے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا' اب تم دن بھی تانگا چلایا کرو گے میں نے آپ کا حکم مان لیا۔"

فردوس نے اپنی فتح کو چادر میں لپیٹے ہوئے بڑے اشتیاق سے دیکھا اور تانگے میں بیٹھ گئی۔

"کہاں چلو گی بیگم جی؟"

"کہیں بھی۔ جہاں تمہارا جی چاہے' جہاں تم سے باتیں کر سکوں"

"آپ آج بھی باتیں کریں گی؟"

"روز باتیں کروں گی"

"تو پھر یہاں ایک باغ ہے چلتے ہیں" اس نے گھوڑے کو چابک دکھائی

اب فردوس کو اس کے ساتھ گھومتے ہوئے پورا ہفتہ ہو گیا تھا وہ روز صبح گھر سے نکلتی' گلی کے کونے پر وہ کھڑا ہوتا یہ عجیب و غریب محبت تھی جو چپکے چپکے سلگ رہی تھی افتخار کو پہلی مرتبہ محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اندھے تھے' فردوس کی آنکھوں نے اس کی روح کے حسن کو محسوس کر لیا ہے۔

افتخار نے بہت عرصے بعد آئینہ دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس کی دونوں آنکھیں ہوتیں تو وہ کچھ ایسا برا نہ تھا۔

آج وہ پھر نئی چادر میں لپٹا' ہواؤں میں اڑتا فردوس کی طرف جا رہا تھا فردوس آج پہلے سے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

"آج تم نے بہت دیر کر دی" فردوس نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ آج بال بنانے کپڑوں پر استری کرنے میں دیر ہو گئی وہ اسے یہ بھی کیا بتاتا کہ وہ بہت دنوں بعد آج نہایا تھا' نہانے کو جی چاہا تھا وہ تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ آج اس کا یہاں آنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ آج کوئی آئے اسے منا کر لے جائے وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ جب سے وہ پیدا ہوا ہے اب زندہ ہوا ہے اور زندہ آدمی کے کچھ نخرے بھی ہوتے ہیں۔ اس نے پہلی مرتبہ اپنی اہمیت کو محسوس کیا تھا۔

"بیگم جی' آج مجھے کچھ دیر ہو گئی تو کیا آپ تانگے میں بھی نہیں بیٹھیں گی؟"

"اوہ۔ کیوں نہیں" فردوس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج کہاں چلیں؟"

"آج اسی باغ میں چلو جہاں ہم پہلے دن گئے تھے۔"

افتخار نے گھوڑے کو چابک دکھائی اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا جیسے اسے بھی احساس ہو کہ دیر ہو گئی ہے۔

"افتخار ایک بات کہوں؟"

"کہیئے"

"کل میں اپنے گھر جا رہی ہوں"

"میں تو کب سے اس دن کے انتظار میں تھا"

فردوس نے دیکھا کہ اس کا بدصورت چہرہ اور بھی بدصورت ہو گیا ہے۔ اس نے بظاہر اس بات کا اثر نہیں لیا لیکن یہ خبر اس کی روح تک کو زخمی کر گئی ہے۔

"لیکن میں اکیلی نہیں جا رہی ہوں"

"تمہارے رشتے دار بھی ساتھ جا رہے ہوں گے"

"نہیں، تم میرے ساتھ چلو گے"

چھوڑیئے بیگم جی۔ کیوں مذاق کرتی ہیں۔ لوگ ڈراؤنی فلمیں دیکھتے ضروری ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے سینما گھر میں نہیں بیٹھ جاتے فلم ختم ہوتے ہی اپنا راستہ لیتے ہیں ویسے میں آپ کو چھوڑنے اسٹیشن ضرور جاؤں گا پھر کبھی آنا ہو تو مجھ سے ملئے گا ضرور"

"میں نے کہا نا کہ تم میرے ساتھ چلو گے"

"سچ بیگم جی"

تمہاری قسم

اور میرا گھوڑا

"کچھ دن کے لئے اسے کسی کے پاس رکھ دو، اگر میرے شہر میں تمہارا دل لگ جائے تو واپس آ کر گھوڑا بیچ دینا۔

"جس شہر میں آپ ہوں گی وہاں دل کیسے نہیں لگے گا"

"پھر بھی"

"ٹھیک ہے بیگم جی"

منصوبے کے مطابق افتخار مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔

فردوس کو اسٹیشن چھوڑنے سب آئے لیکن کسی کو گمان بھی نہیں ہوا کہ وہ چادر میں لپٹا ہوا جو شخص فردوس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہے، وہ فردوس کے ساتھ ہے"

ٹرین چلنے کے بعد بھی ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ حکمت

عملی ان دونوں نے پہلے طے کر لی تھی"

"اگلا اسٹیشن ہے" فردوس نے کئی گھنٹوں کی خاموشی کے بعد کہا اور افتخار نے چادر کے کونوں سے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے رک گئی وہ دونوں چپکے سے اٹھے اور خاموشی سے پلیٹ فارم پر اتر گئے

"اس پتے پر پہنچ جاؤ' میں تمہارا انتظار کروں گی"

لیکن میں تو پڑھا لکھا ہوں ہی نہیں"

"بس تم ٹیکسی والے کو یہ پرچہ دے دینا' وہ خود تمہیں پہنچا دے گا۔"

فردوس نے دوسری ٹیکسی کی اور بوڑھے سنگ تراش کے گھر پہنچ گئی۔

میں اسے لے آئی ہوں۔"

"کسے لے آئی ہو؟"

"بھول گئے تم نے کہا تھا' ابلیس کا مجسمہ اسے دیکھے بغیر نہیں بنا سکتے۔ وہ مجھے مل گیا ہے"

"کہاں ہے"

"بس آتا ہی ہو گا"

اس نے گیلری سے نیچے جھانکا۔ ایک ٹیکسی نیچے آ کر رکی وہ اسے لانے کے لئے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اس بوڑھے کے سامنے تھے۔

"بس اس جیسا بنا دو" فردوس نے کہا اور افتخار کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

بوڑھے کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ بھی اپنے تخیل میں ابلیس کی شکل کو تیار کر سکتا تو اس سے بہتر نہ ہوتی۔

"اب میں کب آ جاؤں؟"

"دس دن بعد"

"آپ جا رہی ہیں؟" افتخار نے پوچھا۔

"ہاں جب تک میں آ نہیں جاتی تمہیں یہی رہنا ہو گا"

"مگر آپ جا کیوں رہی ہیں؟"

"میں اپنے گھر والوں کو منا لوں۔ پھر آ کر تمہیں لے جاؤں گی۔"

افتخار خوش ہو گیا فردوس نے بوڑھے کے ہاتھ پر کچھ رقم رکھی اور نیچے اتر آئی۔

☆○☆

ٹھیک دس دن بعد اس نے مجسمہ ساز کے دروازے پر دستک دی۔

”بن گیا مجسمہ؟“

”کل سے تیار پڑا ہے“

”کہاں ہے ؟“ فردوس نے بے تابی سے پوچھا

بوڑھے نے مجسمے پر پڑی ہوئی چادر کو نہایت احتیاط سے اٹھایا۔

”مگر .... مگر یہ تو آپ کا مجسمہ ہے“ بوڑھے نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”یہ دھوکا ہے سراسر دھوکا ہے افتخار کہاں ہے؟“

”پاک روحیں پتھر کے مجسموں میں قید نہیں ہوتیں۔ وہ چلا گیا“

”جھوٹ مت بولو۔ تم نے ابلیس کا مجسمہ چاہا تھا اور ابلیس میں تھا‘ وہ نہیں سنو! وہ تم سے محبت کرتا ہے‘ محبت کرنے والا ابلیس کیسے ہو سکتا ہے؟ ابلیس کسی سے محبت نہیں کرتا۔ اسے تو اپنے مفاد سے محبت ہوتی ہے میری بیوی ایڑیاں رگڑ کر مر گئی میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں تھا اسے اولاد کی خواہش تھی میں اولاد کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا زبیدہ‘ میری نوکرانی مجھ سے محبت کرتی تھی‘ میں کچھ دن اس سے بہلتا رہا اور جب دل بھر گیا تو اسے کھانے میں زہر دے دیا اور مشہور کر دیا کہ اس نے ظاہر کھا لیا میرا مفاد اسی میں تھا کہ میں گرفتار نہ ہوں وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی اور مجھے دھمکیاں دے رہی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ ابلیس میں ہوں یا وہ غریب تانگے والا جو تمہاری محبت میں ابلیس بننے کو تیار ہو گیا اور مجھ سے کہنے لگا‘ بدصورتی میں ذرا اور اضافہ کر دینا تاکہ بیگم جی خوش ہو جائیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ تم خوش ہو جاؤ گی تو وہ چلا گیا۔

”ہم سب کے اندر ایک ایک ابلیس چھپا ہوا ہے۔ اسی لئے میں نے مجسمہ بنانے سے گریز کیا تھا کہ میں کتنے مجسمے بناؤں گا؟“



رخسار تراش

میں ایک مصور ہوں' رنگ' برش او کینوس میری کل کائنات ہیں اور ہاں غیر معمولی چہرے بھی۔ ہر فنکار کی طرح میرے ذہن میں بھی ایک دنیا آباد ہے۔ نظر آنے والی دنیا سے بہت مختلف' بڑی انوکھی' یہ میری اپنی دنیا ہے۔ اس کی زمین پر زمرد جڑے ہوئے ہیں اور آسمان پر ایک خواب ناک دھند قبضہ کئے ہوئے ہے۔ یہاں صرف وہ چہرہ نظر آتا ہے جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں' وہ اشارہ حرکت میں آتا ہے جس کی جانب میں لپکنا چاہتا ہوں۔ یہاں ہر چہرہ حسین' ہر حسین نازنین' ہر آنکھ نشیلی ہر لڑکی چھبیلی ہے۔ یہاں آوازیں نہیں ہیں لیکن آوازوں کا رس حواس پر طاری رہتا ہے۔ ہر چوک پر محبت کا ایک محل تعمیر ہے جس کا ہر دروازہ ہر کھڑکی معصومیت کے بازار کی طرف کھلتی ہے۔ اس بازار میں نفرت کے کھوٹے سکے نہیں' پیار کی انمول اشرفیاں چلتی ہیں۔ اعتماد کا سودا فروخت ہوتا ہے۔ ہر دکاندار خسارہ اٹھاتا ہے مگر خوش ہے۔ چہروں پر چاندی کی پتریں چڑھی ہوئی ہیں۔ خوشی کی روشنی ان چہروں سے لپٹتی ہے تو ایسی چکا چوند ہوتی ہے کہ بازار منہ سے بولنے لگتا ہے۔ بستی کیا ہے جادو کی نگری ہے۔

میں تخیل کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے گلی کوچوں کی سیر کو نکلتا ہوں۔ دل مومن کی طرح صاف سڑکیں میری راہ میں پلکیں بچھاتی ہیں۔ کھڑکیاں کھلتی ہیں' تمنائیں پھولوں میں تکتی ہیں۔ خوش رو' عنبرین مو مجھے دعوت تصویر کشی دیتے ہیں۔ پھر رنگ گھلتے ہیں' برش حرکت میں آتا ہے' کینوس' نگار خانہ بنتا ہے' معمولی چہرے غیر معمولی بن جاتے ہیں کہ فطرت کو حسین تر بنانا' معمولی کو غیر معمولی کرنا ہی انتہائے فن ہے۔

فنکاروں کے لیے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مفلوک الحالی ان کے دروازے پر

دستک دیتی رہتی ہے۔ دولت ان کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہوتی ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں۔ میں ایک دولت مند مصور ہوں' خوش قسمت فنکار ہوں۔ مایا دیوی کی مہربانیوں میں میری صلاحیتوں کو دخل نہیں۔ میں تو اتنا ہی بے نیاز ہوں جتنے دوسرے فنکار ہوتے ہیں البتہ میرے والد کٹر دنیا دار' دولت مند اور اولاد پرست ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اس لیے بھی ان کی اکیلی توجہ کا اکیلا حق دار ہوں۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ مصور کیوں بن گیا ان کی طرح بڑا بزنس مین کیوں نہیں ہو گیا۔ وہ مجھے غریب سمجھتے ہیں اور شاید قابل رحم بھی۔ انہیں اپنی عزت کا پاس بھی ہے' انہیں ڈر ہے کہ کہیں میری غربت ان کی دولت کا داغ نہ بن جائے اس لیے وہ مجھ غریب کے تن عریاں کو اطلس و کم خواب کی پوشاک سونپتے رہتے ہیں۔ ان کی مہربانیوں سے میں شاندار اسٹوڈیو کا مالک ہوں۔ دنیا بھر کا لٹریچر میرے پاس آتا ہے۔ مہنگے ترین کلر' قیمتی برش خریدنے کی استطاعت رکھتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ فکر فاقہ سے آزاد ہوں جو کسی فنکار کے لیے سب سے اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ ناقدری کی اس ۔ھیٹر میں اگر میں سفید کاغذ پر بنی رنگین تصویریں لیے گھومتا تو کب کا قبرستان پہنچ چکا ہوتا یا مصوری چھوڑ کر کلرکی کر رہا ہوتا۔ میں لاکھ خون دل میں انگلیاں ڈبوتا' زخموں کی اس بہار کا خریدار کوئی بھی نہ ہوتا۔ میری مصوری کا بھرم میرے والد کی دولت سے قائم ہے۔ میرے ڈیڈی اس دور کے سب سے بڑے مصور ہیں۔ جی ہاں! اصل مصور تو وہی ہے جو اس مصور کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

تخیل کی جو دنیا مجھ میں موجود ہے' اس کے مقابلے میں باہر کی دنیا اتنی غلیظ اور مکار نظر آتی ہے کہ میں اس سے کچھ زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتا۔ اشد ضرورت کے تحت باہر نکلتا ہوں ورنہ میں بھلا' میرا ڈرائنگ روم بھلا میری ایک پیاری سی غیر معمولی چہرے والی بیوی بھی ہے جس سے مجھے محبت ہے لیکن اس کے باوجود کئی کئی دن تک میں اسے غور سے نہیں دیکھتا۔

میں یوں بھی ازحد مردم بیزار ہوں لیکن اس نئے اپارٹمنٹ میں آنے کے بعد تو دنیا سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گیا تھا۔

اس نئے اپارٹمنٹ کی کہانی بھی آپ کو سناتا چلوں۔ میں جس علاقے میں' اپنے

والدین کے ساتھ رہتا تھا وہ اتنا آباد ہو گیا تھا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ فنکار بھی تو دیوانہ ہوتا ہے اور دیوانہ صحرا کی طرف بھاگتا ہے۔ میں ہوش مند دیوانہ تھا' صحرا کی خاک کہاں چھانتا پھرتا۔ بس جوش وحشت میں اکھڑا اکھڑا رہنے لگا۔ دیوانے کو پابند سلاسل کیا جاتا ہے' مجھے بھی پابہ زنجیر کر دیا گیا۔ ڈیڈی نے میری وحشت کو میری تنہائی کا سبب قرار دے ڈالا اور ماہ رخ' دلہن بن کر میرے گھر آ گئی۔ ماہ رخ اپنے نام کی طرح نہایت حسین تھی بلکہ حسین کا لفظ اس کی تعریف کرنے کے لیے کم ہے۔ روشنی کا ایک ہالہ اس کے چہرے کا احاطہ کئے رہتا تھا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آئی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت تبسم کھیلتا رہتا تھا لیکن آنکھوں میں ایسی پراسرار خاموشی تھی جسے اداسی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بچہ روتے روتے چپ ہو گیا ہو۔ جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ اس کی یہ اداسی اس کا وقار بن گئی تھی۔ جب تک وہ خود بات نہ کرے اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے غمگین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بات بات پر کھلکھلا کر ہنس دینا اس کی عادت تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں کسی اور کی آنکھیں ہوں جو اس کی ہنسی کا ساتھ نہ دے پا رہی ہوں۔ مجھے غیر معمولی چیزوں سے ہمیشہ رغبت رہی ہے اور ماہ رخ ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید میں اپنے خلوت کدے سے باہر نہ نکلتا' اپنے خول میں سمٹا بیٹھا رہتا لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں حسن پرست سرشت نے کروٹ لی اور پھر زندگی بھر وہ میری آنکھوں میں بسی رہی۔ اس کی نفاست طبعی نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا۔ مجھ لاابالی کی دیکھ بھال کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیئے۔ میری بنائی ہوئی تصویروں کو ترتیب سے رکھتی' میرے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتی' نوکروں کی موجودگی کے باوجود میرے لیے خود کافی بناتی' غرض وہ کون سی خوبی تھی جو اس میں نہیں تھی۔ اس کی انہی صفات نے میرے دل میں اس کے لیے عشق کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اب میں دو محبتوں کے درمیان زندگی گزار رہا تھا۔ ایک مصوری' دوسری ماہ رخ' ماہ رخ کی محبت نئی تھی اس لیے کشش بھی زیادہ تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں تکلف نہیں کہ کچھ دن کے لیے میں اپنی پہلی محبت سے غافل ہو گیا۔ مہینوں میں نے کوئی تصویر نہیں بنائی۔ ہاں ایک تصویر بنائی اور وہ تھی ماہ رخ کی تصویر۔

انہی دنوں مجھ پر یہ عجیب سا احساس طاری ہو گیا کہ ماہ رخ کو مجھ سے کوئی چھین لے گا۔ یہ متاعِ بیش قیمت مجھ سے چھن جائے گی۔ مجھے اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ نظروں کے چور اسے چرا نہ لیں۔ اسے چھپا لینے ہی میں عافیت ہے۔ یقیناً" یہ ایک نفسیاتی پیچدگی تھی جو مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہر نظر اسی کو دیکھ رہی ہے۔ مجھے نوکروں تک پر شک ہونے لگا۔ میں نے ماہ رخ کے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی۔ وہ بے چاری کمرے کے قفس میں بند ہو کر رہ گئی لیکن وفاشعار تھی اس نے اس سزا کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی اور اپنے مزاج کا بہانہ کر کے آہستہ آہستہ لوگوں سے کٹتی چلی گئی۔

میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈیڈی سے کہہ کر کر اپنے لیے الگ فلیٹ کا بندوبست کر لیا۔ یہ شہر سے دور نسبتاً" ویران جگہ تھی ہر ویرانہ آباد تو ہو ہی جاتا ہے۔ یہ مجھے بھی معلوم تھا لیکن میں نے اس فلیٹ اور اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہاں ہم دوسروں کے لیے اجنبی ہوں گے' تعلق بڑھانے سے گریز کریں گے اور خاموشی سے زندگی گزار دیں گے۔ کسی چور کو یہ علم ہو ہی نہیں سکے گا کہ اس فلیٹ نما تجوری میں کیسی بیش قیمت دولت آباد ہے اور یوں میں اس اپارٹمنٹ میں آ گیا جہاں سے میری کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

اس فلیٹ میں آنے کے بعد ماہ رخ کی طرف مجھے اطمینان ہو گیا۔ یہ اطمینان ہوتے ہی میری پہلی محبت نے جوش مارا اور میں دل و جان سے رنگوں کی دنیا میں ڈوب گیا۔ کچھ دن اس غریب نے میری مصروفیت کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا' مجھے واپس لینے کی کوشش کی اور مایوس ہو کر تنہائیوں سے مصالحت کر لی۔ اب ایک اداس سناٹا' خاموش اداسی فلیٹ کا مقدر بن گئی۔ اس سے میری ملاقات رات کے کھانے پر ہوتی یا شام کی چائے پر۔ رات کو دیر تک کام کرنے کی وجہ سے میں صبح دیر سے اٹھتا اور اکیلے ناشتا کرتا تھا۔ لنچ کرنے کا میں کبھی عادی نہیں رہا۔ دن بھر کی اس تنہائی میں اس کی مصروفیات کیا ہے' یہ میں نے اس سے بھی نہیں پوچھا اور نہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی کہ تنہائی میں اس کا دم گھٹتا ہو گا۔

اس روز ماہ رخ گھر میں نہیں تھی۔ اس کے والد میری منت سماجت کر کے دن

بھر کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جو تصویر میں پچھلے ایک ماہ سے بنا رہا تھا' مکمل ہو گئی تھی۔ کام ختم ہونے کی سرشاری نے مجھے نہال کر دیا تھا' یہ تصویر' کوڑا کرکٹ چننے والے ایک بوڑھے کی تھی اور میرے خیال میں یہ میری شاہکار ------ تصویر تھی۔ میں دل ہی دل میں خود کو داد دیتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ ماہ رخ آئے گی تو میرے اس کام پر ضرور شاباش دے گی' میں نے دل میں سوچا اور بے خیالی میں گیلری کی طرف نکل آیا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے اپنے فلیٹ کی بلندی سے دور تک نگاہ دوڑائی۔ میرا فلیٹ آخری سرے پر تھا۔ اس کے بعد دور تک جنگلی جھاڑیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ایک طرف چوڑا برساتی نالہ تھا جو اس وقت خشک پڑا ہوا تھا۔ ایک پٹرول پمپ تھا جو ابھی تعمیر ہو رہا تھا۔ پمپ کے پیچھے مسجد کے مینار صاف نظر آ رہے تھے۔ کچھ فلیٹ ویران پڑے ہوئے تھے' کچھ کی بالکونیوں میں لٹکے ہوئے کپڑے مکینوں کی موجودگی کی نشان دہی کر رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے اور اب دوپہر ہو چکی تھی اس لیے فلیٹوں کے برابر سے گزرنے والی سڑک اور گلی ویران پڑی تھی۔ افوہ! آج کس قدر لو چل رہی ہے' میں نے تپش محسوس کرتے ہوئے کہا۔ میں اس تپش سے بچنے کے لیے واپس کمرے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ وہ مجھے نظر آیا۔ میری آنکھیں اس پر جم کر رہ گئیں میری تخلیق میرے سامنے' میری آنکھوں کے سامنے مجسم موجود تھی۔ یہ بوڑھا میری تصویر سے نکل کر یہاں کیسے آ گیا؟ مجھے اپنے ہاتھ پاؤں سرد ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ خوف میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ اب وہ اور قریب آ گیا تھا۔ اس کے جسم پر میلے کچیلے کپڑے تھے۔ داڑھی کے بال بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا لگ رہا تھا مگر چہرہ جوانوں کی طرح تر و تازہ تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک بڑا سا تھیلا پڑا ہوا تھا جس میں وہ زمین سے اٹھا اٹھا کر کاغذ کے پرزے' گتے کے ٹکڑے ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ کوڑا کرکٹ چننے والا تھا۔ بالکل ویسا' جیسا میں نے تصویر میں بنایا تھا۔ وہی قد' وہی ناک نقشہ وہی حلیہ۔ تخیل کی اس کاری گری پر میں حیران رہ گیا۔ میں نے اس شخص کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر وہ میرے تخیل میں کیسے آباد ہو گیا؟ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا "بالکل وہی" میرے منہ سے نکلا۔ وہ کچھ دیر مجھے تکتا رہا پھر نہایت حقارت کے ساتھ

زمین پر تھوک دیا۔ اس کا مطلب ہے یہ پاگل بھی ہے۔ تصویر بناتے ہوئے تصویر والے بوڑھے کے لیے بھی میرے یہی جذبات تھے۔ وہ ایک غیر معمولی چہرہ تھا۔ عام لوگوں سے بالکل مختلف اور پھر میری تخلیق کا ہمزاد تھا اس لیے اس سے ملنے کا اشتیاق لازمی تھا۔ میں نے اسے آواز دی مگر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ مجبوراً" میں نے فلیٹ سے نیچے اترا۔ وہ خاصی دور جا چکا تھا لیکن میں بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سنو" میرا سانس پھول رہا تھا۔

"کیا ہے' کیوں پکارتا ہے مجھے؟ اس نے بغیر رکے چلتے چلتے کہا۔

"سنو تو' مجھے تم سے کام ہے۔"

"تم دنیا داروں کو کام کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔" اس نے کندھے پر پڑے ہوئے تھیلے کو زمین پر رکھا اور اس پر آرام سے بیٹھ گیا۔

"میں ایک مصور ہوں۔"

"پھر مجھے کیا۔" اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔

"میں نے یہ تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم مجھے دنیا دار نہ سمجھو۔"

"پھر کام کا نام کیوں لیا تھا؟"

"بابا' کام تو تم بھی کرتے ہو۔" میں نے اس کے تھیلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تو کیا جانے نادان کتے' میں کم نہیں کرتا' عبادت کرتا ہوں۔ اب میرا وقت کھوٹا مت کر کام بتا کام۔"

"اس کے لیے تمہیں میرے گھر چلنا ہو گا۔"

"ایک گھر سے نکلا تھا' اب کسی کے گھر جانے کی ہمت نہیں پاؤں جواب دے گئے ہیں۔ یہیں کہہ لے کیا کہنا ہے۔"

"میں نے آپ کی ایک تصویر بنائی ہے۔ آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

"تصویر!" اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں مصور نہیں جلاد ہوں اور اسے موت کی سزا دینے کے لیے آیا ہوں۔

"تصور بنائی ہے ----- پھاڑ دے اسے ------ ٹکڑے کر دے۔ بکھیر دے ہوا میں۔" اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ میں حیرانی سے اسے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلک جھپکتے گلی یوں سنسان ہو گئی جیسے یہاں کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر میں نے ایسی کیا بات کہہ دی۔ وہ کیوں خوف زدہ ہو گیا؟ تصویر کا لفظ اس کے لیے اتنا وحشت اثر کیوں ہے؟ میں سوچتا رہا لیکن ظاہر ہے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن تھا ہی نہیں۔ تھک ہار کر میں واپس چلا آیا۔

عام طور پر ماہ رخ کو اپنی پریشانیوں میں شریک نہیں کرتا تھا اور نہ اس کو دل کریدنے کی عادت تھی لیکن میں یہ واقعہ اسے بتائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے صرف اتنی احتیاط رکھی کہ اس بوڑھے سے ملاقات کا احوال اسے نہیں سنایا۔ میں سوچا عورتیں تو ہم پرست ہوتی ہیں' نہ جانے وہ اس کے کیا معنی لے۔ ڈر جائے یا پریشان ہو جائے۔ وہ بھی حیران رہ گئی کہ انسانی تخیل حقیقت کے اتنا قریب بھی پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ اس نے تو اسے میری فنکاری کی انتہا قرار دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی' میرا شیشہ دل اتنا شفاف ہو گیا ہے کہ باہر کا عکس اس پر منعکس ہو گیا اور میری فنکار آنکھ نے اسے دیکھنے کی طرح محسوس کر لیا۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مصوری کے بارے میں اس کی معلومات بہت گہری ہیں۔

مجھے یقین تھا' وہ بوڑھا روز اس طرف سے گزرتا ہو گا۔ دوسرے دن میں نے اپنی کرسی بالکونی میں ڈال لی۔ مجھے کوفت تو بہت تھی لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ اس بوڑھے کی باتوں نے مجھے اس کا اور بھی مشتاق بنا دیا تھا۔ ماہ رخ میری اس تبدیلی پر بہت حیران تھی۔ وہ اسے میری کسی نفسیاتی و جذباتی تبدیلی کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ وہ بہت خوش لیکن میں اس سے جان بوجھ کر بے رخی اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی میرے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ جائے۔ وہی کچھ دیر چہکتی رہی پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

سورج سر پر آ گیا تھا۔ تپش نے دیواروں کو جھلسانا شروع کر دیا تھا۔ گلی کے سناٹے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دیوار کی اوٹ سے نمودار ہوا جیسے صحرا میں بگولہ اٹھتا ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا' پھر خاموشی سے اٹھا۔ بالکونی کی طرف کھلنے والے

دروازے کو مقفل کیا تاکہ ماہ رخ اوپر سے نہ جھانک سکے اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس وقت تک وہ میرا فلیٹ پار کر چکا تھا۔

میں بغیر کچھ کہے سنے اس کے تعاقب میں چلتا رہا۔ میں اسے مانوس کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔

وہ کچھ دیر تک میرے قدموں کی آہٹ سے بے خبر' اپنی دھن میں مست چلتا رہا پھر پلٹ پڑا۔

"کیوں آتا ہے' میرے پیچھے۔ کون ہوں میں تیرا؟"

"میرا تمہارا تو ازل سے رشتہ ہے۔ میں تمہاری تصویر کا خالق ہوں۔" میں نے جان بوجھ کر تصویر کا لفظ استعمال کیا۔ میں اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیوں کفر بکتا ہے۔ تو خالق کہاں ہو گیا' تو تو نقال ہے فطرت کا۔ پھول کی شکل پھول ہی کی طرح بناتا ہے نا۔ پہلا پھول تو اسی قادر مطلق نے بنایا تھا۔ تھو ہے تجھ پر۔" اس نے سچ مچ زمین پر تھوک دیا۔

آج تصویر کا لفظ سن کر وہ بھڑکا نہیں تھا۔ یہ بات میرے لیے امید افزا تھی۔ میں نے تمہاری تصویر' تمہیں دیکھے بغیر بنائی ہے۔ اسے تم نقل کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یہ تصویر درمیان میں کہاں سے آ گئی؟ تو اپنی بات کرو۔"

"کیا بات کروں' تم بیٹھو تو کچھ کہوں۔"

"لے بیٹھ گیا۔" اس نے تھیلا زمین پر رکھا اور بیٹھ گیا۔ "تو بھی بیٹھ ڈر لگتا ہے مٹی سے۔ یہ پوشاک خراب ہو جائے گی۔ قبر میں کیا گدے بچھا کر سوئے گا۔"

"نہیں' ایسی بات نہیں۔ میں تو تمہاری اجازت کا منتظر تھا۔" میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور اس کے برابری ہی زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اب بول۔" اس نے انگارہ سی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں' تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

"کیوں؟"

"میں نے اپنی بنائی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا' تمہارا دایاں رخسار اس تصویر سے کچھ مختلف ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں سامنے بٹھا کر اسے درست

کو لوں۔"

اس پر پھر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر ناچنے لگا۔

"کیا کہا دایاں رخسار۔ یہی تو وہ آئینہ ہے جس سے جمال حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ رفع حجابات کا ذریعہ یہی تو ہے۔ پوری کائنات' رخسار ہے حقیقت الٰہی کا۔ ارے جا تو کیا بنائے گا رخسار ----- ارے جا ----- ارے جا۔"

رقص کرتے کرتے اس نے تھیلا اٹھایا اور کل کی طرح پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں چپ چاپ اسے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کیا مصیبت ہے' کس پاگل سے ماتھا پھوڑ رہا ہوں۔ کل تصویر کے ذکر سے بدک گیا' آج رخسار کے نام پر بھاگ کھڑا ہوا۔ کل کسی اور لفظ پر بھڑک جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا اور واپس چلا آیا۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب اس کا تعاقب نہیں کروں گا۔ پاگل ہے اس کا کیا بھروسا' کس دن کیا کر بیٹھے۔ اسے گھر میں لانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔

اس کا خیال دل سے نکال کر میں اس کمرے میں چلا آیا جہاں میں تصویریں بناتا تھا۔ بوڑھے کی تصویر ایک گوشے میں رکھی ہوئی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ مجھے غصہ آ گیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اس تصویر کے پرزے کر ڈالے۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں ایک نئی تصویر پر کام کرنے لگا۔

"مجھ سے نہیں ملو گے۔" ایک گوشے سے آواز آئی۔ میں نے آواز کے تعاقب میں نظر اٹھائی۔ بوڑھے کی تصویر مجھے گھور رہی تھی۔ خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی' ایئر کنڈیشنر کی خنکی میں مجھے پسینے آ گئے۔ یہ تصویر تو میں پھاڑ چکا تھا۔ یہ پھر یہاں کیسے آ گئی؟ میں تو ہمات پر یقین نہیں رکھتا لیکن یہ تو حقیقت تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پھٹی ہوئی تصویر کے ٹکڑوں کو جمع کیا جو اب تک کمرے میں بکھرے ہوئے تھے تاکہ یہ دیکھ سکوں جو تصویر میں نے پھاڑی تھی وہ کس کی تھی۔ یہ میری پورٹریٹ کے پرزے تھے۔ گویا بوکھلاہٹ میں' میں نے بوڑھے کی تصویر کی بجائے اپنی تصویر کو چاک کر دیا۔ میرا سانس اپنی جگہ آ گیا لیکن ساتھ ہی اپنی حماقت پر شدید غصہ بھی آیا۔ میں

نے ان ٹکڑوں کو جمع کیااور کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ میں نے سوچا' بوڑھے کی تصویر کا بھی یہی حشر کروں لیکن شاید اب غصہ اتر چکا تھا۔ میرے ہاتھ رک گئے۔

دو دن تک میں نے گیلری کا رخ نہیں کیا لیکن اس بوڑھے کے خیال سے خود کو چھٹکارا نہ دلا سکا۔ وہ بری طرح میرے حواس پر چھا گیا تھا۔ مجھے اس نے جس طرح حقارت سے ٹھکرایا تھا اس سے میرے وقار کو صدمہ پہنچا تھا' میری شکست ہوئی تھی۔ میں اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا اور وہ ------ میں پھر کوشش کروں گا۔

میں نے پھر کوشش کی مگر اب وہ غائب تھا۔ پوا ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ مجھے نظر نہ آیا۔ یہ ایک ہفتہ مجھ پر قیامت بن کر گزرا۔ لوگ اپنے محبوب کا بھی اتنا انتظار نہیں کرتے ہوں گے جتنا انتظار مجھے اس کا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہے جسے میں لوٹنا چاہتا ہوں۔

خدا خدا کر کے وہ پھر نظر آیا۔ میں پھر اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

چند دن کی آنا کانی کے بعد وہ راہ راست پر آگیا۔ آہستہ آہستہ مجھ سے مانوس ہوتا چلا گیا اور ایک دن میں اسے اپنے فلیٹ پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب وہ مجھ سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ ہر قسم کی باتیں بے تکلف کرنے لگا تھا۔ اس میں دیوانگی کے آثار ضرور تھے لیکن وہ دیوانہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی لیکن وقت سے پہلے بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

ایک روز وہ آیا تو خلاف معمول بہت خاموش تھا۔ میں بھی اپنے کام میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ مجھ سے کچھ بے مروتی سرزد ہو رہی ہے۔ وہ بولتا رہتا تھا اور میں ہوں ہاں کرتا رہتا تھا مگر آج تو میں اس سے منہ موڑے بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا' آج اس سے اس کا دکھ اگلوالوں۔ اب وہ اتنا بے تکلف ہو گیا ہے کہ اس سے نجی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔

میں نے پوچھا "تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں" اس نے مختصر سا جواب دے کر گردن جھکا لی۔

"تمہارا کوئی اور رشتے دار ہے؟"

"سب ہیں مگر وہ غریب تھے اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی ۔ وہ خود کون سا دولت مند ہے کہ اسے غریب رشتے دار برداشت نہیں۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ محض غربت کی وجہ سے تم نے ان سے منہ پھیر لیا۔" میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اور کیا کرتا" غریبوں کو منہ کون لگاتا ہے جو میں انہیں گلے سے لگائے رہتا۔ ان کی وجہ سے میری بہت بے عزتی ہوئی تھی اگر وہ غریب نہ ہوتے تو آج میری زندگی کچھ اور ہوتی بس میں نے انہیں چھوڑ دیا۔"

بات ہرگز معقول نہیں تھی لیکن مجھے اس کا یہ مؤقف تسلیم کرنا پڑا۔ میں اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو تو وہ خوش رہتا ہے۔ میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

وہ مزید سنجیدہ ہو گیا "کرلوں گا۔"

"کیا کرو گے عمر تو نکلی جا رہی ہے۔"

"بس ذرا تصویر مکمل ہو جائے۔"

وہ کم بخت ایک نہ ایک بات ایسی ضرور کرتا تھا کہ انسان کا جذبہ تجسّس بیدار ہو جائے۔ تصویر مکمل ہونے سے شادی کا کیا تعلق۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لہٰذا میں نے پھر پوچھا۔

"یہ تصویر کا کیا قصہ ہے؟"

"میرے پاس ایک تصویر کے تین ٹکڑے ہیں' ایک ٹکڑا غائب ہے۔ دن بھر سڑکوں سے کاغذ کے ٹکڑے جمع کرتا رہتا ہوں۔ گھر جا کر ایک ایک کاغذ کا غور سے دیکھتا ہوں مگر وہ ملتا ہی نہیں۔ بس وہ ٹکڑا مل جائے پھر شادی ہی شادی۔" اس نے آخری جملہ اتنے چپکے سے ادا کیا جیسے اسے ڈر ہو' کوئی سن نہ لے۔

"کس کی تصویر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری محبوبہ کی۔"

"کون سا ٹکڑا کم ہے؟"

"دایاں رخسار جس پر بالوں کی ایک لٹ پڑی ہوئی تھی۔" اس نے میرے جذبِ تجسّس کو پھر متحرک کر دیا۔ اچھا تو حضرت کا کوئی محبوب بھی ہے۔

"وہ ٹکڑے مجھے دکھاؤ۔ میں مصور ہوں' تصویر مکمل کر دوں گا۔"

"شی!" اس نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا "ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ایسے چہرے صرف خدا بنا سکتا ہے اور تم خدا نہیں ہو۔ ایسے چہرے تو بس مل جاتے ہیں' مل جائے گا کسی دن۔"

"وہ تصویر تم نے پھاڑی کیوں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تھوڑی۔ وہ تو اس نے ------ خود اس نے ------" اس کی آواز بھرا گئی۔

مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ میں کوئی اور سوال کرتا۔ وہ بھی شاید اپنے آنسو پینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ آخرکار میں نے سکوت توڑا۔

"کیا تم اپنے دوست کو پوری بات بتاؤ گے۔ کون تھی وہ' تمہیں کیوں نہ مل سکی' تصویر کا کیا قصہ ہے؟"

"حور تھی وہ۔ غریب تھا میں اور کیا سناؤں۔"

"دوست یوں نہیں تفصیل سے سناؤ۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

"تمہارے پاس اتنا وقت کہاں کہ غریب کی بپتا سن سکو۔ امیروں کے پاس وقت نہیں پیسے ہوتے ہیں۔ وہ ان کو خوشی نہیں دے سکتے ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ تم بھی امیر آدمی ہو' پانچ دس روپے دے کر مجھے چلتا کرو گے۔ لوجی ہو گئی مدد۔" اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ اس کے دل کا زہر' زبان پر آ گیا تھا۔

میں دولت مند ضرور ہوں لیکن ایک فنکار بھی ہوں اس لیے میرے پاس کسی کا دکھ سننے کے لیے بہت وقت ہے۔"

وہ بڑی مشکل سے تیار ہوا اور میرے بے حد اصرار پر اس نے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔

"میں ایک غریب شاعر تھا۔ میرا نام صابر شکیب ہے۔ یہ نام تم نے ضرور سنا ہو

گا۔ اب سے چند سال پہلے میری بڑی شہرت تھی۔ لوگ مجھ سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ لڑکیاں میری قربت کے لیے تڑپتی تھیں۔ جس مشاعرے میں چلا جاتا تھا' آٹوگراف کے لیے کھنکتی چوڑیوں والے ہاتھ مجھے گھیر لیتے تھے۔ میں غریب تو تھا مگر عزت تھی۔ "اس" سے میری ملاقات ایک مشاعرے ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے کالج میں مشاعرہ تھا۔ نوجوان شعرا میں سب سے ممتاز میں ہی تھا۔ ہر آنکھ مجھے دیکھ رہی تھی مگر میری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ویسا چہرہ کوئی تھا بھی تو نہیں' میں کیسے دیکھتا۔ تصور میرا نہیں اس کا تھا۔ اس کی گہری سوچ میں ڈوبی آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور میں قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی' کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک مندر تھا جس میں ایک مورت تھی۔ میں کسی پجاری کی طرح اس کے سامنے ڈنڈوت کئے کھڑا تھا۔

مشاعرہ کے اختتام پر لڑکیوں کے ہجوم نے آٹوگراف دینے کے لیے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں الٹی سیدھی لکریں کھینچتا اور سوچتا رہا' وہ کب آئے گی اور وہ آ گئی۔

"پلیز آٹوگراف۔" اس نے کہا۔

"آپ کا نام؟"

اس نے شرماتے ہوئے اپنا نام بتایا اور میں نے یہ عجیب غریب جسارت کی کہ اس کے نام کے ساتھ اپنا نام شامل کر کے دیا۔

آٹوگراف بک واپس لیتے ہوئے اس نے چپکے سے ایک پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ اتنی دیر میں مشاعرے کے منتظمین مجھے کھانے کی ٹیبل کی طرف لے گئے ورنہ شاید میں اس کی طرف پڑا ہوتا۔

میں نے سب کی نظر بچا کر پرچے پر نظر ڈالی۔ پرچے میں اس کا پتا درج تھا۔ اشارہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے دن میں اس کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ بڑے تپاک سے ملی۔ اپنے ڈیڈی سے ملوایا۔ انہیں شاعری سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی مگر خوش ہوئے کہ اتنا بڑا شاعر ان کے گھر آیا ہے یا بیٹی کا دل رکھا ہو گا۔ بہرحال مجھے کوفت اٹھانی نہیں پڑی۔

ایک ملاقات نے ہزار ملاقاتوں کے دروازے کھول دیئے۔ وہ شاعر پرست ہی

نہیں، سخن فہم بھی تھی۔ ہم دونوں گھنٹوں ادا بحثیں کیا کرتے تھے۔ ایک ساتھ گھومنے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو قہقہوں کے تحفے نذر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ دوستی محبت بن گئی ہے۔ سب سے پہلے میری شاعری نے اس جذبے کو قبول کیا۔ میری شاعری کا رنگ ہی تبدیل ہو گیا میں شاعر رومان کہلانے لگا۔ رخساروں کی آنچ، آنکھوں کی اداسی پلکوں کی چھاؤں، آواز کی مٹھاس، لہجے کی نرمی، ہنسی کی کھنک جذبوں کی دھنک، چپکے چپکے میری نظموں کا حصہ بن گئے۔ ہر لڑکی انہیں اپنا قصیدہ سمجھتی تھی لیکن یہ تو اس کی قدموں سے اٹھنے والا رنگین غبار تھیں جو میرے دل سے ہو کر گزر رہی تھی۔

اسے بھی میری چاہت کا اندازہ تھا۔ پھر ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور فیصلہ کر لیا کہ ہم شادی کر لیں گے۔

ہم اسے بہت آسان سمجھ رہے تھے لیکن ایسا تھا نہیں۔ اس کے ڈیڈی نے اس خیال کو اپنی توہین سمجھا۔ ان کی بند تجوریوں کی طرح ان کے دل پر بھی سفاکی کا تالا پڑا ہوا تھا۔ انہیں کسی بڑے گھر کے داماد کی ضرورت تھی، میں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔

"سنو برخوردار، تم بے شک اچھے شاعر ہو گے لیکن شہرت سے تم میری بیٹی کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی دولت مند اپنی دولت سے اس کا پیٹ بھر سکے لیکن خوشی نہ دے سکے۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عیش و آرام ہی کا نام خوشی ہے جو دولت کے بغیر نہیں مل سکتی۔"

"معاف کیجئے گا، خوشی تو دل کے کسی خفیہ تہ خانہ میں بند ہوتی ہے جس کی چابی صرف محبت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

"کیا دولت مند محبت نہیں کر سکتے؟ کیا ان کے پاس یہ چابی نہیں ہو سکتی؟"

"ہو سکتی ہے مگر آپ کی بیٹی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس نے یہ چابی میرے حوالے کی ہے۔ اگر وہ کسی اور کے گھر چلی گئی تو زندگی بھر اس کے دل پر تالا پڑا رہے

گا۔ سیٹھ صاحب مجھ پر نہیں تو اپنی بیٹی پر رحم کھائیے۔ وہ کہیں خوش نہیں رہ سکے گی' مرجائے گی وہ۔"

"بدتمیز بددعائیں دیتا ہے میری بیٹی کو۔ تجھے اس کی دولت چاہیے نا۔ بلیک میل کرنے آیا ہے مجھے مانگ کتنی دولت مانگتا ہے۔ میں اس کا صدقہ سمجھ کر دے دوں گا۔ اپنی جیب بھر اور چلتا بن یہاں سے۔"

"سیٹھ صاحب آپ مجھے گالی دے رہے ہیں۔ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میری محبت بے لوث ہے۔ میں نے پیسے کے لیے محبت نہیں کی ہے۔ آپ اپنے کاغذ کے پرزوں کو سنبھال کر رکھئے اور بیچ ڈالیے اپنی بیٹی کو کسی اسمگلر' کسی چور کے ہاتھوں۔"

"دو کوڑی کے شاعر تیری یہ ہمت کہ میری بیٹی کو بیچنے کی باتیں کرے۔ میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھے ذلیل کرے۔" انہوں نے ایک زور دار طمانچہ مجھے تحفے میں دیا اور نوکروں کو مجھے گھر سے نکال دینے کی ہدایات جاری کر کے کمرے سے نکل گئے۔

اس دن میں نے زندگی کی پہلی چوری کی۔ میری محبت کی تصویر اس کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں نوکر آتے وہ تصویر میں نے اٹھائی اور کمرے سے نکل آیا۔

مجھ پر جو کچھ گزری ہو گی' آپ فنکار ہیں' سمجھ سکتے ہیں' مجھے نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ چند ہی دن میں مہینوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ دل تو نہیں مانتا تھا لیکن اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ اس دروازے پر جانے کو جی نہیں شاہتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اس نے بھی میری خیریت پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ تو آ سکتی تھی۔ اس پر تو اس گھر کے دروازے بند نہیں تھے۔ اس کی تو یہاں کسی نے بے عزتی نہیں کی تھی مگر وہ نہیں آئی۔ فقط اس کی تصویر تھی جو میرے ساتھ آ گئی اور ابھی تک میرے کمرے میں تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ میں بیمار رہنے لگا۔ کبھی کبھی کسی مشاعرے میں جانکلتا۔ وہ بھی اس امید پر کہ شاید وہ وہاں ہو لیکن وہ تو میرے دل کے سکون کی طرح مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ پھر ایک روز وہ آ گئی۔ میرے بے ترتیب کمرے کو دیکھا' بکھری ہوئی

کتابوں کو دیکھا اور خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم تھا یہی ہو گا۔ میں جانتی تھی' تم شاعر ہو یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکو گے۔ تمہاری جو حالت ہے اس کا اندازہ مجھے تھا۔" اس کی اداس آنکھوں سے وہ آنسو ڈھلک کر نیچے آ گئے۔

"پھر بھی ملنے میں اتنی دیر لگا دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی راہ دیکھتا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"میں مجبور تھی شکیب' بہت مجبور۔"

"ایسی کیا مجبوری تھی۔"

"وہی جو تمہاری مجبوری ہے۔"

"کیا ہے میری مجبوری۔"

"شرافت۔ تم اگر چاہتے تو میری تصویر کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آتے۔ میری مجبوری بھی یہی تھی' میں اپنے باپ سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔"

"پھر آج ------"

"آخری خواہش کے طور پر آئی ہوں۔ مرنے والے کی آخری خواہش تو سبھی پوری کر دیتے ہیں۔ آج ڈیڈی نے بھی اجازت دے دی۔ میں نے ڈیڈی سے بھی کہا ہے' تم سے بھی وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد کوئی خواہش نہیں کروں گی۔"

"میں سمجھا نہیں مجھ پر تو جو بیتی سو بیتی۔ تم تو جینے کی باتیں کرو۔"

"ہاں' اب تو صرف جینے کی باتیں کی جا سکتی ہیں' زندگی تو ختم۔ میری شادی ہو رہی ہے۔"

"کیا!" میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں بھی وہ میری کب تھی لیکن اس کی شادی کا سن کر ایسا لگا جیسے آج ہی اس سے جدا ہوا ہوں۔

"تم انکار کر دو۔ میں تمہیں کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مت کرو یہ شادی خدا کے لیے مت کرو۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی ہوتی تو انکار کر دیتی۔ موت سے انکار کون کر سکتا ہے۔"

"پھر بھی انکار کر دو۔"

"نہیں' میں ایسا نہیں کر سکتی۔ موت کا جو ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہے' میرا انکار اسے ڈیڈی کی موت بنا دے گا۔ وہ خودکشی کر لیں گے۔"

"یہی دھمکی میں بھی دے سکتا ہوں۔"

"نہیں' تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ کیا تم سمجھتی ہو یہ زندگی مجھے عزیز ہے؟"

"تم اس لیے ایسا نہیں کر سکتے کہ میری شادی تم سے ہو چکی ہے۔ شادی تو روحوں کے ملاپ کا نام ہے۔ میری روح نے تمہیں قبول کر لیا ہے' میں تمہاری بیوی ہوں۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ میرا سہاگ مجھ سے چھین لو' مجھے بیوگی کی چادر اوڑھا دو۔ نہیں تم ایسا کبھی نہیں چاہو گے۔" اس نے اپنی بانہوں کا ہار میری گردن میں ڈال دیا "وعدہ کرو شکیب' میری بربادی کے آخری موڑ تک تم زندہ رہو گے۔ دنیا کو یہ باور کرانے کے لیے کہ محبت کبھی نہیں مرتی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں مگر تم خود کہہ چکی ہو کہ موت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ میں زندہ رہ نہیں سکوں گا۔"

زہر دے اس پر یہ تاکید کہ پینا ہو گا۔ وہ مجھ سے دور بھی جا رہی تھی اور مجھے زندہ رہنے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔

اس نے کمرے کی حالت کو درست کیا۔ کتابوں کو سلیقے سے جمایا' چائے بنائی' اپنے لیے بھی میرے لیے بھی۔ چائے پینے کے دوران وہ بار بار اپنی تصویر کو دیکھ رہی تھی جو میرے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے اس کی محویت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوچ رہی ہوں اسے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

"ایک ہی تو سہارا ہے میرے پاس۔"

"نہیں اسے یہاں سے ہٹا لو۔ میں دو گھروں میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"یہ تو تمہاری پرچھائیں ہے۔ اسے بھی چھین لینا چاہتی ہو۔"

"اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھی، تصویر کو فریم سے نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چار ٹکڑے کر دیئے میں روکتا ہی رہ گیا اور اس نے ان ٹکڑوں کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ وہ لڑکی مر گئی جس سے تم محبت کرتے تھے۔ اب میں کسی کی بیوی ہوں۔ میرے تعاقب میں آنے کی کوشش مت کرنا۔ ہاں تصویر کو جوڑ کر ایک کر سکو تو کر لینا۔"

غالباً" وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ تصویروں میں جان نہیں پڑ سکتی اس لیے میں اس کا تعاقب چھوڑ دوں۔ اسے بھول جاؤں کہ اب وہ ایک بے جان تصویر ہی تو ہے۔

اس کے بعد وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھی۔ میری صحت کی طرف سے فکر مند تھی اس لیے کئی لمبی چوڑی نصیحتیں کر کے وہ اس طرح رخصت ہو گئی جیسے بیویاں میکے جاتی ہیں۔

اس کے جانے کے بہت دیر بعد حواس بحال ہوئے تو مجھے اس کی تصویر یاد آئی۔ ایک وہی تو نشانی تھی۔ وہ بھی چھن گئی، میں باہر کی طرف بھاگا۔ بہت تلاش کے بعد مجھے اس تصویر کے تین ٹکڑے مل گئے۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے کو تلاش کر رہا ہوں۔"

غالباً" اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس کی کہانی شاید ابھی باقی تھی مگر وہ چپ تھا۔

"تم نے اس لڑکی کو نہیں ڈھونڈا؟ کس حال میں ہے کہاں ہے۔"

"وہ تو پرچھائیں ہے اس کی تلاش سے کیا فائدہ۔ حقیقت تو وہ تصویر تھی اور پھر اس نے کہا تھا، وہ دو گھروں میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی۔ تصویر مکمل ہو جائے تو شاید وہ میرے گھر چلی آئے۔"

"تم مجھے وہ تین ٹکڑے دکھاؤ تو شاید میں تصویر مکمل کر دوں۔"

"یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم تصویریں بناؤ، وہ میری زندگی تھی، زندگی بنا سکتے ہو؟"

ظاہر ہے اس دیوانگی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اس نے تھیلے کو کندھے پہ رکھا اور باہر نکل گیا۔

اس کی کہانی اتنی پر اثر تھی اور ایسے دلچسپ پیرائے میں سنائی گئی تھی کہ بہت دیر تک میں اس کے اثر میں گم رہا۔

ماہ رخ اور میں جب شام کی چائے پر جمع ہوئے تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں بوڑھے کی کہانی اسے بھی سنا دی۔ عورتیں یوں بھی زود حس ہوتی ہیں۔ ماہ رخ کچھ زیادہ ہی حساس تھی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے کتنا دکھ پہنچا ہے اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"یہ کہانی واقعی دردناک ہے مگر تم اتنا اثر کیوں لے رہی ہو' ہر دل میں ایک درد چھپا ہوا ہے ہم کس کس پر آنسو بہائیں گے۔" میں اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"میں بوڑھے پر نہیں اس لڑکی پر آنسو بہا رہی ہوں' مجھے تو اس کا دکھ ہے۔ وہ کتنی مجبور ہو گی جس نے ماں باپ کی عزت کے لیے ایسے عظیم محبت کرنے والے کو ٹھکرا دیا۔ بے چاری بد قسمت نہ جانے اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔"

"کم آن ماہ رخ' چھوڑو بھی اس قصے کو ہمیں کیا۔ آؤ چلیں کہیں باہر گھوم کر آتے ہیں کچھ فریش ہو جاؤ گی۔"

اس نے انکار کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا' فوراً" تیار ہو گئی۔ اس شام ہم نے جی بھر کے سیر کی۔ رات کا کھانا بھی باہر ہی کھایا۔ رات گئے بہت دیر سے گھر واپس آئے۔

راستے میں اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ "اس بوڑھے کو آئندہ گھر میں نہ آنے دینا۔"

وہ ابھی تک اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شاید بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔

"کیا کرے گا وہ۔ بے چارہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ تمہیں معلوم ہے' میں زیادہ ملنے جلنے کا قائل نہیں مگر اس کی باتوں میں صداقت ہے۔ آتا ہے' چند گھڑی بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ مجھے ڈسٹرب بھی نہیں کرتا۔ میں اگر کام کر رہا ہوتا ہوں تو چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ بے ضرر سا آدمی ہے تم اس کی فکر چھوڑو۔"

"نہیں میں ان لوگوں کو جانتی ہوں۔ پہلے جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر دلوں میں اور گھروں میں جگہ بناتے ہیں پھر قیمتی سے قیمتی چیز اڑا لے جاتے ہیں۔ چور ہوتے ہیں یہ

لوگ۔"

"ارے نہیں وہ ایسا نہیں" میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

"جب کچھ چرا کر لے جائے گا تب ہوش آئے گا تمہیں۔ میری نصیحت مان لو' اسے اب بھی روک دو ورنہ بہت بڑی چوری ہو جائے گی تمہارے گھر میں۔"

"کوئی نہیں ہوتی چوری ووری۔" میں نے گاڑی پارک کی' اس کے لیے دروازہ کھولا اور ہم دونوں فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

کئی دن گزر گئے وہ نہیں آیا۔ اب مجھے اس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں یکسو ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ زندگی پہلے کی طرح بے رنگ اور یکساں ہو گئی۔

ایک دن ماہ رخ نے اپنی ایک پرانی تصویر نکال کر دی۔ یہ تصویر اس کے کالج کے زمانے کی تھی کہ میں اس کا پنسل اسکیچ بنا دوں۔ یہ پہلی فرمائش تھی جو اس نے مجھ سے کی تھی۔ لہٰذا میں بسرو چشم اس کام میں لگ گیا۔

ایک روز دروازے پر بیل ہوئی اور وہ اندر آ گیا۔ اس کی حالت اب پہلے سے بھی بدتر تھی۔ آتے ہی اس نے یہ شعر پڑھا۔

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

"خیریت ہے' آج بڑے شاعرانہ موڈ میں ہو۔"

ساجد صاحب' تصویر اب بھی نامکمل ہے۔"

مجھے اب اس تصویر سے چڑ ہو گئی تھی۔ ہر وقت ایک ہی ذکر۔ دنیا میں اور بہت کچھ ہے کرنے کے لیے۔ یہ کیا کہ آدمی ایک ہی چیز کے پیچھے پڑ جائے۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے بھی کوئی بات نہیں کی خاموشی سے مجھے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"اپنی بیوی کی تصویر بنا رہا ہوں۔"

"بیوی کی تصویر! وہ تو ہے آپ کے پاس۔ تصویر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگا۔ اگر اسے کھانسی نہ آ جاتی تو شاید ہنستا ہی رہتا۔

"انسان کا کیا بھروسا۔ کیا خبر کب وہ میرے پاس نہ رہے۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"تصویر مکمل کر لینا۔ ادھوری تصویریں بڑی تکلیف پہنچاتی ہیں۔"

"بس تین چوتھائی تو مکمل ہو ہی گئی ہے۔ باقی بھی ہو جائے گی۔" اس نے دور بیٹھے بیٹھے تصویر پر ناقدانہ نظر ڈالی اور گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔ وہ جب اس عالم میں بیٹھ جاتا تھا تو جب تک اسے بولنے پر مجبور نہیں کیا جاتا بولتا نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں پہنچ جاتا تھا۔

میں نے اس کا یہ عالم دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن اب میری توجہ تقسیم ہو گئی تھی۔ کام میں میرا جی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا ایک کپ چائے پی لی جائے۔ اس کے بعد اس سے معذرت کر لوں گا اور اطمینان سے کام کروں گا۔

"میں تمہارے لئے چائے بنواتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا اور ماہ رخ سے چائے کا کہنے کے لیے چلا گیا وہ اسی طرح گردن جھکائے، چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"جلدی سے دو چائے بنا دو۔" میں نے ماہ رخ سے کہا۔

"کون آ گیا۔"

"وہی صابر شکیب۔"

"تم نے اسے پھر بلا لیا۔"

"میں نے کہاں بلا لیا۔ وہ تو خود ہی آن دھمکا۔"

"کیوں آ جاتا ہے روز روز۔"

"میں نے کہاں۔ اس مرتبہ تو تقریباً" ایک مہینے بعد آیا ہے۔ ویسے بے چارے کی حالت بہت خراب ہے۔"

"تم اسے نکال کیوں نہیں دیتے۔"

"کمال کرتی ہو' کیسے نکال دوں گھر آئے ہوئے آدمی کو۔"

"معذرت تو کر سکتے ہو' مصروفیت کا بہانہ تو کر سکتے ہو۔"

"اچھا بابا کردوں گا کوئی بہانہ۔ ابھی تو بنا دو چائے۔"

"آج تو بنائے دیتی ہوں مگر آئندہ نہیں اور کچھ بسکٹ بھی لے آؤں۔ کیا خبر بھوکا ہو۔"

"ہاں لیتی آنا۔"

عجیب عورت ہے۔ یا تو اتنی نفرت کہ چائے تک بنانے پر تیار نہیں یا اتنا خیال کہ بسکٹ تک آنے لگے۔ میں نے دل میں سوچا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

یہ کیا! نہ وہ خود تھا نہ اس کا تھیلا۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہو گئی اور وہ بور ہو کر چلا گیا۔ بالکونی سے نیچے جھانکا' دور تک نگاہ دوڑائی۔ اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ کہیں اس نے ہماری باتیں تو نہیں سن لیں' میں نے سوچا مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم تو بہت آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ خیر' میں معذرت سے بچ گیا' وہ خود ہی چلا گیا۔ اب میں اطمینان سے کام کر سکوں گا۔ میں بالکونی سے پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔

عجیب سی شرمندگی ہو رہی تھی۔ جانے کیوں چلا گیا۔ میں بے چینی کے عالم میں کچن میں چلا گیا۔

"بس چائے تیار ہے' لے جائیے۔" ماہ رخ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"رہنے دو' وہ چلا گیا۔"

"چلا گیا' مگر کیوں؟"

"پاگل کا کیا بھروسا' کیا اعتبار کوئی اور دھن سوار ہو گئی ہو گی۔"

"ہاں' پاگل کا کیا بھروسا۔" ماہ رخ نے ٹھنڈی سانس بھری اور ٹرے کو واپس اپنی جگہ رکھ دیا۔ میری چائے تو مجھے دے دو۔ آپ بیٹھیں میں لاتی ہوں۔ ماہ رخ نے کہا اور میں اس کے کمرے میں آ گیا۔ وہ چائے لے کر آ گئی۔ ہم دونوں چائے پیتے رہے اور اس کی باتیں کرتے رہے۔

"اچھا اب میں تمہاری تصویر پر کام شروع کر رہا ہوں' مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" میں نے اس سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پنسل ہاتھ میں لی اور اس پرانی تصویر کو دیکھنے لگا' جسے دیکھ کر میں یہ پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی پنسل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ کسی نے اس کے دائیں رخسار کی طرف کا حصہ کاٹ لیا تھا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ صابر شکیب! میرے اندر سے آواز آئی۔ یہ حرکت اسی پاگل کی ہو سکتی ہے۔ مگر اس نے ایسا کیوں کیا پاگل ہے پاگل کا کیا بھروسا۔ میں بہت دیر تک اس حصے کے تلاش کرتا رہا۔ شاید اس نے پاگل پن میں اسے تراش لیا ہو اور ٹکڑا یہیں پھینک گیا ہو۔ ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دیکھ لی۔ کچھ ہوتا تو ملتا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اچانک ہی ایک خیال تیزی سے میرے دل میں آیا۔ کہیں ماہ رخ تو وہ لڑکی نہیں جس کا قصہ اس نے مجھے سنایا تھا۔ کہیں اسے اسی رخسار کی تو تلاش نہیں تھی۔ میں شام تک واقعات کی کڑیوں کو ملاتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ماہ رخ ہی وہ لڑکی ہے جس کی کہانی اس نے نادانستگی میں مجھے سنائی تھی۔ تقدیر اسے یہاں لے آئی۔ جو تصویر پھاڑی گئی تھی اسی کی دوسری کاپی ماہ رخ کے پاس تھی جو اس نے مجھے دی۔ صابر کی اس پر نظر پڑ گئی اور وہ حصہ اس نے کاٹ لیا جو اس کے پاس کم تھا۔ آخر کار اس نے وہ حصہ تلاش کر ہی لیا۔ چلو اس کی محنت وصول ہوئی۔

یہ میرا قیاس تھا ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ یقین تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب ماہ رخ سے بات کی جاتی۔ میں نے سوچا' اپنے جذبات پر قابو پا لوں' پھر بات کروں گا۔ میں نے دوسرے دن بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کے کھانے پر میں نے ماہ رخ کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا' سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا اور کھانا کھاتا رہا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو گھر میں معمول سے زیادہ سناٹا تھا۔ ماہ رخ ابھی تک سو کر نہیں اٹھی تھی۔ میں نے اسے آوازیں دیں مگر وہ بے خبر تھی۔ اسے ہاتھ لگایا تو ہاتھ جل گیا۔ اسے تیز بخار تھا۔ پھر اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ اس کے دائیں رخسار پر لمبی لکیر سی کھنچ گئی تھی جو ظاہر ہے پہلے نہیں تھی۔ کس چیز کا نشان ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اسے جھنجوڑا۔ اس نے غنودگی کے عالم میں آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا۔ ڈاکٹر فوراً آ گیا۔ بخار کی شدت تو سمجھ میں آتی تھی لیکن سرخ لکیر کا معماوہ بھی حل نہ کر سکا۔ بہرحال دوائیں تجویز کر کے چلا گیا۔

وہ لکیر' دوسرے دن زخم کی شکل اختیار کر گئی۔ جیسے کسی نے اس کی تصویر کی طرح اس کا رخسار کاٹنے کی کوشش بھی کی ہو۔ بخار کبھی کم ہو جاتا کبھی بڑھ جاتا۔

شہر کا ہر ڈاکٹر ہر ہسپتال آزما کر دیکھ لیا لیکن اس کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔

صرف ایک مہینے کے بعد' مجھ سے کوئی بات کیے بغیر وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

وہ پاگل ٹھیک ہی کہتا تھا' وہ دو گھروں میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی۔ تصویر مکمل ہونے دو' وہ میرے پاس چلی آئے گی۔ اس کی تصویر مکمل ہو گئی اور ماہ رخ نے دو گھروں میں سے ایک گھر کا انتخاب کر لیا۔

اب تصویر کے تین حصے میرے پاس ہیں' دایاں رخسار کہاں سے لاؤں کہ تصویر مکمل ہو۔

میں مصور ہوں' تصویر بنا بھی لوں مگر وہ تو میری زندگی تھی' زندگی کیسے بنا سکتا ہوں۔

